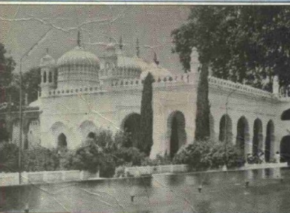
شاہانِ بے تاج

وحیدہ نسیم



مکتبہ آصفیہ
ای ۱/ جہانگیر روڈ ویسٹ کراچی

انتساب

اورنگ آباد کے نام

ذرے الماس کے تیرے خس و خاشاک میں ہیں
ہڈیاں اپنے بزرگوں کی تری خاک میں ہیں

وحیدہ نسیم، پروفیسر

ممتاز اردو شاعرہ و ادیبہ، ناول و افسانہ نگار، ماہر تعلیم۔
پروفیسر ریاضی و پرنسپل کالج برائے خواتین ناظم آباد کراچی
شعری کتب موجِ نسیم (۱۹۷۳ء) نعتِ رسولؐ
افسانوی کتب: ناگ منی۔ راج محل۔ رنگ محل۔ دیپک محل
ناول غم دل کہاں نہ جائے۔ بیلے کی کلیاں۔
زخمِ حیات۔ ساحل کی تمنا۔ لال باغ۔
دردِ دنیا من تو ہے۔

دیگر کتب	مدینۂ دل (سفرنامۂ حج)۔ نعت و سلام اورنگ آباد: ملک عنبر سے عالمگیر تک۔ عورت اور اردو زبان۔ شاہان بے تاج۔
دختر	فصیح الدین
ولادت	۹ ستمبر ۱۹۲۷ء اورنگ آباد حیدرآباد دکن
وفات	۲۷ اکتوبر ۱۹۹۶ء کراچی
تدفین	کراچی
ماخذ	پاکستانیکا۔ دبستانوں کا دبستان کراچی

اشاعت اول ——— ۱۹۸۸ء

طابع ——— آر۔ آئی پرنٹرز کراچی

قیمت ——— -/[redacted] روپے

ملنے کا پتہ

غضنفر اکیڈمی پاکستان

۳۰، اردو بازار کراچی



اورنگ آباد کے نام

ذرّے الماس کے تیرے خس و خاشاک میں ہیں
ہڈیاں اپنے بزرگوں کی تری خاک میں ہیں

○


فہرست

○

وحیدہ نسیم
(پاکستان)

خلد آباد شریف

پہاڑوں کی حسین آغوش میں یہ نُور کی دنیا
بسائی ایک مومن[1] نے یہاں عرفان کی دنیا
چراغ چشتیاں زد میں ہواؤں کی جلایا ہے
یہاں آتے رہیں گے حشر تک عرفان کے جویا
سجایا اس میں زین الدین[5] نے دربار خواجہ کا
اُدائے سرفرازی دی ہے اس کو خاکسار[6] دل نے
جلال وجذب لے کر والدِ گیسو دراز[7] آئے
ہمیشہ رشک سے دیکھا ہے جس کو بادشاہی نے
چمکتا ہے یہ خطّہ خواجگانِ چشت[8] کی ضو سے
یہاں جھونکے ہوا کے باادب ہو کر گزرتے ہیں
حسن علائے سنجر[10] نے یہاں آرام فرمایا
اسی خاموش بستی میں تصوف کا ہے میخانہ
یہ وادی ہے امانت دار تغلق[12] کے خزانوں کی
طبیعت جب نہ نہر عنبریں سے سیر ہو پائی
اسی گلشن میں راحت آ کے عالمگیر[15] نے پائی
جمال سادگی بخشا جلال کج کلاہی کو

یہی اہل بصیرت کے لیے ہے طُور کی دنیا
یہاں گنج رواں[2] نے بخش دی فیضان کی دنیا
یہاں پر زرزری زربخش[3] نے سونا لٹایا ہے
تصوف کے لیے یہ اولیاء برہان[4] ہیں گویا
مہکتا ہے انھیں کی ذات سے گلزار خواجہ کا
یہاں سجدہ کیا ہے آ کے کتنے تاجداروں نے
بہاء الدین[ ] دُرِّ بے بہا اپنے الگ لائے
نگینے جڑ دیے وہ اس میں محبوب الٰہی[9] نے
دمکتا ہے یہ سبزہ گنبد خضرا کے پرتو سے
وضو کرتے ہوئے کوہسار سے بادل اترتے ہیں
وطن کو چھوڑ کر آزاد[11] کو یہ گلستاں بھایا
یہ گنبد آج بھی ہیں گردش دوراں سے بیگانہ
صدائیں گونجتی ہیں اس میں خلجی[13] کاروانوں کی
ملک عنبر[14] کو تیری پیاس ان جھرنوں میں لے آئی
یہ گہوارہ ہے جس میں نیند آصف جاہ[16] کو آئی
ملا تسکین کا ساماں مزاج تانا شاہی[17] کو

نسیمؔ بے نوا اشکوں کا آئی لے کے نذرانہ
نگاہِ لطف سے بھر دیجیے اس کا بھی پیمانہ

تشریحات

۱۔ حضرت مومن عارف سلسلہ قادریہ سہروردیہ کے بہت بڑے صوفی ہیں جو سب سے پہلے خلد آباد تشریف لائے۔

۲۔ گنج رواں لقب ہے جلال الدین صاحب کا جو قادریہ سلسلے کے بزرگ اور مومن عارف صاحب کے ہم عصر خیال کیے جاتے ہیں ان کا سن وفات سنہ ۶۴۴ھ اور مزار خلد آباد میں ہے۔

۳۔ زرزری زربخش لقب ہے حضرت خواجہ منتخب الدین کا جن کو حضرت نظام الدین محبوب الٰہی نے سنہ ۶۹۳ھ میں چودہ سو ولیوں کا رہبر بنا کر دکن بھیجا تھا۔ یہ بزرگ سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے دکن کی سرزمین پر قدم رکھا ان کا مزار خلد آباد میں سب سے بلند پہاڑی پر ہے تاریخ وفات سنہ ۷۲۶ھ ہے۔

۴۔ حضرت برہان الدین اولیا خواجہ منتخب الدین کے بڑے بھائی ہیں۔ تصوف میں ان کے ملفوظات حرف آخر ہیں سنہ ۷۴۱ھ میں وفات پائی اور خلد آباد میں دفن ہیں اور انہیں کے قدموں میں نظام الملک آصف جاہ اول کا مزار ہے۔

۵۔ حضرت زین الدین داؤد شیرازی حضرت برہان الدین کے خلیفہ ہیں ان کی وفات سنہ ۷۷۱ھ میں ہوئی اور اورنگ زیب عالمگیر انہیں کے قدموں میں آسودہ خواب ہے۔

۶۔ حضرت خاکسار صاحب اپنے وقت کے مجذوب تھے اور عالمگیر کے عہد میں خلد آباد آئے وہیں دفن ہیں۔

۷۔ والد گیسو دراز حضرت راجو القتال حسینی ہیں جن کا جذب وجلال آج تک مشہور ہے ان کے پاس ابوالحسن آخری تاجدار گولکنڈہ کا مزار ہے۔ ان کی تاریخ وفات سنہ ۱۷۰۳ھ ہے۔

۸۔ حضرت بہاؤ الدین انصاری نقشبندیہ سلسلہ کے پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے اورنگ آباد کی زمین پر قدم رکھا اور سنہ ۹۲۱ھ میں وفات پائی۔

۹۔ حضرت محبوب الٰہی جن کا مزار دہلی میں ہے اور انہیں نے اپنے مندرجہ بالا مریدوں سے خلدآباد کو زینت بخشی۔

۱۰۔ حسن علاء سنجر جو حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کے خاص مریدوں میں تھے بہت بڑے ادیب اور شاعر تھے ان کی کتاب فوائد الفواد ہے ان کا مزار بھی خلدآباد میں ہے

۱۱۔ آزاد بلگرامی جو ہندوستان کے مشہور مورخ ہیں حسن علاء سنجر کے مزار کے سامنے آسودہ خواب ہیں۔

۱۲۔ تغلق۔ سلطان محمد تغلق جو اپنا دارالخلافہ دہلی سے دولت آباد (خلدآباد کے پاس) لایا تھا۔

۱۳۔ خلجی۔ علاالدین خلجی جس نے سب سے پہلے دولت آباد یعنی دیوگری کا قلعہ سر کیا۔

۱۴۔ ملک عنبر حبشی۔ جس کی نہر عنبرین سے اورنگ آباد سیراب ہوتا تھا وہ خود راجو القتال حسینی کے مزار کے پاس ایک جھرنے کے قریب ابدی نیند سو رہا ہے۔

۱۵۔ اورنگ زیب عالمگیر جس کا مزار خلدآباد میں حضرت زین الدین شیرازی کے احاطے میں ہے۔

۱۶۔ نظام الملک آصف جاہ اول جن کا مزار حضرت برہان الدین غریب کے احاطے میں ہے۔

۱۷۔ ابوالحسن تانا شاہ آخری تاجدار گولکنڈہ جو اپنی کج کلاہی اور نازک دماغی میں مشہور تھا۔ خلدآباد میں دفن ہے۔

شاہان بے تاج

پیش لفظ

(وحیدہ نسیم)

تمہید: سنہ ۸۲ء میں ایک طویل عرصے یعنی ۲۳ برس بعد اورنگ آباد (مہاراشٹر) گئی تو مجھے ایسا لگا جیسے کوئی کھوئی ہوئی دنیا مل گئی ہو۔ اس کے بعد اس قدر جلد دوبارا جانے کا بظاہر کوئی جواز نہ تھا لیکن میں سنہ ۸۳ء میں دوبارا اور سنہ ۸۵ء میں سہ بارا گئی اور اب یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ صرف خلدآباد کی سرزمین اور وہاں کے بزرگوں کی کشش اور توجہ تھی جس نے مجھ تنہا خاتون کے لیے ہر منزل پر سفر کی مشکلات کو آسان بنایا اور میں ہر بار واپسی میں دہلی گئی۔ اور حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کے یہاں بصد عقیدت حاضری دی اورنگ آباد اور خلدآباد کے چاند تاروں کو منور کرنے والے آفتاب کامل آپ ہی کی ذات بابرکات ہے۔

سنہ ۸۵ء میں میرا قیام ذرا طویل رہا اور میں ہر جمعہ کے روز خلدآباد جایا کرتی وہاں کے پرکیف مناظر برسات کی فضا مہکتے ہوئے سبزہ زار میرے شاعرانہ مزاج کو جلا دیتے رہے اور پہاڑی کی خوشگوار آب و ہوا میری صحت پر اثر انداز ہوتی رہی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ وہاں کے مزارات اور درگاہیں میری روح کے لیے وجدان کا سامان بنتی رہیں۔ میں اکثر و بیشتر حضرت برہان الدین غریب کے مزار مبارک کے سامنے سر تسلیم خم کیے بیٹھی رہتی اسی دوران میں وہاں پر جشن آزادی کے سلسلے میں ہونے والے کئی مشاعروں میں بھی شریک ہو چکی تھی۔

ایک دن جمعہ کو جب میں وہاں گئی تو وہاں کے سجادگان اور محترم فرید الدین سلیم صاحب مہتمم اوقاف نے میرا بڑا پرتپاک استقبال کیا اور میری عقیدت کو دیکھتے ہوئے مجھے حضرت برہان الدین غریب کے مزار کے سامنے بٹھا کر میری دستار بندی کر دی دعائیں دیں اور وہاں کے خاص تبرکات عنایت کیئے۔ میرے لیے یہ بہت بڑی عزت افزائی تھی۔ یہی نہیں بلکہ ان کرم فرماؤں نے میرے اعزاز میں حضرت برہان الدین غریب کی خانقاہ میں ایک بڑے مشاعرے کا اہتمام بھی کیا۔ میں نے پاکستان میں بیسیوں مشاعروں میں شرکت کی ہے لیکن یہ مشاعرہ اپنے وجدان عرفان اور نوعیت کے لحاظ سے بالکل انوکھا تھا۔ اسی لیے میں نے اس

مشاعرے کے لیے خُلد آباد کے عنوان سے ایک نظم بطور خاص کہی جس میں وہاں کے مناظر تاریخ اور صوفیائے کرام کی حیات طیبہ پر بھی اشارتاً روشنی ڈالی تھی۔ اس نظم نے بزرگان دین کے عقیدت مندوں اور اہلِ ذوق کے دلوں میں نئی روح پھونک دی۔ خواجگان چشت کے ارادت مندوں نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور جناب فرید سلیم صاحب نے بطور خاص اس کو اورنگ آباد ٹائمز میں اس طرح چھپوایا کہ لوگ اس کو آسانی سے کاٹ کر فریم کر سکیں۔ قند مکرر کے طور پر اس نظم کو دوبارہ اس کتاب میں شامل کر رہی ہوں ویسے کراچی میں سب سے پہلے اس کو شاداب ڈائجسٹ نے اور پھر دہلی میں ھما کے ادارے نے شائع کیا ہے۔ اس میں جن جن بزرگوں کے نام آتے ہیں میرا یہ طویل مضمون شاہان بے تاج انہیں کے ذکر سے مزین ہے۔

نظم کے بعد اس قدر عرق ریزی اور محنت کر کے یہ طویل مضمون میں نے کیوں لکھا اس کی وجہ اگر میں نہ لکھوں تو جناب کارل ۔ ڈبلیوں ارنسٹ ۔ پی ایچ ڈی ہارورڈ پومونا کالج کیلیفورنیا کے ساتھ ناانصافی ہوگی جو وہاں پر مسلم تہذیب اور ثقافت پر تحقیقات کر رہے ہیں۔ پاکستان میں ان کا پتہ فاطمہ جناح روڈ لاہور پر امریکن سنٹر تھا۔

تصوف کی ابتداء عرفان کی تلاش اور حقیقت کی جستجو میں جب وہ اورنگ آباد سے خلد آباد کی پہاڑیوں میں پہنچے تو بقول خود ان کے انہوں نے وہاں اس نظم کو بڑی خوش الحانی اور عقیدت مندی سے لوگوں کو پڑھتے بلکہ گاتے سنا۔ ان کو زیادہ اردو نہیں آتی تھی لیکن دل سے نکلی ہوئی بات دل پہ اثر کر کے رہی کچھ لوگوں نے موصوف کو ان کی زبان میں بتایا کچھ ان کو ان کے عرفان اور وجدان نے سمجھایا۔ غرض کہ انہوں نے پہلی فرصت میں میرا نام اور کراچی کا پتہ حاصل کیا اور اسلامک ریسرچ سنٹر لاہور پہنچتے ہی مجھے ایک خط لکھا جس کا فوٹو اسٹیٹ نظم کے بعد منسلک ہے میں یہ خط پڑھ کر حیران رہ گئی۔ تعجب ہے کہ نئی دنیا کی جدید ترین یونیورسٹی میں بیٹھ کر ایک غیر مسلم شخص ان صوفیوں اور دینی رہبروں کے حالات پر تحقیق کرنے کے لیے سات سمندر پار کر کے پہنچیں اور ہم اتنی جلد اپنے ثقافتی ورثے کو بھول جائیں اور اپنی تاریخ سے بالکل ناآشنا اور نابلد رہیں۔ پاکستان کی نئی پود کو تو چھوڑیے یہاں کے بہت کم پرانے بزرگ ایسے ہوں گے جو صوفیائے قدیم کی اس عجیب و غریب مہم سے واقف ہوں گے جو انہوں نے اجتماعی طور پر اخلاقی برائیوں کے خلاف شروع کی تھی۔

تاریخ کی کتابوں کی چھان بین کے بعد اس بات پر اور زیادہ حیرت اور افسوس ہوتا ہے کہ شمالی ہند کے تقریباً تمام مورخوں نے دکن کے خطے کو یکسر نظر انداز کر دیا نہ وہاں کے صوفیا کا ذکر ہے اور نہ ان کی بے لوث دینی خدمتوں کا۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے بھی بندھیاچل کے جنوب میں جھانک کر دیکھنے کی زحمت ہی نہیں کی۔

مسٹر ارنسٹ کا خط پڑھ کر اور ان کی لگن کو دیکھ کر میرا سر ندامت سے جھک گیا اور جب ان بزرگوں سے میری پرانی عقیدت میں یہ ندامت شامل ہوگئی تو میں نے ان کے حالات تاریخ کی روشنی میں مرتب کرنے کی ٹھانی۔ اپنے رہبروں، اپنے پیشواؤں اپنے صوفیائے کرام اور دینی رہنماؤں سے یہ غفلت ہم کو کہاں سے جائے گی۔ خدا ہی بہتر جانے سوائے اس کے کیا کہوں کہ خداوند تعالیٰ ہم سب پر اپنا رحم کرے اور نوجوانوں سے پہلے بزرگوں کو نیک توفیق دے۔ آمین

c/o American Center
20 Shara-e Fatima Jinnah
Lahore, Pakistan
May 11, 1986

Wahida Naseem
E/I Jahangir Road West
Karachi 5, Pakistan

Muhtarama Begum Sahib:

I am sorry to have delayed so long in replying to your letter. I was initially involved in some business that took me out of Lahore for some time, and I knew it would take some time to go through all of the interesting material you sent me. Thank you very much for going to the trouble of copying out all of those pages, and for including photostat copies of your various writings. I had some difficulty with reading your Urdu handwriting at first, but a friend helped me with it.

I am delighted to hear that you are involved in work on the history of Khuldabad in such detail. I am taking the liberty of sending you an article that I completed some time ago, which will appear in a book called Social and Economic History of the Medieval Deccan that is being published in Pune this year. I hope you find it of interest. Please keep me informed of your own researches; your own work will be, I expect, a worthy successor to that of Raunaq 'Ali.

It was especially nice to see your Urdu poem about the saints of Khuldabad. I am thinking of writing a separate article giving English translations of some Arabic and Persian poems about Khuldabad, and if you approve, I would like to include the translation of your poem. I will send you a draft version of a translation soon, and if you could examine and correct it, I would greatly appreciate it.

Thank you also for your information about the libraries in Hyderabad and Awrangabad. I have visited the Salar Jung Museum, the A.P. State Archives, as well as the Awqaf library at the Panchakki dargah, so I am familiar with their collections, but I shall make a special point of visiting the Nizam Trust Library in Hyderabad, if I can, this July. I hope to spend some days in Hyderabad then, but my time will be limited; do you know anyone who might be able to introduce me to the director of the Nizam Trust Library? As of now, I have no definite plans to visit Karachi, but I will make some kind of tour in the fall, and if time permits I would most certainly like to meet with you. Once again, thank you for all your help.

Sincerely yours,
Carl W. Ernst

c/o American Center
20 Shara-e Fatima Jinnah
Lahore, Pakistan
March 24, 1986

Wahida Nasim
Government College for Women
Nazimabad
Karachi, Pakistan

Muhtarama Begum Sahib:

I am an American research scholar, working in Pakistan on a Fulbright research grant this year. I am working on a book about the town of Khuldabad, its saints and shrines; an American university press has already agreed to publish the book. I have visited the town several times, and Farid al-Din Salim gave me a good deal of assistance there; he allowed me to see and photograph some very valuable Persian manuscripts about the lives of the shaykhs who are buried there. Last year one of my students from America happened to visit Khuldabad, after hearing about it from me. He heard the people there singing an Urdu ghazal that was written by you, which sang the praises of the saints of Khuldabad.

Since I am now in Pakistan, I hoped to have a chance to meet with you and learn about your own connection with the "qibla-i Deccan." A Mr. Hussaini who works in the U.S. Information Service in Lahore tried to get me your address, and his colleague Mr. Inayat Allah Sharif in Karachi tried to help me meet with you when I was in Karachi briefly last month. Unfortunately my time was very short, and when I tried to find you at the College, you had already left. I regret having missed this chance, and hope there may be another opportunity. If you would be so kind, I would like to request that you send me a copy of your Urdu ghazal about Khuldabad. I would also be especially interested to know if you are aware of any old manuscripts concerned with the saints of Khuldabad, which might be in the possession of muhajirs from the Deccan. In any case, I look forward to hearing from you--please feel free to reply in Urdu if it is more convenient.

Sincerely yours,
C.W. Ernst

Carl W. Ernst
Assistant Professor
Pomona College
Claremont, California

شاہانِ بے تاج

بچپن کی دلکش اور حسین یادوں سے کون انکار کر سکتا ہے ۔ ہر شخص کو اپنی زندگی کا یہ گذرا ہوا دور بہت یاد آتا ہے ۔ خواہ وہ غربت میں پلا ہو یا امارت میں اور میرا بچپن تو واقعی ایسے ناز و نعم میں گذرا کہ جس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں ۔ ان دلفریب یادوں کے ساتھ مجھے اورنگ آباد (دکن) کی گلیوں کا ایک ایک موڑ اور سڑکوں پر واقع ایک ایک دوکان یاد آتی ہے ۔ جن کے درمیان کبھی بڑی سی فورڈ گاڑی میں گھوما کرتی تھی ۔ اس بستی کی یاد اب تک دل کو تڑپاتی ہے جو واقعی "شاہان بے تاج" کی قلمرو رہے ، جو کبھی دولت آصفیہ (نظام) اسٹیٹ کا سب سے زیادہ باغ و بہار صوبہ تھا جو اپنے جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار سے دہلی اور لکھنؤ سے آنے والوں کی آماجگاہ تھا ۔ یہ صوبہ مشرق اور جنوب کی سمتوں میں ریاست دکن سے ملحق تھا ۔ مغرب میں بمبئی اور ناسک کی بستیاں تھیں اور شمال میں خاندیس کی پہاڑیاں جن کے اس پار دریائے تاپتی کے کنارے برہان پور اور زین آباد کے سبزہ زار تھے ۔ دریائے گوداوری اورنگ آباد کے صوبے کے درمیان سے گذرتا تھا ۔ اسی صوبے میں اجنٹا کے نگار خانے ہیں اور ایلورا کے وہ غار ہیں جو برسوں سے سیاحوں کی توجہ کا مرکز رہے ۔ شہر سے تھوڑی دور اورنگ زیب عالم گیر کی بیوی دلرس بانو کا مقبرہ ہے جو تاج محل ثانی کہلاتا ہے اور دوسری طرف ایک عجیب و غریب تعمیر ہے جو "پن چکی" کے نام سے موسوم ہے اگر اس کے متعلق یہ لکھوں تو غلط نہ ہوگا کہ

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است ہمیں است

اس عجیب و غریب عمارت ، بہتے ہوئے پانی اور چلتے ہوئے فواروں کے درمیان جن بزرگ صوفیوں کے مقبرے ہیں وہ حضرت "مسافر شاہ اور حضرت پلنگ پوش" ہیں ۔ شہر کی فصیل سے چودہ پندرہ میل کے فاصلے پر دیوگری (دولت آباد) کا مشہور پہاڑی قلعہ ہے اور اس کی سربلند پہاڑوں کی سبز پوش وادیوں میں "خلد آباد" کی دلفریب بستی ہے ۔

اجنٹہ کی نقاشی اور ایلورا کی سنگ تراشی لاکھوں لوگوں کو یہاں لاتی ہے لیکن بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ جن دلفریب اور پر فضا پہاڑیوں میں غاروں کے اندر ایلورا کا بت خانہ ہے ۔ انھیں پہاڑیوں کی پشت پر ان "شاہان بے تاج" کے آستانے بھی ہیں جنھوں نے تصوف کے میخانے کھولے تھے اور آج تک ان کا روحانی فیض دور دور تک جاری ہے ۔ کبھی یہاں سے رشد و ہدایت کے چشمے پھوٹے تھے ۔ ان بزرگوں اور صوفیا کی حیاتِ پاکیزہ اور اوصاف حمیدہ پر قلم اٹھانا آسان نہیں ہے لیکن میری مشکل پسند طبیعت خواجگان چشت سے والہانہ عقیدت ، خلد آباد کی زمین سے محبت اس مہم کو سر کرنے پر مجھے مجبور کر رہی ہے ۔

اس کو اتفاق وقت کہیئے یا نوشتۂ تقدیر کہ میں نے عہد طفلی میں اپنے والد کے سائے سے محرومی کے بعد اپنے بڑے تایا محمد فرید الدین ایڈوکیٹ کی آغوش محبت میں پرورش پائی جو اپنے پانچوں بھائیوں میں سب سے بڑے اور لاولد تھے ۔ اس وقت ان کا کوئی بھائی زندہ نہ تھا اور نہ کسی بھائی سے اولاد نرینہ تھی ۔ صرف ایک بھائی کی اولاد میں ایک لڑکی تھی جو عمر میں مجھ سے بہت بڑی تھیں ۔ یہی وجہ تھی کہ میرے تایا یعنی عمو جان مرحوم نے تعلیم و تربیت کے معاملے میں اپنی تمام تر توجہ مجھ پر مرکوز کر دی ۔

جس دور کا میں ذکر کر رہی ہوں وہ پورے برصغیر ہندوستان کے لیے انتہائی سکون اور خوشحالی کا دور تھا اور دکن میں تو بقول شخص من برستا تھا ۔ پیسے کی فراوانی اور پٹرول کی ارزانی نے میرے عمو جان اور عمی جان کو نچلا نہ بیٹھنے دیا ۔ وہ اپنے مختصر

سے خاندان یعنی میری والدہ جن کو میں آپا کہتی تھی اور میری چھوٹی بہن کے ساتھ اورنگ آباد سے میلوں دور نکل جاتے۔ کبھی خلد آباد کے شاہی بنگلے میں جو بلند ترین پہاڑ پر تھا ہفتوں قیام کرتے اور کبھی وہاں کی وسیع و عریض درگاہوں کے احاطوں اور خانقاہوں میں بیٹھ کر جسمانی روحانی اور قلبی سکون حاصل کرتے۔ اگر میں یہ لکھوں تو غلط نہ ہوگا کہ میرا بچپن اور لڑکپن انھیں بزرگانِ دین کے قدموں میں گذرا جو خلد آباد اور دولت آباد میں آسودۂ خواب ہیں اور میں ارضِ پاکستان میں ۳۵ برس گذارنے کے بعد بھی ان کو نہیں بھولی ہوں۔ بقول جوش ملیح آبادی۔

پہلے جس چیز کو دیکھا وہ فضا تیری تھی
پہلے جو کان میں آئی وہ صدا تیری تھی
جس نے گہوارے میں چوما وہ صبا تیری تھی
پالنا جس نے ہلایا وہ ہوا تیری تھی
خندۂ گل کی خبر تیری زبانی آئی
تیرے باغوں میں ہوا کھاکے جوانی آئی
ذرے الماس کے تیرے خس و خاشاک میں ہیں
ہڈیاں اپنے بزرگوں کی تیری خاک میں ہیں

جن صوفیا اور اولیاء کی خاک پاک کے صدقے میں میری مشت خاک کندن بنی میں وفورِ عقیدت بن کر ان کو "شاہانِ بے تاج" کے نام سے موسوم کرکے ان کی سوانح حیات کا آغاز کر رہی ہوں۔ یوں تو مذہب سے لگاؤ اور بزرگانِ دین سے عقیدت مجھے ورثے میں ملی ہے لیکن اس تمام تحریر کا نکتۂ آغاز وہ چھوٹا سا واقعہ ہے جس نے میرے کچے ذہن پر بڑے پائیدار اور گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔

یہ بات اس وقت کی ہے جب میری عمر بمشکل چھ یا سات برس تھی۔
ایک دن جمعہ کی چھٹی میں عمو جان مجھے اور گھر کے دیگر افراد کو لے کر حسب دستور خلد آباد روانہ ہوئے۔ اورنگ آباد کے شہر کی فصیل کے اس پھاٹک سے باہر بہت

کم آبادی تھی جس کو دہلی دروازہ کہتے ہیں۔ یہاں سے جانے والی سڑک سیدھی دہلی تک جاتی ہے۔ اور اس پر دو رویہ برگد اور گل مہر کے درخت تاحد نظر سرخ اور سبز کمانیں بناتے چلے گئے ہیں۔ جن کے درمیان جب گاڑی گذرتی ہے تو ایک طرف خنکی کا احساس ہوتا ہے۔ دوسری طرف درختوں کے اس پار لہلہاتے ہوئے کھیت سبز پوش پہاڑیاں دل کو سکون اور رُوح کو فرحت دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ دکن سے دہلی کو ملانے والی یہی سڑک ہے جس پر چل کر علاؤالدین خلجی دیوگری آیا تھا اور بعد کو محمد تغلق نے اس کو پختہ بنا کر اس پر سایہ دار درخت لگائے تھے۔ مجھے یہ راستہ اب بھی اتنا ہی اچھا لگتا ہے جتنا اس وقت لگتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد دولت کو چھوڑ کر ہم لوگ خلد آباد کی سمت مڑے اور وہاں پہنچے کہ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ایک جگہ گاڑی رک گئی اور عمو جان نے ہم سب کو نیچے اتار کر اپنے ساتھ کچے راستے پر چلنے کو کہا۔ راہ ناہموار اور ذرا سی دشوار گذار ضرور تھی لیکن سرسبز پہاڑیوں کے دامن میں نگینے کی طرح ایک صاف شفاف گنبد ہماری منزل مقصود کا پتہ دے رہا تھا جس کا حسن برسات سے اور زیادہ نکھر گیا تھا۔

نئے نئے مقامات پر جانے اور وہاں کے متعلق بے شمار سوالات کرنے کی مجھے بچپن ہی سے تھی۔ چنانچہ اپنی والدہ یعنی آپا سے مختصر سی گفتگو کے بعد مجھے پتہ چل ہی گیا کہ ہم اس وقت جن بزرگ کی درگاہ پر جا رہے ہیں ان کا نام امیر حسن ہے جو نہ صرف روحانی دنیا میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے تھے بلکہ اعلیٰ پایہ کے مصنف، مولف اور شاعر بھی تھے۔ اپنے دور میں ان کے "تبحر" علمی کا جواب نہ تھا۔ اور وہ دہلی سے دکن آئے تو یہیں کے ہو رہے۔

وہاں پہنچ کر عمو جان نے حسب دستور تحیۃ المسجد ادا کی۔ عمی جان نے میرے سر پر چھوٹا سا دوپٹہ اوڑھایا اور امیر حسن صاحب کے مزار کے داہنی طرف کھڑا کر دیا۔ عمو جان نے مزار کے تعویذ کو رومال سے صاف کرکے اس پر تھوڑی

سی شکر ڈلی۔ صاحبِ مزار کی فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے اور پھر انھوں نے مجھے زبان سے شکر چاٹنے کا حکم دیا جس کی میں نے فوراً تعمیل کی اور اس عرصہ میں وہ زیرِ لب دُعائیں مانگتے رہے جس کا مفہوم یہ تھا۔

"اے پاک پروردگار میری یہ لڑکی خاندان کا سرمایہ ہے اس کو دینی امور، دینوی علوم سے نواز دے۔ اس سے میرے آباو اجداد کا نام روشن کر، خواجگانِ چشت کے صدقے میں اس کو تصنیف و تالیف اور شعر و ادب کی دولت سے مالا مال کر۔"

میں نے دل بھر کر شکر چاٹنے کے بعد اپنی "آپا" یعنی والدہ صاحبہ کا دماغ چاٹنا شروع کر دیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ امیر حسن صاحب بہت بڑے عالم، ادیب اور کامل ولی تھے۔ انھوں نے بہت ساری کتابیں لکھیں اور اپنے شاگردوں کو نااہل پاکر اپنا سارا کتب خانہ اپنے ساتھ قبر میں دفن کر دینے کی وصیّت کی۔ اس وقت عوام الناس میں اس قسم کی روایات مشہور تھیں۔ اس لیے میں بھی آنکھیں بند کر کے ایمان لائی (بعد کو معلوم ہوا کہ یہ مزار حضرت امیر حسن

بن علاء السنجری دہلوی کا ہے جو سلطان المشائخ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کے مریدانِ خاص میں سے تھے۔ اور اپنے زمانے کے عالموں اور فاضلوں میں بہت بڑا مرتبہ رکھتے تھے۔ بہترین شاعر اور نثر نگار تھے، فوائد الفواد کے نام سے انھوں نے حضرت محبوب الٰہی کے ملفوظات مرتب کیے ہیں جو آج تک مشائخ کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ انھیں کے قدموں میں ہندوستان کے مشہور مصنف اور مورخ مولانا آزاد بلگرامی ابدی نیند سو رہے ہیں۔

میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ میرے بزرگوں کی مانگی ہوئی یہ دعا کس حد تک قبول ہوئی مگر اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میرے دل میں علم کی نئی جوت جگا گئی اور ۱۹۳۹ء ہی سے میں نے شعر اور کہانیاں لکھنا شروع کر دیں اور بچپن سے لے کر ۱۹۵۳ء تک یہی آستانے یہی درگاہیں میرے لیے گھر آنگن بنے رہے۔

۱۹۵۳ء میں جب میں پاکستان آئی تو اس وقت میرا شعور آج کی طرح پختہ نہ تھا۔ ایک طرف دل سقوطِ دکن اور جامعہ عثمانیہ کی بربادی سے ٹوٹا ہوا تھا دوسری طرف دل تعمیرِ پاکستان کے جذبے سے سرشار تھا۔ اپنی زندگی کی انتہائی جدوجہد اور سرکاری ملازمت یعنی درس و تدریس کے طویل سفر کے اختتام پر جب میں ۱۹۸۲ء-۸۳ء میں عرصہ دراز کے بعد ہندوستان گئی تو بمبئی سے اورنگ آباد کے قریب ترین راستے کے بجائے دہلی سے اورنگ آباد کا راستہ اختیار کیا تاکہ سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہی کے قدموں میں کچھ وقت گذار سکوں جن کے مریدوں اور خلیفاؤں کی کشش مجھے اورنگ آباد لے جا رہی تھی۔ دورانِ سفر میں نے شمالی ہند کے اکثر مقامات دیکھے۔ والدہ صاحبہ کی نصیحت کے مطابق اپنے ننھیال کاکوری گئی جہاں قادریہ، قلندریہ سلسلے کے بہت بڑے بزرگ حضرت شاہ کاظم قلندر کا مزار ہے۔

اور ان کے اکثر خلفاء مدفون ہیں ۔ وہاں میری بڑی آؤ بھگت ہوئی ۔ سجادہ نشینوں نے بڑی شفقت سے مہمان نوازی کی کیونکہ ان سے میرا قریبی رشتہ بھی تھا۔ اس کے بعد فرنگی محل گئی جہاں میرے ددھیال کی ایک شاخ آباد ہے ۔ پھر "بانسہ" گئی جہاں عبدالرزاق صاحب بانسوی کا آستانہ ہے اور وہاں میری سگی پھوپھی کے پوتے سجادہ نشین ہیں ۔ میں اس سفر میں کہاں کہاں پہونچی ، کن کن آستانوں پہ حاضری دی ۔ یہ نہ پوچھئے ۔ ہر جگہ بزرگوں کا جلال اور ہیبت تھی یا پھر مقبروں کی ویرانی ، میرا دل کہیں بھی نہ لگا ۔ مجھے اس یگانگت ، رحمت اور سکون کا احساس کہیں نہ ہوا جو خلدآباد میں تھا ۔ کچھ درگاہیں بستی سے اتنی ملحق تھیں کہ وہاں ایک لمحہ بھی خاموشی نہ تھی اور کچھ آستانے اتنے ویران بھی تھے کہ وہاں بیٹھ کر وحشت سی ہوتی تھی آخر خلدآباد کی درگاہوں میں کیا خاص بات ہے ۔ یہ بھی تو آخر بستی سے دور ہیں لیکن انکی رونقیں ہی کچھ اور ہیں جو بستیوں کے اندر ہیں ۔ وہاں بھی سکون اور خاموشی ہے ۔ دل لگتا ہے ۔ اک عجیب سی فرحت محسوس ہوتی ہے ۔ جوں جوں میں غور کرتی رہی میرے ذہن میں یہ بات پختہ ہوتی گئی کہ خلدآباد اور دولت آباد کے علاوہ کہیں کی درگاہیں نہ اتنی بلندی اور اتنی پر فضا مقامات پر بنی ہیں اور نہ کسی کے ساتھ اتنے وسیع اور کشادہ صحن ہیں جو ہزاروں آدمیوں کو دامن میں چھپالیں ۔ وہ روپیہ اتنی بڑی بڑی پختہ اور مضبوط خانقاہیں جو سینکڑوں طالب علموں کو بیک وقت اپنے سینے سے لگا سکیں ۔ نہ کسی اور درگاہ کے ساتھ اتنے بڑے بڑے باغات اور زرعی زمینیں ہیں جو ان کی دیکھ بھال کے لیے وقف ہیں ۔

آخر وہ کون عقیدت مند تھے جنھوں نے اتنی بڑی زمینیں ان درگاہوں کی دیکھ بھال اور مرمت کے لیے وقف کی تھیں ؟ وہ کونسے سلاطین اور امراء تھے جنھوں نے زر کثیر خرچ کر کے ان پہاڑیوں پہ ابھرے یا دوہرے چبوتروں پر اتنی شاندار درگاہیں بنائیں کہ ابتدائے زمانہ صدیاں گذرنے کے بعد بھی انکی ایک اینٹ تک نہ ہلا سکا ۔ گنبدوں کو دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ معمار ابھی ابھی کام ختم کر کے گئے ہیں ۔ مسجدوں میں جائیے تو پتہ چلے کہ آج ابھی سفیدی ہوئی ہے ۔ چھلکتے ہوئے فواروں اور ابلتے ہوئے حوضوں پر غور کیجئے تو ایسا لگے جیسے سلاطین سلف ابھی ابھی وضو سے فارغ ہو کر گئے ہیں ۔ طرز تعمیر پر غور کیجئے تو سر چکرا جائے ۔ ان میں سے اکثر مغلیہ دور سے بہت پہلے کی ہیں ۔ اس کے باوجود نہ ان پر "بہمنی" طرز تعمیر کا ٹھپہ ہے نہ "خلجیوں" کی عمارتوں کا اثر ہے ۔ پھر آخر انکے بنانے والے کون تھے ؟ اور بیک وقت اتنے ولی اللہ اور بزرگان دین اس مقام پر کیسے جمع ہو گیے ؟ جن میں سے جو بہت نمایاں ہیں ان کے نام یہ ہیں ۔

۱۔ حضرت مومن عارف صاحب باقی باللہ
۲۔ حضرت جلال الدین گنج رواں
۳۔ حضرت خاکسار صاحب
۴۔ حضرت بہاءالدین انصاری صاحب
۵۔ حضرت خواجہ منتجب الدین صاحب زرزری زر بخش صاحب
۶۔ حضرت برہان الدین غریب رحمۃ اللہ
۷۔ حضرت زین الدین داؤد شیرازی
۸۔ حضرت راجو القتال حسینی (والد بزرگوار حضرت بندہ نواز گیسو دراز)
۹۔ حضرت مخدوم نظام الدین (کاغذی پورہ)
۱۰۔ حضرت امیر حسن بن علاء السنجری ۔ خلدآباد
۱۱۔ حضرت نظام الدین مقبول الٰہی ۔ اورنگ آباد
۱۲۔ حضرت شاہ نور حموی ۔ اورنگ آباد
۱۳۔ حضرت مسافر شاہ صاحب پن چکی اورنگ آباد
۱۴۔ حضرت پلنگ پوش صاحب پن چکی اورنگ آباد

ان کے علاوہ اور نہ جانے کتنے صاحب کرامت اور صاحب ولایت لوگ گذر چکے ہیں جو یہاں کی خاک میں مدفون ہیں ۔ اس سلسلے میں مجھے اپنے بچپن بلکہ لڑکپن کا ایک واقعہ اب بھی یاد ہے ۔

جیساکہ میں بتا چکی ہوں کہ اورنگ آباد نظام اسٹیٹ کا باغ و بہار صوبہ تھا اور اس وقت سے ریاستی نظام کے تحت ہر صوبے کا حاکم صوبہ دار کہلاتا تھا چنانچہ اس وقت اورنگ آباد کے صوبہ دار رضا نواز جنگ تھے جو نہ صرف خود درویش صفت تھے بلکہ مساکین، فقراء اور عالموں کے قدردان بھی تھے۔ عمو جان مرحوم سے ان کی بہت دوستی تھی اور اکثر دونوں میں تبادلہ خیال ہوتا رہتا۔ اتفاق ہے کہ اسی زمانے میں دہلی یا اجمیر سے ایک بہت بڑے بزرگ تشریف لائے جو صاحب "کشف" تھے۔ وہ اپنی سیاحت کے دوران جہاں جاتے بذریعہ "کشف" معلوم کر لیتے کہ یہاں "بزرگان دین" کتنے ہیں اور کہاں ہیں۔ اور انکی پاک روحیں ایک روشن چراغ یا ستارے کی صورت میں انکی رہنمائی کرتی تھیں جب وہ اپنے سفر کے دوران دولت آباد سے گذر کر خلد آباد پہنچے تو وہاں بھی کشف کیا اور اس کے بعد جوتے اتار کر پیدل وہاں سے اورنگ آباد آئے۔ جب تک وہاں مقیم رہے جوتے نہیں پہنے اور بقول رضا نواز جنگ مرحوم انھوں نے یہی کہا کہ میں نے جب دولت آباد پہنچ "کشف القبور" کا عمل کیا تو پتہ چلا کہ خلد آباد کی پہاڑیوں سے لے کر اورنگ آباد کی بستی تک ساری زمین پر ستارے ہی ستارے بکھرے ہوئے ہیں۔ میں نے اتنی زیادہ تعداد میں کسی اور مقام پر ولیوں اور بزرگوں کی روحیں نہیں دیکھیں اسی لیے میں نے ان کے احترام میں جوتے اتار کر یہاں ننگے پاؤں پھرنا شروع کر دیا ہے۔

ان کے اس کشف کے بعد اس خطہ زمین کے "نورانی ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا لیکن پھر بھی یہ تجسس باقی رہتا ہے کہ یہ سب یہاں کیسے پہونچے۔ ان کے مزارات کس نے بنوائے؟ اور ان آسودگان خاک اولیائے کرام کی سوانح حیات کیا ہے.؟ ان تینوں سوالات کے جوابات تلاش کرنے کے لیے میں نے کبھی تاریخ کے اوراق پارینہ اکٹھا کیے اور کبھی صوفیائے کرام کی حیات طیبہ کی تلاش میں تصوف کی کتابیں اٹھائیں کبھی طرز تعمیر کی ٹکریں، آثار قدیمہ کے گم شدہ باب تلاش کیے اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچی کہ ان اولیائے کرام کی حیات طیبہ جن میں زیادہ خواجگان

چشت ہیں۔ برصغیر ہند و پاک کی تاریخ سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور جب ہم ان کی دکن آمد اور وہاں پر انکی دینی سرگرمیوں اور تبلیغ اسلام پر قلم اٹھاتے ہیں تو دکن بالخصوص اورنگ آباد کے مخصوص جغرافیائی حالات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

اس کو محض اتفاق کہیے یا دکن کی بد نصیبی کو شمالی ہند کو جتنے سوانح نگار اور مورخ گذرے ہیں انھوں نے دکن پر کبھی کوئی سیر حاصل تبصرہ نہیں کیا اور نہ بندھیاچل اور ست پڑا کی طویل اور بلند پہاڑیوں کی پشت پر آباد ہونے والے شہریوں کا جائزہ لیا۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہندوستان کے مورخین کو دکن کے صرف تین اہم واقعات یاد ہیں جن میں سب سے پہلے علاؤالدین خلجی کا دیوگری (دولت آباد) پر حملہ ہے۔ دوسرے سلطان محمد تغلق کا دہلی سے دکن میں پایۂ تخت منتقل کرنا ہے اور تیسرے مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں اورنگ زیب عالمگیر کا دکن میں طویل قیام ہے۔ حالانکہ ان تینوں تاریخی واقعات کے درمیان صدیوں کا طویل عرصہ ہے اور اس دوران دکن کی سرزمین پر سیاسی حالات جو رخ بدلتے رہے اور جو سلطنتیں بنتی اور بگڑتی رہیں ان کو شمالی ہند کے مورخین نے یکسر نظر انداز کر دیا۔ اور بد قسمتی سے دکن کی تاریخ لکھنے والے یہ نہ لکھ سکے کہ دکن کی ریاستیں دہلی کے کس شہنشاہ یا بادشاہ کی ہم عصر تھیں۔

بہر کیف جب ہم تاریخ ہند اور تاریخ دکن کا بیک وقت جائزہ لیتے ہیں تو مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد سے لے کر تقسیم ہند تک کے واقعات میں اولیائے کرام اور صوفیوں کی تاریخ کو یہاں کی سیاست سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تصوف کے مکتب کا پہلا سبق یہی ہے کہ بادشاہوں اور صاحب اقتدار لوگوں سے کنارہ کش رہو کیونکہ ایمان میں رخنہ اندازی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ تصوف کی ابتداء ہی اقتدار پرستی سے بغاوت، دربار داری سے نفرت، ریاکاری سے پرہیز اور منافقت سے گریز کی بناء پر ہوئی لیکن جتنے شاہان سلف گذرے ہیں وہ انھیں

"شاہان بے تاج" کی آستاں بوسی کے بعد فتح و نصرت سے ہم کنار ہوئے ہیں۔ انھیں سے بغاوت کر کے ذلیل و خوار ہوئے ہیں اور انھی کی دعاؤں سے پھلے پھولے ہیں۔ اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ شمالی ہند میں مسلمانوں کی آمد سلطان محمود غزنوی کے پنجاب اور سرہند پر متعدد حملوں سے شروع ہوتی ہے اور پہلا حملہ ۳۹۱ھ یا ۱۰۰۰ء میں ہے جس کے بعد آخری حملہ ۴۱۷ھ مطابق ۱۰۲۶ء میں ہے جس کے بعد سومنات کا تاریخی مندر فتح ہوا ہے۔

سلطان محمود غزنوی کی روحانی مدد اور لشکر اسلام کی پشت پناہی کے لیے جانے کتنے قطب اور ابدال غزنی کے ساتھ آئے ہوں کوئی نہیں کہہ سکتا لیکن دو باتیں بہت اہم ہیں ایک تو یہ کہ اسی محمود کے لشکر کے ساتھ داتا گنج بخش علی عثمان ہجویری تشریف لائے اور ہندوستان کے مشرق میں لاہور کے مقام پر اپنا جھنڈا گاڑ دیا۔ دوسرے مشہور معروف بزرگ جناب سالار مسعود غازی ہیں جنھوں نے دریائے گنگا کے کنارے پر مصلّے بچھایا اور ذوق عبادت اور شوق ریاضت میں ہندوستان کے مغربی کنارے یعنی بہرائچ تک پہنچ گئے اور وہاں اپنا روحانی فیض جاری رکھا۔ اس کے باوجود جب سومنات پر بھرپور حملے کا وقت آیا اور تمام راجاؤں نے اپنا لاؤ لشکر اور مال داؤ پر لگا دیا۔ وہ گھمسان کا رن پڑا کہ خدا کی پناہ "نہروالے راجہ کا لشکر ٹڈی دل تھا۔ سب لوگ اپنی زمین پر مدافعتی جنگ لڑ چکے تھے۔ اور اسی طوفان بلا میں اپنی مٹھی بھر لشکر کے ساتھ سلطان محمود غزنوی حملہ آور تھا۔ اس کٹھن وقت میں محمود کے کام آنے والی جو ہستی خداوند قدوس کے بعد تھی وہ خود سلطان محمود غزنوی کے پیر و مرشد حضرت شیخ ابوالحسن خرقانی کی ذات بابرکات کا روحانی فیض تھا۔ تلواروں کی چھاؤں اور نیزوں کی چمک، تیروں کی بوچھاڑ اور تلواروں کی جھنکار میں محمود غزنوی نے انھیں کا خرقہ ہاتھوں میں اٹھایا۔ زمین پر جھک کر خدا کے حضور سجدہ کیا اور اپنے پیر مرشد کے واسطے سے ان کا خرقہ پکڑ کر خدا کے حضور فتح و نصرت کی دعا کی جو مقبول ہوئی (حوالے کیلئے تاریخ فرشتہ)

سومنات تو خیر معجزانہ طور پر فتح ہو گیا لیکن حضرت شیخ ابوالحسن خرقانی نے محمود غزنوی کو خواب میں تنبیہہ کی کہ فتح سومنات جیسی معمولی سی بات کے لیے تم میرے خرقے کو درمیان میں کیوں لائے؟ مقبولیت کی گھڑی آ چکی تھی۔ اگر تم میرا دامن پکڑ کر یہ دعا مانگتے کہ خدایا ہندوستان کے تمام باشندوں کو توفیق دے کہ وہ اسلام قبول کر لیں تو قسم ہے میری عزت و جلال کی کہ یہ دعا بھی قبول ہو جاتی۔

محمود غزنوی کے بعد سلطان محمد غوری ۵۷۱ھ مطابق ۱۱۷۵ء میں درہ خیبر کے راستے سرحد اور پنجاب آیا۔ اس وقت ملتان میں حضرت بہاءالدین ذکریا ملتانی حیات تھے۔ اس نے انکے دربار میں سر جھکایا اور جب دہلی فتح کرنے کا خیال کیا تو پرتھوی راج چوہان کی سطوت اور دبدبے کی وجہ سے ایک بار شکست سے ہمکنار ہوا لیکن جب سلطان ہند حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے پرتھوی راج کے متعلق فرمایا کہ "ہم نے پرتھوی راج کو زندہ لشکر اسلام کے حوالے کر دیا"۔ تو گویا محمد غوری کی فتح یقینی ہو گئی اور یہ سلطان ہند ہی کا فیض بے پایاں تھا کہ دہلی میں پہلی بار اسلامی سلطنت قائم ہوئی۔ سلطان محمد غوری تو دہلی فتح کر کے واپس چلا گیا اور یہاں کا اقتدار اپنے غلاموں کے سپرد کر گیا۔ قطب الدین ایبک (خاندان غلاماں) نے جب دہلی کا تخت و تاج سنبھالا تو حضرت خواجہ معین الدین چشتی سلطان ہند نے اپنے چہیتے اور کم عمر خلیفہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی کو دہلی میں اپنا نائب مقرر کیا۔ ایبک کے بعد التمش خواجگان چشت کا بیحد عقیدت مند رہا اور اس کے بعد غیاث الدین بلبن تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جب حضرت بختیار کاکی "اوش" میں تھے تو آپ نے "بلبن" کو پہلی بار دیکھا تھا وہ بھی اس وقت نو عمر تھا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ یہ لڑکا ایک نہ ایک دن دہلی کے تخت پر بیٹھے گا۔ حالانکہ اس وقت بچارا بلبن ایک غلام لڑکا تھا اور کسی کے وہم و گمان میں یہ بات نہ تھی کہ ایک دن اس کے مقدر کا تارا یوں چمکے گا۔

خاندان غلامان کے خاتمے کے بعد "خلجی" آئے اور انھوں نے دہلی میں حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ اس وقت تک اسلامی حکومتوں کا دائرہ محدود تھا۔ محمود غزنوی صرف سومنات تک گیا تھا۔ بندھیاچل اور ست پڑا کے اس پار جزیرہ نمائے دکن کو فتح کرنیکا خیال پہلی بار علاؤالدین خلجی کو آیا اور وہ ایک لشکر جرار لے کر دکن کی طرف بڑھا۔

اس وقت اورنگ آباد کا شہر "کھڑکی" کہلاتا تھا جس کے معنی اونچے نیچے ناہموار راستوں کے ہیں، راجہ رام دیو کا دارالخلافہ دیوگری (دولت آباد) تھا اور اس کے بعد خلد آباد کی پہاڑیاں تھیں۔ ان پہاڑیوں پر دو بزرگوں کے مزارات اور درگاہیں اب تک موجود ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ خلجیوں کے حملے کے وقت یہاں آئے تھے۔ ان میں سے ایک مزار حضرت مومن عارف صاحب باقی باللہ کا ہے جو دولت آباد سے آگے داہنی طرف پہاڑی واقع ہے اور دوسرا حضرت جلال الدین گنج رواں کا ہے جو بائیں طرف موڑ کے بعد ہے۔ یہ دونوں بزرگ قادریہ اور سہروردیہ سلسلے کے ہیں اور غالباً انھیں کے نقش قدم پر چل کر خلجی یہاں تک پہونچا تھا اور فتح سے ہمکنار ہوا تھا۔ خلجیوں کا طرز تعمیر اس معاملے میں منفرد تھا کہ ان کے مقبروں کے حجرے ڈھلوانی دیواروں کے تھے یعنی حجروں کی چوڑائی اور لمبائی چھت کی طرف بتدریج کم ہوتی ہے اور اس کے اوپر ایک چپٹا گنبد بنایا جاتا تھا جو نیم دائرے سے کم ہوتا تھا اور ان کی محرابیں بھی نوکدار تھیں۔

اس کے بعد ہندوستان کی تاریخ میں تغلق خاندان نے حکمرانی کی۔ حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خلافت بابا فرید گنج شکر کو دے کر پاک پٹن بھیج دیا اور انھوں نے حضرت محبوب الہٰی (نظام الدین) کو دہلی کی ولایت دی تھی۔ حضرت محبوب الہٰی نے خلجیوں کے آخری دور سے لے کر تغلق خاندان کے عہد حکومت تک اپنا فیض جاری رکھا۔

حضرت محبوب الہٰی کا دور چشتیہ سلسلے کے لیے مشعل راہ بنا۔ انھوں نے اس خانقاہی نظام کو مربوط و مضبوط بنایا جہاں اخلاق کے پیکر انسانوں کے روپ میں ڈھلا کرتے تھے، صوفیا اور درویشوں کے لیے چشتیہ سلسلے کی خانقاہوں میں بڑی کشش تھی۔ خود سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء کی ذات بابرکات "پارس" کا وہ پتھر تھی جس سے نہ جانے کتنے لوہے کے ٹکڑے سونا بن چکے تھے۔ ان کے آستانے ان کے دل و دماغ کی طرح کھلے ہوئے تھے جہاں ہندو، مسلم، سکھ ہر مذہب کے لوگوں کی پذیرائی تھی۔ معرفت کے شیریں چشموں سے درویش، سادھو صوفی، رشی منی سب یکساں فیض یاب ہوتے تھے۔ حضرت محبوب الہٰی کی ذات بابرکات خورشید کمال تھی جس کے گرد لاکھوں ستارے روشنی کے حصول کے لیے جمع رہا کرتے تھے۔ ان کی مقبولیت ان کا فیض اتنا عام تھا کہ لوگ ان کو دہلی کا "بادشاہ بے تاج" کہا کرتے تھے۔

۱۳۰۹ء میں (دیوگری کی فتح کے بعد) ایک روز حضرت محبوب الہٰی نے اپنے نوعمر اور ہونہار مرید خواجہ منتخب الدین زرزری بخش کو طلب کیا (جو حضرت محمود ہانسوی کے چھوٹے بیٹے تھے اور ان کے بڑے بھائی حضرت برہان الدین غریب تھے) اور بحکم الہٰی ان سے ارشاد فرمایا کہ "تم سات سو پالکیاں یعنی چودہ سو اولیاء اور مریدوں کو لے کر دکن جاؤ اور وہاں رشد و ہدایت کی داغ بیل ڈالو۔" (اس کی تفصیل آگے آئے گی) چنانچہ انھوں نے تعمیل حکم میں خواجگان چشت کی ایک بہت بڑی جماعت بنائی اور پیر و مرشد کے حکم کے مطابق دیوگری روانہ ہوگئے۔ اور یوں ۱۳۰۹ء میں سرزمین دکن پر قدم رکھنے والے پہلے بزرگ حضرت منتخب الدین قرار پائے (برہان الدین غریب نہیں ہیں) وہاں پہنچ کر آپ نے اپنا آخری پڑاؤ ایک ویران پہاڑی کے مقام پر ڈالا۔ جہاں ایک چھوٹا سا تالاب تھا۔ اب یہ جگہ کاغذی پورہ کہلاتی ہے۔ وہاں اس قافلے کے بزرگ ترین صوفی حضرت مخدوم نظام الدین نے ان چودہ سو ولیوں کی امامت کی

نماز پڑھائی اور یہ اولیاء مسجد اب بھی قرب و جوار میں موجود ہے۔ حضرت مخدوم نظام الدین وہیں رک گئے اور حضرت زرزری زر بخش نے خلد آباد (جو اس زمانے میں دیوناسی کہلاتا تھا) کی سب سے اونچی پہاڑی پر قیام فرمایا۔ وہیں ایک چھوٹے سے حجرے میں چلہ کشی کی اور ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کی جو آج تک موجود ہے اور "ہوڑے کی مسجد" کہلاتی ہے۔ اور ان کے مرید جن میں سے ہر ایک ولی کامل تھا موتیوں کی طرح یہاں بکھر گئے۔

حضرت زرزری زر بخش نے سترہ برس تک تشنگان علم کو فیض یاب کیا اور اس کے بعد یہ آفتاب رشد و ہدایت چھپ گیا اور خلد آباد کی زمین کندن بن گئی۔

آپ کا وصال ۱۳۲۶ء میں ہوا۔ یہ سلطان محمد تغلق کا وہ دور تھا۔ اس کے سر میں منتقلی کا سودا سمایا ہوا تھا دوسری جانب حضرت محبوب الٰہی تھے جو دہلی کے بے تاج بادشاہ تھے ان کی مقبولیت اور روحانی حکمرانی اس کی نگاہوں میں کھٹک رہی تھی۔ اس مرحلے پر اس نے صوفیا کو بھی حکم دیا کہ آپ بھی فوراً ہی دہلی سے دکن چلے جائیں آپ کے لیے زاد راہ فراہم کر دیا جائے گا اور حکومت آپکی مناسب دیکھ بھال کرے گی سلطان کا یہ حکم صوفیائے چشت کے سامنے بالکل ناقابل قبول تھا۔ وہ کسی قیمت پر بھی اپنے ضمیر کو شاہان وقت کا پابند نہیں کر سکتے تھے خدا کو چھوڑ کر ان پر بھروسہ کرنا ان کے مسلک اور آداب تصوف کے خلاف تھا چنانچہ انھوں نے یہی جواب دیا کہ ہم لوگ دین کی اشاعت اور تبلیغ کے لیے خود ہی کسی مناسب وقت پر اپنی مرضی سے چلے جائیں گے۔ ساری زمین خدا کی ملکیت ہے جہاں ہمارا رزق لکھا ہے وہیں ملے گا۔ کچھ عرصہ تک یہی کشمکش جاری رہی اور اس کے بعد سلطان محمد تغلق نے جبراً ان کو سفر کا حکم دیا اور اس دوران جب حضرت منتخب الدین زرزری زر بخش صاحب کا وصال ہوا تو محبوب الٰہی نے ان کے بڑے بھائی حضرت برہان الدین غریب کے ساتھ پھر اپنے مریدوں اور مشائخ کا قافلہ دکن روانہ کر دیا جن میں حضرت برہان الدین غریب کے ساتھ پھر اپنے مریدوں اور مشائخ کا قافلہ دکن روانہ

کر دیا جن میں حضرت برہان الدین غریب کے ہمراہ حضرت راجو قتال حسینی بھی تھے۔ اس قافلے نے ۱۳۳۷ء کے لگ بھگ ہجرت کی۔ راجو قتال حسینی کے صاحب زادے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز اس وقت عہد طفلی میں تھے۔

ظاہر ہے کہ اس وقت نہ ذرائع آمد و رفت تھے نہ تیز رو سواریاں اور نہ ہی سفر کی سہولتیں میسر تھیں۔ دہلی سے اورنگ آباد تک کا سفر آسان نہ تھا۔ اب بھی تیز رفتار ٹرینوں کی مدد سے یہ فاصلہ ڈھائی سے تین دن تک میں طے ہوتا ہے تو اس وقت کیا عالم ہوگا؟ بہر کیف یہ مرحلہ بتدریج طے ہوا۔ دہلی اجڑتی گئی اور ایک نئی بستی زبردستی بستی رہی اور یہ کام ۱۳۴۲ء میں مکمل ہوا اور یہی وہ سن تھا جب سلطان محمد تغلق آخری بار دکن آیا اور یوں اقتدار اور بادشاہت کے مرکز کے ساتھ ساتھ روحانیت کا سرچشمہ ہی دہلی سے جنوبی ہند یعنی دولت آباد منتقل ہو گیا۔

سلطان محمد تغلق کے جبر و تشدد سے دہلی اجڑ گئی۔ خانقاہی نظام برباد ہو گیا۔ معاشرے اور اخلاقی اقدار کے وہ سارے تار و پود بکھر گئے جن کو اخلاقیات میں کلیدی حیثیت حاصل تھی۔ وہ نظام درس و تدریس جس میں علم سے زیادہ عمل پر اور آرام طلبی سے زیادہ مشقت پر زور دیا گیا تھا درہم برہم ہو گیا۔ دہلی میں بے لوث علم اور پر خلوص عمل ایک بہت بڑا آئینہ تھا جو ٹوٹ گیا لیکن اس کے ٹکڑے سارے ہندوستان خصوصاً جنوبی ہند میں اس طرح بکھرے کہ ہر ٹکڑا ایک مکمل آئینہ بن گیا۔ ہر ذرہ اپنی جگہ آفتاب بن کر جگمگانے لگا۔ ان سب کا مرکز دیوگری یا دولت آباد اور خلد آباد تھا جہاں سب سے پر کشش اور مرکزی حیثیت حضرت برہان الدین غریب کو حاصل تھی۔ انھیں کے اشارے پر یہ اولیائے کرام گجرات، مالوہ کاٹھیاواڑ، مدھیہ پردیش، برار، احمد آباد اور گجرات سے لے کر راس کماری تک کے چپے چپے پر بکھر گئے۔ دولت آباد اور خلد آباد میں بے شمار معروف اور نامور بزرگوں کے مقبرے مرجع خلائق ہیں۔ بیسیوں کامل ولیوں کے مزارات انکے احاطے میں موجود ہیں اور ہزاروں گمنامی کے عالم میں یہاں کی خاک میں اس طرح آسودہ ہیں

کہ نشان دور دور تک نہیں ملتا۔ البتہ کشف القبور کرنے والوں کو یہاں ہر طرف بکھری ہوئی کہکشاں دکھائی دیتی ہے۔

۱۳۴۲ء میں جب سلطان محمد تغلق دکن سے دہلی روانہ ہوا تو اس کی سلطنت میں زوال کے آثار کافی نمایاں تھے اور اس سے موقع پر سب سے پہلے دکن میں دیوگری یعنی دولت آباد والوں نے فائدہ اٹھایا۔ علم بغاوت بلند کیا اور اسی دولت آباد میں ۱۳۴۷ء میں حسن گنگو کی تاج پوشی کر کے بہمنی سلطنت کی بنیاد رکھدی۔ اور یوں شمالی ہند نے غلامی کی زنجیریں کاٹ دیں۔

جس حسن گنگو بہمنی نے اتنی عظیم الشان سلطنت کی بنیا ڈالی جس کا دار الخلافہ بعد کو "بیدر" آندھرا پردیش قرار پایا اور جس خاندان نے کم و بیش ڈیڑھ سو برس تک انتہائی عدل اور سکون سے حکومت کی۔ اس کے بانی کا حال بھی سن لیجیے کہ وہ اور اس کا خاندان کس کی دعاؤں سے پھلا پھولا اور دکن کا تاج اس کو کس نے بخشا؟

حسن گنگو کا پورا نام علاؤالدین حسن بہمنی تھا۔ صاحب تخت و تاج ہونے سے برسوں پہلے یہ ایک دن حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں ان کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا۔ اتفاق سے تغلق خاندان کا کوئی شہزادہ حضرت سے شرف ملاقات کے بعد واپس جا رہا تھا۔ علاؤالدین حسن گنگو ابھی دروازے ہی پر تھے کہ محبوب الٰہی نے اپنے ملازم خاص کو گنگو کو بلانے کے لیے بھیجا اور زبان خاص سے فرمایا کہ:

"سلطانے رفت و سلطانے آمد"

"ایک بادشاہ گیا اور دوسرا آیا" لوگ اس بشارت پر حیران رہ گیے۔ حسن گنگو جب اندر پہنچا تو آپ کے اس جو کی روٹی پر جو افطار کے لیے رکھی تھی انگلی رکھ کر دو بار ارشاد کیا کہ:

"یہ تاج شاہی ہے جو دکن کی سرزمین پر تیرے خاندان کے مقدر میں رہے گا"۔ (یہ واقعہ تاریخ فرشتہ سے منقول ہے)

بہمنی سلطنت کے قیام اور حسن گنگو کی تاج پوشی کے وقت سلطان المشائخ

حضرت محبوب الٰہی کا وصال ہو چکا تھا لیکن اس نے فرط عقیدت میں پانچ من سونا اور دس من چاندی ان کی خانقاہ میں غربا اور مساکین میں تقسیم کرنے کے لیے بھجوا دیا۔ اور یوں اس نے تسلیم کر لیا کہ اس کو چتر شاہی یا تخت سلطنت بلا وہ "محبوب الٰہی" کی دعاؤں کا ثمرہ تھا۔

یہ تو تھی بہمنی سلطنت کی ابتدا جس کا خاتمہ ڈیڑھ سو سال بعد بیدر میں محمود گاواں کے قتل کے بعد ہوا۔ ان کا طرز تعمیر اور ان کی تہذیب بیدر کی مسجدوں اور ان کے مدبر اور ذہین وزیر محمود گاواں کے مدرسوں اور عمارتوں سے ظاہر ہے ان کے گنبد نصف دائروں سے زیادہ بلند تھے۔ ان کے یہاں پتھروں کے گلدان بنانے کا بڑا دستور تھا۔ خلجی کے دور کی محرابوں کے مقابلوں میں انکی محرابیں زیادہ چوڑی تھیں۔ بہر کیف تغلق کے اقتدار کے زوال پر دکن مندرجہ ذیل ۴ ریاستوں میں بٹ گیا۔

۱۔ معبر کی اسلامی ریاست راس کماری سے دریائے کاویری تک۔
۲۔ وجے نگر کی ہندو ریاست دریائے کاوری سے کرشنا تک۔
۳۔ ورنگل کی ہندو ریاست دریائے کرشنا سے مسولی پٹم تک۔
۴۔ بہمنی سلطنت دریائے نربدا سے دریائے تنگ بھدرا تک اور دولت آباد سے بیدر تک۔

جغرافیائی اعتبار سے اگر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اب صرف خاندیس ہی کا وہ علاقہ باقی رہ گیا تھا جو تغلق حکمرانوں کے زیر اثر تھا۔ بالآخر اس نے بھی ۸۰۱ھ مطابق ۱۳۹۹ء میں اپنی آزادی کا اعلان کیا اور یہاں پر "فاروقی" سلاطین نے بڑی شان و شوکت کے ساتھ ہوتے دو سو برس تک حکومت کی (حوالے کے لیے ملاحظہ کریں تاریخ دکن مطبوعہ عہد آفریں پریس حیدر آباد دکن ص۹)

نصیر الدین فاروقی اس کا پہلا فرماں روا تھا جس کو برسر اقتدار آنے سے پہلے ہی حضرت برہان الدین غریب اور ان کے خلیفہ زین الدین داؤد شیرازی

سے بے پناہ عقیدت و محبت تھی۔ انھیں کے آستانوں کی جبہ سائی نے ان کو یہ عروج دیا۔ انھوں نے تاپتی کے کنارے برہان پور اور زین آباد کے شہر اپنے پیشواؤں کے نام پر آباد کیے۔ اور برہان پور کو اپنا پایہ تخت بنایا جو دیکھتے دیکھتے باغ و بہار شہر بن گیا۔ اور برہان الدین غریب کے سینکڑوں مریدوں نے اس کو اپنا مسکن بنالیا۔

یہی فاروقی سلاطین ہیں جنھوں نے خلد آباد اور دولت آباد کی درگاہیں تعمیر کیں انھیں کا طرز تعمیر منفرد تھا۔ انھوں نے ان پر زر کثیر خرچ کیا۔ انکی مضبوطی، استحکام اور پائیداری کا یہ عالم ہے کہ آج تک ان کے میناروں اور خانقاہوں کی کوئی اینٹ اپنی جگہ سے نہیں سرکی ہے۔ یہی نہیں بلکہ انھیں فاروقی سلاطین نے اطراف واکناف کے بے شمار گاؤں کی زرعی زمینوں اور باغات کی آمدنی ان درگاہوں کی مرمت اور دیکھ بھال کے لیے وقف کر دی۔

جس وقت دکن میں بہمنی سلطنت اور اس کی ہمعصر ریاستیں ایک نئی تہذیب اور نئی زبان کو جنم دے رہی تھیں۔ اس وقت شمالی ہند اور خصوصًا دہلی میں تیمور کے حملے شروع ہو چکے تھے۔ لودھیوں کی بغاوت تھی۔ غرض کہ ۱۳۸۸ء میں تیمور کے پہلے حملے سے لے کر ۱۶۰۰ء اکبر کے دور حکومت تک یعنی تقریبًا سوا دو سو برسوں تک دکن میں کوئی طالع آزما شمالی ہند سے نہیں آیا اور نہ کسی مورخ نے اس طویل عرصے کی تاریخ لکھنے پر اپنا وقت صرف کیا۔

ادھر جب ۱۴۸۲ء میں "بہمنی" سلطنت کا خاتمہ ہوا تو دکن میں پانچ چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئیں۔ یا یوں سمجھ لیجیے کہ بہمنی سلطنت کا ہر صوبہ ایک خود مختار ریاست بن گیا۔ جن کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ عماد شاہی برار (اس کو ۱۶۰۰ء میں اکبر اعظم نے ختم کیا۔)
۲۔ نظام شاہی احمد نگر (اس کی والی مشہور خاتون چاند بی بی تھیں جو ۱۶۰۰ء میں اکبر سے مقابلے میں ختم ہوئی۔

۳۔ قطب شاہی گولکنڈہ (اس کو عالم گیر نے فتح کیا۔
۴۔ برید شاہی بیدر (گولکنڈے میں ضم ہو گئی تھی۔
۵۔ عادل شاہی بیجاپور (۱۶۸۶ء میں عالمگیر نے ختم کی)

فاروقی سلاطین کی خاندیس پر حکمرانی دولت آباد خلد آباد اور خود کھڑکی (اورنگ آباد) کی درگاہوں کی تعمیر کے بعد اگر اس علاقے کی تعمیر اور تنظیم پر کوئی اور حکومت اثر انداز ہوئی ہے تو وہ نظام شاہی احمد نگر ہے۔ اس خاندان کے ایک فرمانروا مرتضےٰ نظام شاہ کا وزیر ملک عنبر حبشی تھا جس نے موجودہ اورنگ آباد (کھڑکی) کو بسایا۔ فوج کے قیام کے لیے چھاؤنیاں عہدہ داروں کے لیے کشادہ مکانات، سڑکیں اور باغ بنائے اور پورے شہر کو عجیب و غریب نظام آب رسانی سے سیراب کر گیا جس پر موجودہ دور کے انجینئر اب تک حیران ہیں۔ سنہ ۱۶۲۱ء میں اس پر شاہجہاں نے حملہ کیا۔ بستی تاراج ہو گئی لیکن ملک عنبر جو چاند سلطانہ کی موت کے بعد اپنی خود مختاری کا اعلان کر چکا تھا ہمت نہ ہارا۔ اور اس نے دوبارہ اس شہر کو اسی محنت اور کاوش سے تعمیر کر ڈالا۔ اس کی رعنائی اور دلکشی کا یہ عالم تھا کہ کشادہ صحن۔ ابلتے ہوئے حوض اور چھلکتے ہوئے فواروں سے کوئی معمولی گھر بھی خالی نہ تھا۔ اس کے انتقال کے بعد ۱۶۲۶ء میں اس کے بیٹے نے اس بستی کو اپنا پایہ تخت بنایا اور اس کا نام اپنے نام پر فتح نگر رکھا۔ جب بعد کو ۱۶۵۳ء میں اورنگ زیب نے اس علاقے کو فتح کیا تو اس بستی کا نام اپنے نام پر اورنگ آباد خجستہ بنیاد رکھا گویا۔ یہاں کی درگاہیں عمارتیں اور خواجگانِ چشت کے آستانے فاروقی سلاطین کے بعد ملک عنبر اور ملک عنبر کے بعد اورنگ زیب کے زیر اثر رہے اور ہر خاندان خراجِ عقیدت میں انکی آرائش و زیبائش کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اورنگ زیب خود حضرت زین الدین داؤد شیرازی خلیفہ حضرت برہان الدین غریب کے قدموں میں ابدی نیند سو گیا اور جب مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوا تو اس وقت دکن نے ایک بار پھر کروٹ بدلی۔ اس وقت نظام الملک آصف جاہ اول نے جن کے والد کا نام غازی الدین خاں تھا اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔ ان کو حضرت برہان الدین غریب سے

بے پناہ عقیدت تھی۔ حضرت نظام الدین مقبول الٰہی (جن کا مدفن اورنگ آباد میں ہے) کی دعاؤں سے جو چشتیہ سلسلے کے بہت بڑے بزرگ ہیں، ان کو دکن کی سلطنت ملی حالانکہ وہ خود نقشبندی سلسلے کے بیعت تھے۔ ان کا انتقال برہان پور میں ہوا اور اپنی وصیت کے مطابق ان کی میت کو خلد آباد لایا گیا وہاں سلطنت آصفیہ کا یہ بانی مبانی حضرت برہان الدین کے قدموں میں سو گیا۔ یہ حضرت نظام الدین مقبول الٰہی اورنگ آبادی ہی کا روحانی فیض تھا کہ اس خاندان نے دکن پر سوا دو سو برس تک حکومت کی اور اپنی اسلامی ریاست کو حضرت نظام الدین مقبول الٰہی کے نام سے موسوم کیا اور یہ سورج ستمبر ۴۸ء میں ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

ان تاریخی اور جغرافیائی تفصیلات کے بعد آیئے ہم ان بزرگان دین کے عجیب و غریب آستانوں اور ان کی حیات طیبہ کا جائزہ لیں جنھوں نے خلجی اور تغلق کے دولت آباد کو تصوف اور معرفت کے خزانوں سے مالا مال کر دیا۔ جنھوں نے خلد آباد کی پہاڑی بستی کو واقعی جنت ارضی بنا دیا۔ ان کے انتہائی حالات اور دکن میں انکی آمد کے متعلق اگر کوئی مستند کتاب دستیاب ہوتی ہے تو وہ مولانا آزاد بلگرامی کی روضۃ الاولیاء ہے جن کا ذکر میں کر چکی ہوں اور جن کا مزار ہیں اپنے پیر و مرشد کی درگاہ یعنی امیر حسن علاؤ الدین سنجری کے ساتھ ہے لیکن ان عمارتوں کی تاریخ اور طرز تعمیر کے بارے میں وہ بھی خاموش ہیں۔

دولت آباد اورنگ آباد کی بستی سے پندرہ میل دور پہاڑی پر واقع ہے اور اس کے بعد پانچ یا چھ میل کے فاصلے پر خلد آباد کی پہاڑیاں ہیں۔ خلد آباد کے گھاٹ کے پاس ایک آبپاشی درہ ہے جو مثلث یا تکون کی شکل میں ہے۔ دو طرفہ بلند پہاڑیاں ہیں اور تیسری طرف پتھر اور چونے سے مضبوط بند بنا کر پانی کو روکا گیا ہے۔ اس کے قرب و جوار میں آم اور شریفے کے بے شمار پیڑ ہیں۔ اور اورنگ آباد شہر کا پورا نظام آب رسانی اسی آب پاشی درے کا مرہون منت ہے جس کی نہریں ان بزرگوں کے فیض کی طرح اب تک جاری ہیں۔

مخدوم شاہ نظام الدین

دولت آباد اور خلد آباد کے درمیان جو سب سے زیادہ حسین اور پر فضا مقام ہے وہ کاغذی پورہ کہلاتا ہے۔ سڑک کے دونوں طرف سبزہ زار ہیں۔ داہنی طرف ایک کٹورا سا تالاب ہے جس کے کنارے ایک نہایت قدیم مسجد ہے جس کی تعمیر میں سیاہ پتھر استعمال ہوا ہے اور یہی اس کی مضبوطی کی دلیل ہے۔ اس کے ساتھ دو تین پتھروں کے بنے ہوئے حجرے ہیں۔ جہاں غالباً فقراء اور مساکین ٹھہرا کرتے تھے۔ اب یہ عمارت ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے گذر رہی ہے۔

چونکہ یہ علاقہ پانی کی بکثرت فراہمی اور پہاڑی آب و ہوا کی وجہ سے کاغذ کی صنعت کے لیے نہایت موزوں ہے اس لیے پرانے ردی کاغذوں کو سڑا کر یہاں جاذب اور کھردرا کاغذ بنایا جاتا تھا۔ اس لیے اس کا نام کاغذی پورہ پڑ گیا۔

سڑک کے بائیں جانب ایک چھوٹی سی درگاہ ہے جو حضرت مخدوم نظام الدین کی ہے جن کو عرف عام میں حاجی نظام الدین کہتے ہیں انکی بزرگی اور عظمت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ دہلی سے دکن آنے والے چودہ سو اولیاء کے قافلے میں سب سے معمر اور سن رسیدہ تھے۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکی ہوں کہ اس قافلے کا آخری پڑاؤ کاغذی پورہ تھا (یہ اس وقت اس نام سے نہ تو موسوم تھا اور نہ یہاں کوئی بستی تھی) حضرت زرزری زر بخش اس قافلے کے قافلہ سالار تھے لیکن انھوں نے بھی ان کو نماز میں اپنا امام بنایا اور چودہ سو اولیاء نے انکی امامت میں نمازیں ادا کیں۔

انکی کی درگاہ بڑی سادہ اور مختصر ہے۔ حجرے پر ایک گنبد ہے اور چہار دیواری کے مغرب میں ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ مسجد کے داہنی طرف ایک چھوٹا سا حوض ہے جو بہت بعد کی تعمیر ہے۔ مسجد کو بھی شکستہ حالت میں پاکر دوبارہ بنایا گیا ہے۔

جنوبی سمت سڑک سے ہٹ کر درگاہ کا اصلی پھاٹک اور دروازہ ہے جو حسب دستور دو منزلہ ہے اور اس کی چھت پر نقار خانہ بنا ہوا ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ چشتیہ سلسلے کی تمام درگاہوں کا نشان امتیاز بلکہ پہچان یہی ہے کہ ان کے صدر دروازے پر نقار خانہ ہوتا ہے جہاں نہ صرف وقت کے تعین کے، یہ نقارہ بجتا تھا بلکہ عرس وغیرہ کے موقع پر سماع کی محفل کے آغاز کا اعلان بھی اس سے کیا جاتا تھا۔

اس درگاہ کے علاوہ کاغذی پورے کے تالاب اور اس کے نواح میں سینکڑوں مزارات ہیں جو برہان الدین غریب کے اصحاب کے ہیں اور ان میں سے ہر ایک باعظمت ولی ہے۔ احاطے سے باہر مغرب کی طرف ایک کنواں ہے جس کو "حاجی رساں" صاحب نے تعمیر کروایا ہے اس پر ایک کتبہ نصب ہے جس کی تحریر یہ ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شیخ عبدالقادر جیلانی   اللہ

یہ قطبے ندا داد   ہاتف چناں

کہ شد چشمہ راز حاجی رساں

حاجی رساں خود دہلی سے دکن آکر آباد ہو گئے تھے خاندیش اور بمبئی کے اکثر لوگ ان کے مرید تھے ١٣١١ھ میں ان کا انتقال ہوا اور حضرت منتخب الدین زرزری زر بخش کے بیرونی احاطے میں موتی چوک کے چبوترے پر ان کا مزار ہے۔

حاجی مخدوم نظام الدین صاحب کا وصال پہلی ربیع الثانی ٧٧٢ھ مطابق ١٣٧٠ء میں ہوا۔ اسی تاریخ کو آپ کا عرس ہوتا ہے۔

حضرت خواجہ حسین و خواجہ عمر صاحب

بد نہ بولے زیر گردوں گر کوئی میری سنے

ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے

دولت آباد اور خلد آباد کے درمیان سڑک پر داہنی طرف یعنی مغرب کی سمت پہاڑیاں کچھ اس طرح ابھری ہوئی ہیں کہ ان میں آواز گونجتی ہے۔ سڑک کے ساتھ املی کے بے شمار پیڑ لگے ہیں اور جس مقام سے یہ آواز ٹکرا کر واپس آتی ہے وہاں ایک کتبہ لگا ہوا ہے جس پر مندرجہ بالا شعر لکھا ہوا ہے۔

انھیں پہاڑیوں کے دامن میں ایک نالا ہے اور اس کے بعد ایک چھوٹا سا تالاب ہے جس کو "پانگڑہ" کا تالاب کہتے ہیں۔ اس کے تین طرف پہاڑیاں ہیں اور چوتھی طرف پشتہ تعمیر کر کے پانی روکا گیا ہے۔

پہاڑ کے دامن میں جو دو "درگاہیں" ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت خواجہ حسین اور دوسری حضرت "خواجہ عمر" کی ہے جو دونوں سگے بھائی تھے۔ ان کے والد صاحب کا نام خواجہ محمود شیرازی تھا جن کا مزار وہیں شیراز میں ہے۔ دونوں بھائی صاحب ثروت اور امیر کبیر تھے لیکن بعد کو درویشی اختیار کی اور حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہی داستان حضرت مخدوم نظام الدین کے متعلق کہی جاتی تھی کہ وہ بھی بخارا کے حاکموں کے خاندان سے تھے لیکن انھوں نے بھی راہ خدا میں سلطنت چھوڑ دی تھی۔

ان دونوں بھائیوں میں سے خواجہ عمر صاحب لاولد فوت ہوئے اور حضرت خواجہ حسین سے ایک صاحب زادے زین الدین پیدا ہوئے چونکہ والدہ ماجدہ بچپن میں انتقال کر گئی تھیں۔ اس لیے باپ نے انتہائی شفقت سے آپکی پرورش کی۔ یہ وہی زین الدین شیرازی ہیں جو حضرت برہان الدین غریب کے خلیفہ ہیں (جن کا تفصیلی ذکر بعد میں آئے گا۔) اور جن کے قدموں میں اورنگ زیب عالمگیر مدفون ہے۔

ان دونوں بزرگوں یعنی خواجہ عمر اور خواجہ حسین کے مزارات نہایت سادہ اور پرکشش ہیں۔ درگاہ کے مغرب میں پہاڑی نالہ ہے جس میں جھرنے کا صاف شفاف پانی بہتا ہے۔ مشرق میں سڑک ہے اور شمال میں ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے جس کا نام "ہوڑہ" ہے اور اس کے دامن میں یہ درگاہیں برسات میں سبزہ زاروں کے اندر سچے موتیوں کی طرح دمکتی رہتی ہیں۔

اور درگاہوں کی طرح یہ درگاہیں بھی دوہرے احاطوں پر مشتمل ہیں جن کے اندر ان کے معتقدین کے مزارات ہیں اور درگاہ کے قریب جنوب میں ایک بہت بڑا میدان ہے جو یہاں کی عیدگاہ ہے۔ یہاں پر بیک وقت ہزاروں آدمی عیدین کی نماز ادا کر سکتے ہیں۔

حضرت مومنِ عارف باقی باللہ

دولت آباد سے خلد آباد جاتے وقت جو سبز پوش نیم دائری پہاڑیاں نظر آتی ہیں اس کے بیچ و بیچ ایک حسین سفید گنبد اور مسجد کے مینار پر جانے آنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اور اکثر دولت آباد کے زائرین خلد آباد جاتے ہوئے ادھر ضرور مڑ جاتے ہیں۔ یہ پرکشش اور پروقار درگاہ حضرت مومن عارف باقی باللہ کی ہے جن کا تعلق سہروردیہ سلسلے سے ہے اور جو علاؤالدین خلجی کے حملوں کے وقت یہاں تشریف لائے تھے۔ ان کا مزار محل وقوع اور بلند کرسی کے اعتبار سے منفرد ہے۔ پہاڑ کی تھوڑی سی چڑھائی تک پکا راستہ ہے۔ اس کے بعد املی کے گھنے اور شاداب پیڑوں کے درمیان وسیع میدان میں گاڑی پارک ہوتی ہے۔ بائیں ہاتھ جانے کے بعد داہنی طرف ایک بہت بڑا کنواں یا "باولی" ہے اور بائیں طرف مزار اقدس کا احاطہ ہے جو دوہرے چبوتروں یا دوہری کرسی پر بنا ہے۔ یعنی دس پندرہ فٹ تک کی بلندی پر سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ایک میدان ہے جو سبز پوش ٹیلوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس کے بائیں جانب ایک برآمدہ بنا ہوا ہے جس پر ٹین کی چھت ہے اور یہ تعمیر اسی صدی کے اوائل کی ہے تاکہ یہاں آنے والے زائرین دھوپ کی تپش اور بارش سے محفوظ رہ سکیں۔ دوسری طرف

حضرت مومن عارف صاحب کے بے شمار معتقدین کے مزارات ہیں اور سامنے پھر دس پندرہ فٹ بلند کرسی ہے جس کے زینے طے کرنے کے بعد اصل مزار کا احاطہ شروع ہوتا ہے جو کافی وسیع ہے اور فرش سیاہ پتھروں سے اس طرح بنا ہوا ہے کہ پہاڑ کی موسلا دھار بارش میں بھی یہاں بارش کا کوئی قطرہ نہیں رُکتا۔ صحن میں نالیوں کے ساتھ پرنالے لگا دیئے گئے ہیں جو دوسرے چبوترے پر دالان سے ہٹ کر پانی کو بہاتے ہیں۔ یہ پرنالے نہ مٹی کے ہیں نہ لوہے کے بلکہ صحن کے دیو پیکر پتھروں کی سلوں کے ساتھ تراش دیئے گئے ہیں جن کے ٹوٹنے پھوٹنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا۔ اس درگاہ کے ساتھ کوئی خانقاہ نہیں ہے۔ بائیں طرف ایک چھوٹی سی مسجد ہے جس کے مینار اور محراب اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ مغلیہ دور کے بعد کے ہیں اور یہی حال مزار مبارک کے گنبد کا ہے جو یقینی طور پر بہت بعد کو تعمیر ہوا ہے کیونکہ مشہور مؤرخ حضرت آزاد بلگرامی کے مطابق خلد آباد اور دولت آباد کی سرزمین پر سب سے پہلے تعمیر ہونے والا گنبد حضرت منتجب الدین زرزری زر بخش کا ہے۔ مسجد البتہ ضرور بنی ہوگی اور قیاس ہے کہ اس کو نظام کے عہد میں دوبارہ تعمیر کیا گیا ہے۔

مزار مبارک کے سامنے ایک بڑا سا گھنا سایہ دار پیڑ ہے جہاں زائرین سستاتے ہیں اور بائیں جانب یہاں کے مجاوروں اور نگراں کاروں کے کچے مکانات ہیں۔ درگاہ کی پشت پر چبوترے کا کٹاؤ ہے کہ برسات میں کوہساروں سے بہنے والی آبشاریں یہاں گرتی ہیں اور اس چبوترے کو نقصان پہنچائے بغیر داہیں بائیں سے طواف کرتی جھرنے بناتی گذر جاتی ہیں۔ برسات کے موسم میں پہاڑوں سے لے کر میدان تک تاحد نظر سبزہ نظر آتا ہے اور پہاڑوں کے درمیانی دامنوں میں آبشاریں اور ابلتے ہوئے چشمے گوٹا کناری ٹانکتے رہتے ہیں۔ اس پر اگر پہاڑوں پر ساون کے بادل چھا جائیں تو یہاں کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ موسلا دھار بارشوں کے بعد درگاہ کے سامنے بنی ہوئی چوکور 'بادل' کا پانی اوپر تک آجاتا ہے جو بیس ۲۰ فٹ لمبی اور ۲۰ فٹ چوڑی ہے۔ اس کے اندر اترنے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ درگاہ پکے فرش اور دوہرے چبوتروں کی تعمیر کے لیے پانی کی فراہمی

کے لیے ہی باولی کھودی گئی تھی۔ یہاں یہ بات اور بتادوں کہ دکن کا پورا علاقہ سطح مرتفع ہے اور وہاں بڑی گہری کھدائی کے بعد پانی ملتا ہے اور جو کنواں پہاڑوں کے دامن میں ہو اس کی گہرائی کا اندازہ مشکل ہے۔

حضرت مومن عارف صاحب کے مزار پر ہر وقت زائرین کا ہجوم رہتا تھا تقسیم ہند سے پہلے یہاں اکا دکا لوگ آیا کرتے تھے یعنی اب یہ جمعرات کو اورنگ آباد کے عقب شہر سے خصوصی بسیں چلائی جاتی ہیں تو صبح یہاں سے نکلتی ہیں دن بھر املی کے پیڑوں کے نیچے کھڑی رہتی ہیں اور عصر کے بعد زائرین کو لے کر شہر لوٹتی ہیں۔

حضرت مومن عارف صاحب کے حالات زندگی سنہ وفات اور دکن آمد کے بارے میں باوجود تلاش بسیار کے کوئی مستند کتاب نہیں ملی اور نہ ان کے مزار پر کوئی ایسا کتبہ یا تحریر نظر آئی جس سے صحیح طور پر ان کی تاریخ کا تعین ہو۔ البتہ جو کتابیں سقوط دکن سے پہلے اورنگ آباد میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کے کتب خانے یا حضرت مسافر شاہ کی درگاہ یعنی پن چکی ہے۔ کتب خانوں میں یعنی ان سے صرف ان دو باتوں کی توثیق ہوتی ہے کہ آپ یہاں خلجی کے عہد میں آئے اور آپ کا تعلق سہروردیہ سلسلے سے ہے۔

میں نے اپنے قیام کے دوران وہاں کے بہت سے کتب خانے دیکھے خصوصاً پن چکی کا کتب خانہ لیکن اسکی جو حالت زار ہے وہ بیان سے باہر ہے لیکن کوئی مستند کتابیں نہیں ملتیں۔ واقعہ یہ ہے کہ دکن کا سقوط، جامعہ عثمانیہ کی بربادی، اردو کتابوں کی تباہی پر اگر ہم خود غور کریں تو حیدرآباد دکن کا یہ المیہ غرناطہ اور بغداد کی تباہی سے کم نہیں ہے۔ جس میں نہ جانے کتنی انمول کتابیں برباد ہو کر رہ گئی ہیں۔

حضرت مومن عارف صاحب کی بارگاہ کے بارے میں یہ آنکھوں دیکھی بات ہے کہ ہر ہفتے جمعرات کی صبح فجر کے وقت یہاں ایک شیر ڈکارتا ہوا کچھار سے باہر آتا ہے اور اپنی دم سے صحن درگاہ کی جاروب کشی کر کے رخصت ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ بتا چکی ہوں کہ میرا بچپن اور لڑکپن انھیں کوچوں میں گذرا ہے۔ میں نے خود خلد آباد کے شاہی بنگلوں میں قیام کے دوران شیر کی آوازیں سنی ہیں۔ عمو خان مرحوم نے اس کو وہاں جاروب کشی کرتے دیکھا ہے۔ اسی لیے ان پہاڑیوں اور کچھاروں میں شیر کا شکار ممنوع ہے۔ مسلمانوں

کو تو چھوڑیے۔ اہل ہنود بھی یہاں تعظیم سے سر جھکا کر آتے ہیں اور کبھی یہاں شکار نہیں کھیلتے۔

حضرت پیر مردان الدین

حضرت مومن عارف صاحب باقی باللہ کے مزار کے شمال میں مغرب کی طرف بلندی پر پہاڑ کے دامن میں ان کا مزار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ نے اپنی زندگی اسی مقام پر ریاضت و عبادت میں گذار دی اور وہیں کی خاک میں سو رہے۔ ان کا مزار پتھر کے ایک مضبوط اور چوکور چبوترے پر ہے جس کے چاروں کونوں پر چار مضبوط ستون ہیں اور اس کے اوپر ایک چھوٹا سا قبہ بنا ہوا ہے۔ زائرین جب مومن عارف صاحب کی درگاہ آتے ہیں تو سو دو سو قدم کے فاصلے پر چڑھ کر اس مزار کی بھی زیارت کر لیتے ہیں۔

سیر السالکین میں لکھا ہے کہ آپ چودہ سو اولیاء کے بادشاہ امام اور عالم ربا ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اس قافلے کے ساتھ دولت آباد تشریف لائے ہوں جو حضرت زرزری زر بخش کے وصال کے بعد حضرت برہان الدین غریب کی قیادت میں یہاں آیا۔ دونوں قافلوں کی آمد کے درمیان سترہ برس کا فرق بتایا گیا ہے اور دونوں قافلوں کے متعلق یہی کہا جاتا ہے کہ ان میں سات سو پالکیوں میں چودہ سو اولیاء موجود تھے۔

حضرت پیر مردان الدین نے بچپن ہی میں کلام پاک حفظ کیا۔ تفسیر، فقہ اور حدیث کے علوم پر دسترس حاصل کرنے کے بعد آپ دہلی میں حضرت محبوب الٰہیؒ کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔ آپ نے ان کو مکمل طور پر "تزکیہ نفس" کی دولت سے مالا مال کیا اور مختلف نصیحتیں کیں جن میں عزلت نشینی، دفع دنیا اور خداوند قدوس کے حضور دعا و التجا کے آداب بھی شامل تھے۔ طبیعت نیک اور صالح تھی۔ اس لیے پیر و مرشد کی ہر نصیحت سینے میں اتار لی۔ یہی نہیں بلکہ تادم حیات اس پر صدق دل سے عمل پیرا رہے جیسا کہ صوفیائے کرام کا شعار ہے کہ رزق حلال اور صدق مقال درویشی کا پہلا زینہ ہے۔ حضرت مردان الدین نے اس پر عمل کیا۔ خود حافظ قرآن تھے۔ قرآن کے ایک

ایک حرف سے محبت تھی۔ اس لیے اس کی کتابت کو اپنا شعار بنا لیا۔ طبیعت کے اعتبار سے آپ بہت بردبار اور قانع تھے۔ قناعت اور تقویٰ آپ کی ظاہری زندگی کا زیور تھا۔ اکثر و بیشتر آپ کی ملاقات 'رجال الغیب' یا 'مردان غیب' سے ہوتی رہتی تھی اور اسی بناء پر غالباً لوگ آپ کو مردان الدین کہنے لگے تھے۔

حضرت محبوب الٰہی کی صحبت اور محبت کی بناء پر آپ کے تصرفات باطنی درجۂ کمال کو پہنچ چکے تھے۔ لیل و نہار یاد اللہ میں بسر کرتے رہتے۔ مجاہدات و عبادات کی بناء پر صاحب کشف و کرامات تھے۔

ایک مرتبہ آپ عزلت نشین تھے۔ آس پاس کوئی موجود نہ تھا۔ آپ کو اپنی عبادت اور ریاضت کے دوران سخت پیاس لگی۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک پیالہ پانی سے لبریز نمودار ہوا تاکہ اللہ کا بندہ اپنی پیاس بجھائے لیکن نہ جانے کیوں آپ نے یہ پانی نہیں پیا اور یہ کہہ کر پیالہ توڑ دیا کہ ہم کرامات کا پانی نہیں پئیں گے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ آپ نے اپنی عبادت میں ہر چیز محنت اور مشقت سے حاصل کی تھی کہ یہ بغیر کسی دقت کے مل گیا تھا۔ آپ نے اپنا یہ واقعہ اپنے پیرومرشد سے بیان کیا۔ انھوں نے نصیحت کی کہ اگر آئندہ ایسی صورتِ حال پیش آئے تو تم پانی پی لینا۔

جیسا کہ آپ کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا بچپن دہلی میں گذرا۔ حضرت شرف الدین بوعلی قلندر آپ کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ بچپن ہی میں آپ یتیم ہو گیے۔ اور آپکی پرورش آپ کے چچا نے کی۔

ظاہر ہے کہ آپ کے آخری ایّام ہجرت کے بعد دولت آباد میں گذرے۔ آپ نے یہیں پر سنہ ۷۳۶ھ میں وصال فرمایا۔ (حوالے کے لیے دیکھئے سیر السالکین)

حضرت مردان الدین کے بعد

سنہ ۱۹۸۲ء کی بات ہے جب میں پورے ۲۳ برس بعد اورنگ آباد گئی تو ایک دن

اپنے آبا و اجداد کی روایات کے مطابق دولت آباد اور خلد آباد کے مزارات پر حاضری دینے پہنچی۔ جس وقت میں حضرت مومن عارف صاحب کے مزار پر پہنچی تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہاں عرس ہو رہا تھا اور اتنا مجمع تھا کہ خدا کی پناہ۔ ایک ہجوم تھا جو حضرت مردان الدین کے مزار کی طرف جا رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہاں ایک اور درویش کہیں سے گھومتے پھرتے آ گیے تھے۔ کسی روحانی اشارے کی بنا پر انھوں نے وہیں اپنا مصلّےٰ بچھا دیا اور اسی قبے کے اندر عبادت و ریاضت میں مصروف ہو گیے۔ بہت کم وہاں سے نکلتے اور بستی کے لوگوں نے ان کو بہت کم آبادی میں دیکھا تھا۔ انھوں نے ایک پنجرے میں ایک پرندہ پال رکھا تھا۔ اس لیے لوگ ان کو پنجرے والے بابا کہتے تھے۔ ان کے معتقد بہت تھے۔ ان ہی میں سے چند دولت آباد کی بستی سے آتے اور انکے لیے ایک گھڑے میں پانی، کچھ روٹیاں اور ساگ فراہم کر دیتے۔ جس دن میں وہاں پہنچی ہوں۔ وہ ان کے پہلے عرس کا دن تھا۔ اورنگ آباد ٹائمز کے مطابق اپنی موت سے ایک دن پہلے انہوں نے اپنے ان عقیدت مندوں سے جو شام کو انہیں روٹی پانی پہنچاتے تھے کہا کہ:

میں نے اس پنچھی کو آزاد کر دیا ہے۔ دوسرا پنچھی صبح تک آزاد ہو جائے گا!

لوگوں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو انکے محبوب پرندے کا پنجرہ خالی تھا۔ اس کے بعد انھوں نے ارشاد فرمایا کہ کل سے میرے لیے کھانے پینے کی زحمت نہ کرنا۔ اس کے بعد وہ خاموش ہو گیے۔ ان کی مجذوبانہ باتیں بڑی بامعنی تھیں۔ دوسرے دن صبح جب لوگ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ان کا وصال ہو چکا ہے۔ یعنی دوسرا پنچھی بھی آزاد ہو چکا ہے اور ایک سانپ انکی لاش کے قریب بیٹھا پہرہ دے رہا ہے۔

لوگوں کا بیان ہے کہ انکی موت سانپ کے ڈسنے سے واقع ہوئی ہے۔ واللہ عالم بالصواب۔ بہرکیف ان کو وہیں غسل دیا گیا اور وہیں حضرت مردان الدین کے قریب ان کو دفن کر دیا گیا۔

میں جس وقت وہاں پہونچی تو لنگر تقسیم ہو رہا تھا۔ چونکہ میں کھانے کے معاملے میں ذرا محتاط واقع ہوئی ہوں۔ اس لیے میں اس کو چکھا تک نہیں بلکہ واپس کر دیا۔ اور کہا کہ

اس وقت پیٹ بھرا ہوا ہے پھر کبھی چکھ لوں گی۔ ظاہر ہے دوبارہ نہ مجھے اورنگ آباد جانے کی توقع تھی اور نہ ان کے عرس میں جانے کا کوئی ارادہ تھا۔ لیکن اس حسن اتفاق کو کیا کہیے کہ انہیں اولیاء کے خلد آباد کی کشش مجھے ۸۳ء میں دوبارہ اورنگ آباد لے آئی اور میں بغیر کسی خاص پروگرام کے جب مزارات پر حاضری دینے پہونچی تو سب سے پہلے حضرت مومن عارف صاحب کے آستانے گئی۔ وہاں وہی رونق اور چہل پہل تھی۔ یہ پنجرے والے بابا کا دوسرا عرس تھا۔ میں حیران رہ گئی۔ دامن کوہسار میں وہیں جاکر بیٹھ گئی جہاں ایک سال پہلے جاکر بیٹھی تھی۔ لنگر کا کھانا پھر میرے سامنے آیا اور میں نے سر جھکا کر کھا لیا۔

حضرت جلال الدین گنج رواں

حضرت جلال الدین گنج رواں کا مزار مبارک خلد آباد کی اصلی بستی سے تھوڑی دور کے فاصلے پر ہے۔ احاطہ پختہ اینٹوں کا ہے۔ مزار وسیع اور کشادہ صحن ہے جس کے داہنی جانب پرانے زمانے کی خانقاہوں کا سلسلہ ہے جو مضبوط ستونوں پر کھڑی ہیں۔ ان کی چھتیں مدور ہیں اور ان میں اتنی گنجائش ہے کہ بیک وقت سینکڑوں آدمی قیام کریں۔ خانقاہ سے باہر ایک پکا فرش ہے جہاں کسی سادھو نے بیٹھ کر ریاضت کی تھی اور بعد کو مسلمان ہو گیا تھا۔ حضرت گنج رواں کا مزار اس خانقاہ کے بعد ایک اونچی کرسی پر بنا ہوا ہے۔ جس کے گرد ایک مضبوط چار دیواری ہے اور مزار کے بائیں یعنی جنوب کی سمت جو ایک دالان سا بنا ہوا ہے اس میں تین یا چار قدیم طرز کے جھروکے ہیں جن سے جنگل کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک وسیع اور پختہ تالاب ہے جس کے پانی سے گذر کر سرد ہوا کے جھونکے اس دالان اور قبرستان تک آتے ہیں اور یہ تالاب جو بہت بڑا ہے۔ عوام الناس میں پریوں کا تالاب کہلاتا ہے

حضرت گنج رواں صاحب کا پورا نام شاہ جلال خرقانی ہے کیونکہ آپ کا تعلق

خرقان سے تھا۔ لقب گنج رواں ہے آپ کے پیر و مرشد حضرت شیخ احمد علوی تھے جو حضرت شہاب الدین سہروردی کے مقرب مریدوں میں سے تھے۔ مورخین وثوق کے ساتھ لکھتے ہیں کہ آپ خلد آباد شریف میں چشتیہ سلسلے کے بزرگوں کی آمد سے بہت پہلے تشریف لائے اور تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کا سلسلہ جاری کیا۔ جس کا بین ثبوت آپکی خانقاہ ہے جو بہت زیادہ بڑی نہیں ہے لیکن موجودہ دور میں بھی گرمی میں دھوپ اور بارش میں پانی سے زائرین کو بچاتی رہتی ہے۔

حضرت گنج رواں صاحب کے مزار سے ملحق دو چیزیں بڑی عجیب و غریب ہیں ایک تو وہ گہرا اور وسیع تالاب کہلاتا ہے اور جس کے دور دور تک سبزہ زار اور سبز پوش پہاڑیاں ہیں اور ایک وہ درخت جو مزار مبارک کے حجرے کے سرہانے لگا ہوا ہے۔

پریوں کے تالاب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پہلے اس کا نام "رتن سمندر" تھا جب آپ نے اس پہاڑی علاقے کو عزت بخشی تو اہل ہنود کے عقیدے کے مطابق ایک انتہائی سرکش دیو یا عفریت یہاں موجود تھی جس کو آپ نے پکڑ کر ایک گڑھے میں ڈال دیا اور ایک بڑا سا پتھر اس پر رکھ دیا۔ یہ چوکور اور وزنی پتھر اب بھی وہاں موجود ہے۔ تالاب کے متعلق عوام الناس کا عقیدہ ہے کہ اگر یہاں پر کوئی عورت یا لڑکی اشنان کرتی ہے تو اس پر پریوں کا سایہ ہو جاتا ہے لیکن کسی آسیب زدہ عورت یا لڑکی کو اس کے پانی سے گھر پر نہلایا جائے تو وہ صحت یاب ہو جاتی ہے۔

میں نے درگاہ کی تعمیر، تالاب کے محل وقوع کو بڑے غور سے دیکھا اور اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ حجرہ کے سامنے جو چھوٹا سا دالان ہے اس میں ہوا کی آمد و رفت کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اس لیے مجبوراً جھروکے تالاب کے رخ ہیں۔ صبح کے وقت اگر عورتیں تالاب پر اشنان کریں اور سجادگان درگاہ یا عقیدت مند لوگ اس دالان میں بیٹھ کر صبح کی تلاوت یا عبادت کریں تو ان جھروکوں کی وجہ سے بے شمار فتنے اٹھ سکتے ہیں اس لیے ان کی روک تھام کے لیے یہ من گھڑت روایتیں پھیلائی گئی ہیں۔

اور جہاں تک آسیب زدگان کی صحت یابی کا سوال ہے تو اس میں کچھ تو خلد آباد کی بہشتی آب و ہوا پہاڑی چشموں کی تاثیر شامل ہے۔ دوسرے حضرت کے فیض سے کوئی انکار کر سکتا ہے جن کا لقب ہی "گنج رواں" ہے۔

مزار کے سرہانے جو درخت ہے وہ واقعی عجیب و غریب ہے اور نباتات میں ایم ایس سی کی ڈگریاں رکھنے کے باوجود میں آج تک اس درخت کی ماہیت پوری طرح نہیں سمجھ سکی۔ صرف اتنا بتا سکتی ہوں کہ یہ شریفے کے پیڑ کی طرح ہے اور اس کا پھل بھی پختہ ہو کر سوکھا ہوا شریفہ لگتا ہے۔ یہ درخت یہاں صدیوں سے کھڑا ہوا ہے۔ اور میں نے بہت سے لوگوں کو یہاں صرف اس لیے آتے دیکھا کہ وہ اولاد سے محروم تھے وہ یہاں آتے ہیں حضرت گنج رواں صاحب کے توسط سے خداوند قدوس کی بارگاہ میں سر جھکاتے ہیں پھر بصد عقیدت یہ پھل لے جاتے ہیں۔ ایک دن کے روزے کے بعد اس پھل سے افطار کرتے ہیں اور خدا اُنکی گود بھر دیتا ہے۔

جب تک یہاں کے مجاوروں اور سجادہ نشینوں میں خلوص تھا، یہ فیض جاری و ساری تھا لیکن جب سے ان پھلوں کی تجارت ہونے لگی۔ ان کی برکت کم ہو گئی۔ اس درخت اور اس کے عجیب و غریب پھل کے متعلق مولانا آزاد بلگرامی لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک "مخنث" نے ازراہِ مذاق یہ پھل کھا لیا کہ میرے یہاں بھی بیٹا پیدا ہو جائے قدرت کو یہ مذاق ناگوار گذرا۔ کچھ عرصہ خیریت سے گذر گیا۔ اس کے بعد اس مخنث کے پیٹ میں شدید درد اٹھا اور عمل جراحی کے بعد ایک چھوٹا سا بالشت بھر کا بچہ اس کے پیٹ سے نکالا گیا۔ وہ بچہ تو خیر کیا زندہ رہتا وہ مخنث بھی اسی عمل جراحی کے بعد ختم ہو گیا۔ دونوں کے مزار حضرت گنج رواں صاحب کے حجرے کے باہر سیاہ پتھروں کے قبرستان میں موجود ہیں۔ "فاعتبروا یا اولی الابصار"۔

اندرونی احاطے میں مسجد سے متصل حضرت گنج رواں صاحب کے بھانجے شیخ احمد اور شیخ محمود کے مزارات ہیں اور باہر کی سمت مشرقی دیوار سے ملحق ایک اور مزار ہے جو آپ کے دودھ پالک بیٹے 'پیر ترابی' کا ہے۔

اس کے علاوہ آپ کے بہت سے رفقاء اسی احاطے میں آسودہ خاک ہیں جن میں سید نصر اللہ، سید احمد، سید کبیر قابل ذکر ہیں اور اس سے ذرا سا ہٹ کر آپ کے خدامان کے مزارات ہیں جو نسل در نسل یہاں جاروب کشی کرتے آئے ہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ یہاں کے مزارات پر کسی نے کوئی کتبہ لگانے کی زحمت نہیں کی ہے جو مجاور یہاں صدیوں سے آباد ہیں وہی سینہ بسینہ یہاں کے حالات اپنی ذریت کو بتاتے چلے آئے ہیں۔ آپ کی تاریخ وفات ۲۶ ذی قعدہ سنہ ۶۴۴ھ ہے۔

حضرت مومن عارف باقی اللہ کی درگاہ کی طرح یہاں بھی زائرین کا تانتا بندھا رہتا ہے جن کو یہاں نہ صرف سر چھپا کر بیٹھنے بلکہ خانقاہ میں رہنے اور کھانا پکانے کی بھی سہولت حاصل ہے۔ یہاں چاروں طرف سکون ہی سکون برستا ہے اور میں جب بھی یہاں زیارت کے لیے گئی ہوں میں نے ایک آدھ خاندان کو یہاں ضرور قیام پذیر پایا ہے۔

حضرت شاہ خاکسار صاحب

آپ کا لقب مقبول الاخیار ہے۔ آپ کا مزار مبارک حضرت گنج رواں صاحب کے مزار سے شمال مغرب کی جانب ڈیڑھ یا دو میل کے فاصلے پر پہاڑی کے دامن میں واقع ہوا ہے۔ جس کے سامنے ایک نہایت وسیع اور خوشنما پختہ پشتوں سے بنا ہوا ایک تالاب ہے جس کی نہر دور دور تک بستی کو سیراب کرتی ہے بلکہ اسکی ایک شاخ اورنگ آباد تک پہنچتی تھی۔ پہاڑوں کے دامن میں بنا ہوا یہ مقبرہ بیحد حسین ہے اور اس کو زیادہ عرصہ نہیں گذرا بلکہ اس کی تعمیر نظام الملک آصف جاہ اول کے دور کی ہے۔ اس کے دونوں طرف عمدہ قسم کے پھلوں اور سبزیوں کے باغ ہیں۔ انکے گنبدوں اور مسجدوں کے محرابوں پر مغلیہ دور کی گہری چھاپ ہے۔ ان کے گنبد سے ملا ہوا مشرق کی طرف آپ کے بھانجے عبدالحلیم صاحب کا مزار ہے اور اس سے ذرا سا ہٹ کر ایک چوکور اور مضبوط چبوترے پر شاہ عبدالملک صاحب کا مزار ہے۔ مسجد اور خانقاہ بھی موجود ہے جو اب بوسیدہ ہو چکی ہے۔

مقبول الاخیار حضرت خاکسار صاحب کا تعلق خاندان مساوات سے ہے اور ارادت کا سلسلہ حضرت سید عبدالقادر جیلانی سے ملتا ہے۔ آپ کے پیرومرشد شاہ متاب تھے۔

حضرت خاکسار صاحب اپنے دور کے بہت بڑے مجذوب بزرگ تھے۔ عالم جذب میں ان کو دنیا و مافیہا کی بہت کم خبر ہوتی لیکن خلقت کا ہجوم آپکو گھیرے رہتا۔ جب ہوش میں آتے لوگ آپ سے عقیدت کا اظہار کرتے۔ منہ سے جو نکل جاتا مشیت الٰہی سے پورا ہو جاتا۔

آپ نے اپنے وصال سے پہلے اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کو وصیت کی تھی کہ جب آپکی روح نفس عنصری سے پرواز کر جائے تو آپکو بغیر غسل دیئے ہوئے دفن کر دیا جائے۔ ان کی یہ وصیت بڑی عجیب و غریب تھی تاہم مریدوں کو انکار کی تاب نہ تھی۔ ادھر اورنگ آباد اور خلد آباد کا سب علاقہ اورنگ زیب عالمگیر جیسے شریعت پرست بادشاہ کے زیر نگیں تھا۔ یہی نہیں بلکہ وہ بنفس نفیس اورنگ آباد میں مقیم تھا۔ اس کی بازپرس کا بھی خوف تھا حالانکہ خاکسار اپنی زندگی ہی میں فرما چکے تھے "موتو قبل ان تموتو۔" وہ اپنی موت سے قبل ہی عشق اللہ میں کشتہ ہو چکے تھے۔

خاک پیش از آنکہ خاک شوی

ان کا ظاہر باطن سب اللہ کی راہ میں خاک ہو چکا تھا۔ اسی کشمکش اور تذبذب میں آپ کے مریدوں میں سے کسی نے مشورہ دیا کہ آپ کے جسم مبارک میں سے پیر یا ہاتھ کی انگلی پر پانی ڈال کر دیکھا جائے تو شاید حضرت کی وصیت کی وجہ معلوم ہو سکے چنانچہ ایک تجویز پر فوری عمل کیا گیا اور جس انگلی پر پانی ڈالا گیا وہ راکھ کی طرح پانی لگتے ہی بہہ گئی۔ جس کے بعد ان کے جسد خاکی کو غسل کے بغیر سپرد خاک کر دیا گیا۔

آپ کے حالات زندگی پوری طرح دستیاب نہیں ہو سکے البتہ اتنا معلوم ہوا ہے کہ آپ کے ایک خلیفہ رکن الدین تھے جو گلبرگہ (کرناٹک) میں رہے وہیں ان کا وصال ہوا اور وہیں مدفون ہیں۔

شیخ بہاؤالدین انصاری

دولت آباد سے خلد آباد جاتے وقت راستے میں جو دو نمایاں درگاہیں پڑتی ہیں ان میں سے ایک حضرت مومن عارف باقی باللہ کی ہے اور دوسری درگاہ جو سڑک سے دکھائی دیتی ہے وہ حضرت شیخ بہاؤالدین انصاری کی ہے۔ شارع خلد آباد سے سو قدم کے فاصلے پر اگر اندر کی طرف مڑ جائیں تو ایک نیم پختہ راستہ ملتا ہے جس کے دونوں طرف سبزہ زار ہیں جن کی بہاریں برسات میں قابل دید ہوتی ہیں اور پھر ایک بڑا سا سنگین یعنی پتھر کا بنا ہوا پھاٹک ملتا ہے جس کے بعد انکی درگاہ کا بیرونی احاطہ شروع ہوتا ہے جس میں پھاٹک سے متصل پانچ چھ دروں والی ایک مضبوط خانقاہ ہے جو دوہرے دالان پر مشتمل ہے۔ یہ مغرب کی سمت میں ہے۔ اور اس سے زاویہ قائمہ بناتی ہوئی جنوب سیاہ پتھر کی ایک ٹوٹی پھوٹی خانقاہ کے کھنڈر ہیں اور اس احاطے میں بھی کچھ مزارات ہیں۔ بیرونی احاطے کے اندر جو پھاٹک سے متصل خانقاہ ہے وہاں مجاور اور درگاہ کے نگراں رہتے ہیں۔ اس کے درمیان ایک خوبصورت سا حوض ہے جس میں ایک خوشنما فوارہ ہے (غالباً ملک عنبر کا بنایا ہوا ہے کیونکہ یہ ذوق اسی کا ہے) اسی حوض کے کنارے کنارے پھولدار درخت ہیں اور درگاہ کے اندرونی احاطے میں جانے کے لیے پھاٹک سے متصل جو کچا صحن ہے وہاں موتیا اور بیلے کے بے شمار پودے ہیں جن کی مہک سے نہ صرف زائرین کی روح تازہ ہوتی ہے بلکہ اہل دل ان آسودگان خاک پر رشک کرتے ہیں جن کے نصیب میں اس کے قرب و جوار کی زمین ہے۔ حوض کے بعد چند سیڑھیاں چڑھ کر اصل درگاہ کا مختصر احاطہ ہے جس کا فرش "شاہ آبادی پتھروں" کا ہے (یہ سرخی اور سفید رنگ کا وہ پتھر ہے جو دکن کے علاقہ شاہ آباد میں قدرتی طور پر بکثرت پایا جاتا ہے۔ جنوبی ہند کے اکثر ریلوے پلیٹ فارم اسی کے بنے ہوئے ہیں) اس فرش سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بعد کو یعنی آصف جاہی دور میں بنا ہے۔ مسجد کے آب

اور خانقاہوں کا طرز بالکل قدیم ہے۔

صحن درگاہ میں دو گنبد ہیں ایک حضرت بہاؤالدین انصاری کا دوسرا نصیرالدین جن کے حالات زندگی نہیں ملتے۔

شیخ بہاؤالدین انصاری ابراہیم بن عطاء اللہ انصاری قادری جیسے عظیم بزرگوں کی اولاد میں سے ہیں وطن "قصبہ جُنَید" ہے۔ سلطان غیاث الدین کے دور میں آپ نے اپنی زندگی مندو کے مقام پر درس و تدریس میں گذار دی اور اس کے بعد اپنے پیرو مرشد کے حکم پر دکن کا سفر اختیار کیا۔ یہاں آکر بیدر میں سکونت اختیار کی جو بہمنی سلطنت کا دارالخلافہ تھا۔ آپ کا سلسلہ ارادت قادریہ شطاریہ ہے۔ آپ نے کئی رسالے تصنیف کیے جن میں وظائف اور اوراد درج ہیں لیکن افسوس ہے کہ اب یہ رسالے ناپید ہیں۔ آپ زندگی بھر ذکر الٰہی میں مصروف رہے جس کی بنا پر آپکی روح اتنی لطیف ہو گئی تھی کہ خوشبو سونگھتے وقت آپ پر عالم ذوق و شوق میں وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی اور یہی لگتا جیسے روح پرواز کر جائے گی چنانچہ عالم ضعف و پیری میں آپ کا ایک مرید اتفاق سے "مشک" آپکی خدمت میں بطور نذرانہ لایا اور اس کی مہک سے آپکی روح قفس عنصری سے ۱۹ صفر ۹۲۱ھ مطابق ۱۵۱۵ء کو پرواز کر گئی۔ آپ نے اپنے خلفا میں دو اصحاب چھوڑے ایک شیخ محمد ملتانی اور مولانا علیم الدین جن کے مزارات کے متعلق کوئی علم نہیں ہے۔

حضرت امیر حسن علاء سنجری

حضرت امیر حسن علا سنجر کا مزار خلد آباد کے جنوبی گوشے میں ہے۔ وہاں پہنچنے کے لیے کچا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اکثر و بیشتر برسات کے موسم میں اس کو پہاڑی ناکہ بند کر دیتا ہے لیکن عقیدت مند کند ذہن اور غبی طالب علموں کو لے کر ان کے مزار اقدس تک پہنچ ہی جاتے ہیں تاکہ آپکے قبر کے تعویز پر شکر بکھیر کر

ان کو چٹائی جائے اور یوں ان کا حافظہ تیز اور ذہن رسا ہو جائے۔

خلد آباد میں آپکی درگاہ جتنی مختصر ہے اتنی ہی خوبصورت ہے اور بارش کے بعد تو وہاں کا فرش اور دیواریں اور زیادہ نکھر جاتا ہے۔ آپ کی درگاہ اور مسجد کی تعمیر اور زیبائش کا کام ہندو پاک کے مشہور مورخ مولانا آزاد بلگرامی نے اپنی نگرانی میں کروایا تھا۔ اور فرط عقیدت میں خود بھی انکے قدموں میں ابدی نیند سو گیے۔

حضرت امیر حسن علاء سنجری کا رتبہ خواجگان چشت میں یوں سب سے زیادہ نمایاں ہے کہ آپ حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء کے محبوب مرید تھے اور ایک روایت کے مطابق حضرت امیر خسرو کے خالہ زاد یا ماموں زاد بھائی بھی تھے۔ آپ کو اپنے پیر و مرشد سے والہانہ عقیدت تھی جس کی بنا پر یہ اکثر و بیشتر وقت انھیں کے ساتھ گذارتے وہ اپنی زبان مبارک سے جو کچھ فرماتے حرف بہ حرف موتیوں کی طرح ان کو جمع کرتے اور تاریخ وار ترتیب دیتے رہتے۔ حضرت محبوب الٰہی کے ملفوظات، معمولات، وظائف، دعاؤں کے طریقے، نفل، نمازیں، عارفانہ باتیں اور درویشانہ اوصاف آپ ہی نے اپنی کتاب "فوائد الفواد" میں جمع کر دیئے ہیں۔ ان کی مادری زبان فارسی تھی لہذا اصل کتاب بھی فارسی ہی میں ہے جس کا ترجمہ کئی بار اُردو زبان میں شائع ہو چکا ہے اور آج بھی دستیاب ہے۔ اگر اس کتاب کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اس سے نہ صرف "بزرگان چشتیہ" کے مسلک پر روشنی پڑتی ہے بلکہ یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ان صوفیائے کرام میں جن کی بہترین نمائندہ حضرت محبوب الٰہی کی ذات بابرکات ہے کتنی وسیع القلبی اور فراخدلی موجود تھی۔ خصوصاً غیر مسلموں اور اہل ہندو ان کے سادھوؤں اور رشیوں کے ساتھ ان کا حسن اخلاق آج کی تنگ نظر اور تعصب پرست دنیا میں مشعل راہ ہے۔ ان کے مسلک میں اتنی وسیع النظری ہے کہ وہ ہر شخص کو اپنے دامن میں پناہ دینے کے لیے تیار ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان کا مسلک سادہ اور رنگین ہے جہاں بذلہ سنجی بھی ہے۔ سماع بھی ہے۔ شعر و شاعری بھی ہے۔ ادب لطیف بھی ہے۔ غیر قوموں کے لیے اس مسلک میں بڑی دلآویزی اور کشش ہے۔ کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ خواجگان چشتیہ ہی وہ بزرگ

ہیں۔" زہد و طاعت کو خشک اور بنجر زمین سے نکال کر ایک باغ و بہار وادی میں لے آئے ہیں جس کی کشش ہر شخص کا دامن اپنی طرف کھینچتی ہے۔

حضرت امیر حسن سنجری شروع ہی سے شعر و ادب کے پرستار تھے۔ خود بھی شعر کہتے تھے اور دوسروں کے اشعار کی دل کھول کر داد دیتے تھے۔ شروع میں رند مشرب آزاد منش انسان تھے۔ لیکن حضرت محبوب الٰہی کی بارگاہ میں رسائی تھی۔ بے تکلفانہ طور پر اپنے اشعار سناتے رہتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی حضرت برہان الدین غریب کے ہمراہ حضرت بختیار کاکی سے ملاقات کر کے واپس آ رہے تھے۔ راستے میں حوض شمسی پڑتا ہے (یہ وہ مشہور و معروف حوض ہے جس کو سلطان شمس الدین التمش نے کثیر رقم خرچ کر کے تعمیر کروایا تھا۔ اس کا صاف اور شیریں پانی لاکھوں افراد کی پیاس بجھاتا تھا اور اسی کی فیض رسانی کے عوض حضرت بختیار کاکی نے ان کو مغفرت کی بشارت دی تھی۔)

حوض شمسی کے کنارے سرد ہوا کے جھونکوں اور خنک لہروں کے تموج میں حضرت نظام الدین محبوب الٰہی نے دیکھا کہ امیر حسن اپنے احباب کے ساتھ 'ناؤ نوش اور ہاؤ ہو' میں مصروف ہیں۔ جونہی حضرت محبوب الٰہی کو دیکھا دل میں کچھ ندامت کے آثار پیدا ہوئے۔ اپنی جھینپ مٹانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور آپ کے روبرو فی البدیہہ یہ شعر پڑھا۔

سالہا باشد کہ باہم صحبتیم
گر ز صحبت ہا اثر بودے کجاست؟

(میں آپ کے ساتھ برسوں آپ کی صحبت میں رہا ہوں اگر واقعی کوئی صحبت کا اثر ہوتا ہے تو کہاں ہے؟)

زہد تو فسق از دل ما کم نہ کرد
فسق ماہاں بہتر از زہد شماست

(تمہارے زہد نے میرے دل سے فسق و فجور کے اثرات کو کم نہ کیا تو کیا میرا رنگ تمہارے رنگ سے بہتر نہیں ہے۔)

امیر حسن کے ان اشعار میں شوخی کے ساتھ ساتھ زہد پر طنز بھی تھا۔ چھیڑ چھاڑ بھی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو ناراض ہو جاتا لیکن یوں ناراض ہونے والا کچھ اور ہوتا۔ محبوب الٰہی نہ ہوتا چنانچہ آپ نے نظر بھر کر امیر حسن کو دیکھا۔ زیر لب تبسم فرمایا اور بڑی فلسفیانہ بات کہی کہ "محبت کا اثر حسن نیت سے ہوتا ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد وہ وقت آئے گا جب صحبت اپنا اثر دکھائے گی۔"

یہ الفاظ کسی عام آدمی کے منہ سے نہیں نکلے تھے بلکہ اس بندہ محترم و مقرب کی زبان سے نکلے تھے جن کے لیے قبولیت مقدم ہو چکی تھی۔ ادھر آپ نے حسن کو نظر بھر کر دیکھا ادھر ان کی دنیا بدل گئی۔ برہنہ سر آپ کے قدموں پر گر پڑے۔ نہ صرف آپ کے دست حق پرست پر بیعت کی بلکہ ایسی توبہ کی کہ ساری زندگی پیر و مرشد کے لیے وقف کر دی۔ اس وقت حضرت امیر حسن کی عمر پچاس سال کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اپنی توجہ اور حلقہ ارادت میں شامل ہونے کے موقع پر بھی طبیعت نچلی نہ بیٹھی فرمایا۔

اے حسن 'توجہ' آں گہے کردی
کہ ترا قوت گناہ نماند

(اے حسن تو نے توبہ بھی کی تو اس وقت جب تم میں گناہ کرنے کی سکت نہ رہی) اس واقعہ کے بعد دن رات پیر و مرشد کی صحبت میں رہنے لگے اور شعر و شاعری کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔

ملک الشعراء فیضی کا قول ہے کہ امیر حسن کے اشعار میں جو آن اور جو ادا ہے اس پر ہر ایک کو عاشق ہونا چاہیئے۔ حضرت محبوب الٰہی جب سماع کا شوق ہوتا تو ارشاد فرماتے کہ امیر حسن کے اشعار پڑھو۔

حضرت امیر حسن کے والد کا نام نجم الدین سنجری تھا جنھوں نے سیستان سے دہلی تک ہجرت کی تھی اور حضرت امیر حسن کی پیدائش دہلی ہی کی ہے۔ آپ نے اپنی آخری

عمر میں دہلی کی بربادی اور دارالخلافہ کی زبردستی منتقلی کے وقت رخت سفر باندھا اور دوسرے یا تیسرے قافلے کے ساتھ 'دولت آباد' تشریف لائے اور اسی پُرفضا مقام پر قیام کیا جہاں ان کا مدفن ہے۔

آپ اپنے دور کے انتہائی ذہین اور طباع شاعر تھے۔ اہل ذوق سماع یعنی قوالی میں اپنے عارفانہ کلام پر عش عش کرتے تھے۔ چونکہ دہلی سے ہجرت کر کے آنے والے اولیاءؒ کے قافلوں میں آپ ہی مقبول اور مشہور شاعر تھے۔ اس لیے دکن اور دولت آباد کے لوگوں نے آپ کو 'حسن شاعر' کہنا شروع کر دیا جو بعد کو کثرت استعمال کی وجہ سے 'حسن شیر' بن گیا۔

شیخ عبدالصمد ابن افضل محمد، جو شیخ ابوالفضل اور فیضی کے بھانجے ہیں۔ اپنے اخبار الاصفیا میں تحریر کرتے ہیں کہ حضرت میر حسن علاء سنجر نے سنہ ۷۳۷ھ سنہ ۱۳۳۶ء میں وفات پائی۔ آپ کے پائنتی حضرت آزاد بلگرامی کا مزار ہے اور اس کے علاوہ جانب شمال حضرت بابا فرید گنج شکر کی دختر نیک اختر حضرت بی بی عائشہ ابدی نیند سو رہی ہیں ان کے قدموں کے پاس چار مزارات اور ہیں جن میں ایک بی بی لطیفہ کا اور دوسرا بی بی حنیفہ کا، تیسرا بی بی فاطمہ اور چوتھا بی بی ہاجرہ کا ہے۔ ان چاروں خواتین کے حالات زندگی کا کوئی علم نہیں ہے۔ البتہ حضرت بی بی عائشہ بنت بابا فرید گنج شکر کے جو حالات ہم کو ملے ہیں وہ آگے درج کر رہے ہیں۔

حضرت بی بی عائشہ دختر بابا فرید گنج شکر

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ بزرگان دین کی نگاہِ کرم اور محبت و ہم نشینی نے نہ جانے کتنے ذروں کو آفتاب کی تابانی بخش دی۔ عمر بھر بھٹکتے رہنے والوں نے جب کسی مرشد کامل کے دست حق پرست پر بیعت کی تو اپنی سچی توبہ اور گناہوں کی ندامت خاکساری اور انکساری کی بنا پر سب سے آگے نکل گئے۔ ان حالات میں غور کیجیے کہ ان لوگوں کا کردار، عمل اور شخصیت کیسی ہو گی جنھوں نے آغوش معرفت میں پرورش پائی ہو، زہد و تقدس کی پاکیزہ فضاؤں میں آنکھ کھولی ہو اور شروع ہی سے صدق و صفا جن کی گھٹی میں پڑا ہو۔ تذکرے نیک طبیعت، ولی صفت اور پاک باز خواتین کے ذکر سے خالی نہیں ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان پردہ نشین خواتین کے حالات زندگی بھی ان کے چہروں کی طرح زیر نقاب رہے اور کسی واقع نگار نے ان کے اوصاف حمیدہ پر قلم اٹھانے کی زحمت نہیں کی۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان خواتین سے کوئی کرامت یا فرق عادت بات رونما نہیں ہوئی لیکن ان کے لیے یہ شرف اور اعزاز کیا کم ہے کہ ہر صاحب کرامت ولی کامل اور ہر صاحب اعجاز نبی اور صاحب کتاب پیغمبر نے انھیں کی کوکھ سے جنم لیا انھیں کا دودھ پیا اور انھیں کی آغوش تربیت میں پروان چڑھ کر اعلیٰ مدارج تک پہنچے۔

حضرت بی بی عائشہ نے اپنے والد کے سائے میں ملتان میں پرورش پائی پھر دہلی آگئیں اور وہاں سے دکن ہجرت کی۔

جن دنوں یہ دہلی میں مقیم تھیں اور دکن ہجرت نہیں کی تھی اس دور کا واقعہ ہے کہ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی نے اپنے مرید خاص حضرت برہان الدین غریب کو اس خدمت پر معمور کیا کہ وہ حضرت محبوب الٰہی کے پیر و مرشد یعنی بابا فرید گنج شکر کی صاحب زادی کے مکان پر ہر ہفتہ بعد نماز جمعہ حاضری دیں اور ان کے چھوٹے موٹے کام انجام

دیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت ان کے شوہر حیات نہیں ہونگے البتہ ان کی ایک کم عمر صاحبزادی گھر میں موجود تھیں جو حسن صورت کے ساتھ ساتھ حسن سیرت سے بھی مالا مال تھیں۔ یہ والدہ کی تربیت تھی یا نانا کا فیض محبت کہ آپ صائم الدہر اور قائم اللیل تھیں۔ عبادت و ریاضت اور تلاوت قرآن مجید میں آپ کا جواب نہ تھا۔ لباس نہایت سادہ ستر پوش اور سیاہ رنگ کا زیب تن فرماتی تھیں۔

ایک دن جب حضرت برہان الدین غریب بعد نماز جمعہ حضرت بی بی عائشہ کی خدمت میں گئے تو انکی نظر دفعتاً آپکی دختر پہ پڑگئی۔ آپ نے ان کو نہایت ادب سے سلام کیا اور بے اختیار زیر لب مسکرائے۔ ظاہر ہے کہ آپکی یہ غیر ارادی حرکت حضرت بی بی عائشہ سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ آپ نے دونوں پر ایک نظر ڈالی اور پھر حضرت برہان الدین غریب کی طرف دیکھا اور کہا' اے برہان الدین تو میری لڑکی کو دیکھ کر کیوں مسکرایا؟ اس فقرے کو سن کر حضرت برہان الدین غریب کا رنگ فق ہوگیا۔ جسم خوف سے بید کی طرح کانپنے لگا۔ ہاتھ جوڑ کر انتہائی عاجزی سے عرض کیا۔

اے خاتون محترم! میرے پیرومرشد (حضرت محبوب الٰہی) آپ کی بارگاہ (بابا فرید گنج شکر) کے غلام ہیں اور میں انکے کمترین غلاموں میں سے ہوں۔ مجھ میں یہ تاب، یہ مجال اور طاقت کہاں کہ مخدوم زادی کو دیکھ کر مسکرا سکوں اگر آپ مجھے اپنی صفائی کا موقع دیں تو عرض کروں گا کہ میرے سلام اور تبسم زیر لب کی وجہ یہ تھی کہ میں نے آپکی دختر نیک اختر کی مقدس پیشانی پر ایک ولی کامل اور بزرگ عارف کا نور دیکھا جو درخشاں اور تابندہ ہے۔ اس کے احترام نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں سلام عقیدت پیش کروں۔

اس جواب پر حضرت بی بی عائشہ حیران رہ گئیں۔ کیونکہ ان کی صاحبزادی نے عہد کر لیا تھا کہ وہ ساری زندگی خدا کی عبادت اور ریاضت میں بسر کریں گی اور شادی اور گھر بار کی ذمہ داری قبول نہیں کریں گی۔ ادھر دونوں ماں بیٹی یعنی حضرت بی بی عائشہ اور انکی صاحب زادی حضرت برہان الدین غریب کے مرتبے سے بھی واقف تھیں۔ یہ شبہ بھی نہیں کر سکتی تھیں کہ انکی بات غلط ہوگی۔ اس لیے دونوں ماں بیٹی نے باہم مشورہ کرکے

استخارہ کیا اور خداوند قدوس سے رہبری طلب کی جس کے بعد بیٹی نے اپنی والدہ حضرت بی بی عائشہ کو بتایا کہ ایک صحیح النسب درویش ہیئت کذائی کے ساتھ یہاں آئیگا اس سے میرا عقد ہوگا۔

چنانچہ چند دنوں بعد سید ضیاء الدین درویش یہاں تشریف لائے اور حضرت بی بی عائشہ نے اپنی دختر کا نکاح ان سے کر دیا کیونکہ اللہ کی مرضی اور مشیت یہی تھی۔ تین دن تک سید ضیاء الدین درویش وہیں مقیم رہے۔ اس کے بعد انھوں نے فرمایا کہ یہ زندگی خدا کی عبادت میں خلل انداز ہے۔ اس لیے میں روانگی کی اجازت چاہتا ہوں اور بیک وقت یہی بات حضرت عائشہ کی دختر نیک اختر نے بھی کہی کہ تین دن سے ذکر الٰہی کا ورد اور میرے دیگر وظائف قضا ہو رہے ہیں۔ اس لیے مجھے پھر یاد خدا میں وقت گذارنے کی اجازت دیدیں۔

غرض کہ تین دن کے مختصر ترین عرصے میں یہ دونوں مقرب بندے ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔ البتہ سید ضیاء الدین صاحب مجذوب نے بیوی اور خوش دامن سے جدا ہوتے وقت یہ اعلان کر دیا کہ میرے جانے کے بعد میرے یہاں ایک فرزند ارجمند تولد ہوگا جو نہ صرف پیدائشی ولی ہوگا بلکہ جب تک قرآن مجید حفظ نہ کرلے شکم مادر سے گلشن دنیا میں قدم نہیں رکھے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی ولادت میں قرآن مجید حفظ کرنے کی وجہ سے تاخیر ہو جائے۔ اس وقت میری باعصمت اور باعفت بیوی پر کوئی انگشت نمائی نہ کرے۔ یہی وہ نور ولایت تھا جس کو حضرت برہان الدین غریب نے آپ کی پیشانی مبارک پر تابندہ دیکھا تھا چنانچہ آپ نے اپنی روانگی کے وقت اپنے ہونے والے فرزند کے نام کا اعلان بھی کر دیا اور فرمایا کہ اس بچے کا نام علاؤالدین ہوگا۔

چنانچہ سینہ بسینہ آنے والی روایات کے مطابق آپ پورا قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد ڈیڑھ یا پونے دو برس بعد اس دنیا میں تشریف لائے۔ آپ سے علم شریعت اور طریقت کی ترویج ہوئی۔ آپ کا مزار نواح جالنہ میں ایک بستی رونا پرڑا میں ہے۔

آپ کا مزار باتی کے اندر ہے جس پر سے پانی کی لہریں گذرتی رہتی ہیں۔ نہ کوئی احاطہ

ہے نہ کوئی گنبد نہ چہار دیواری نہ مسجد۔ صرف مور کے پروں کا ایک مورچھل اور ایک عود دان پاس رکھا ہے جن کو لہریں بہا کر ایک سرے سے دوسرے سرے تک لے جاتی ہیں اور پھر بصد ادب اسی مقام پہ پہنچا دیتی ہیں مزار کی سیدھ میں دریا کے کنارے ایک برگد کا پیڑ ہے جس کے سائے میں عقیدت مند اور زائرین آرام کرتے ہیں۔ مرادیں پوری ہونے کے بعد یہیں بکرے ذبح ہوتے ہیں۔ حلوے مانڈے بنتے ہیں اور عورتیں عقیدت میں برگد کی جٹاؤں پہ لال اور نیلے کلاوے باندھ کر منت مان لیتی ہیں۔

حضرت خواجہ منتخب الدین زرزری زر بخش

کاغذی پورہ، دولت آباد اور خلد آباد کے اطراف کی پر فضا درگاہوں اور اور وہاں کے آسودگان خاک کی زیارت کے بعد جب ہم خلد آباد کی اصل بستی میں داخل ہوتے ہیں تو سب سے بڑی سڑک پر دو سربلند درگاہیں نظر آتی ہیں جو زمین سے پندرہ سولہ فٹ کی بلندی پر ہیں جن پر چڑھنے کے لیے دور تک ڈھلان ملتا ہے۔ یہ دونوں درگاہیں بالکل ایک دوسرے کے مقابل ہیں نقشہ بھی ملتا جلتا ہے اور پہلی نظر میں کوئی نہیں پہچان سکتا کہ ان میں حضرت برہان الدین غریب کی بارگاہ کونسی ہے اور انکے خلیفہ حضرت زین الدین شیرازی کی درگاہ کونسی ہے۔

شمال کی طرف جانے والی اس شارع پر مغرب کی سمت حضرت برہان الدین صاحب کا مزار ہے اور مشرق کی پہاڑی پر انکے خلیفہ زین الدین کا۔ ان دونوں درگاہوں کو چھوڑتے ہوئے اگر ہم اسی سڑک پر آگے نکل جائیں تو یہ سیدھی سڑک ایک مقام پر مغرب کی طرف گھوم جاتی ہے۔ جہاں ایک شاندار کمان یا دروازہ ہے جو حضرت زرزری زر بخش کے احاطے کی حد بندی کرتی ہے جو عرس کے ہجوم اور دوکانوں کے انتظام کے لیے بہت ضروری ہے۔

آپ حضرت برہان الدین غریب کے چھوٹے بھائی تھے لیکن میں ان کا ذکر ان کے

بڑے بھائی کے ذکر اور حالات زندگی سے پہلے اس لیے کر رہی ہوں کہ سرزمین دکن پر قدم رکھنے والے آپ پہلے بزرگ ہیں جن کا تعلق چشتیہ نظامیہ سلسلے سے ہے۔

ان کی درگاہ کو لوگ "روضہ" کہتے ہیں کیونکہ بقول مولانا آزاد بلگرامی اس پورے علاقے میں یہ پہلا مزار ہے جس پر گنبد تعمیر ہوا اور اسی وجہ سے خلد آباد کا پہلا نام روضہ تھا۔

حضرت زرزری زر بخش کا روضہ یا درگاہ جس قدر وسیع اور عریض ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ عرس کے موقع پر یہاں اچھا خاصہ شہر آباد ہو جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے فاروقی سلاطین نے اس کی تعمیر میں اپنی ساری عقیدت اور محبت کے ساتھ بے پناہ دولت صرف کی۔ وہاں اس کے ارادت مند درباریوں یا معماروں نے اپنا سارا فن بصد خلوص اس پر نچھاور کر دیا۔ جس کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ عمارت صدیوں پرانی ہوگی۔ اس کے دبدبے اور استحکام کا یہ عالم ہے کہ ایک اینٹ یا پتھر بھی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوا ہے۔ بنانے والوں نے اس میں "سمٹری" یعنی سوال جواب کا بہت خیال رکھا ہے۔

کمان سے اندر داخل ہوتے ہی ایک بہت بڑا سرسبز و شاداب میدان ہے جس کے درمیان میں درگاہ کے صدر دروازے یا پھاٹک کے بالکل سامنے ایک لالمبا سا چبوترہ ہے جو یہاں پر موتی چوک کے نام سے منسوب ہے اور حاجی رساں صاحب کا مزار اس کے ایک کنارے پر ہے۔ چبوترے کے بعد صدر دروازے کے بلند و بام پھاٹک پر چڑھنے کے لیے زینے بنے ہوئے ہیں کیونکہ یہ درگاہ بھی دوہری کرسی پر بنی ہوئی ہے۔ پہلا چبوترہ دس سے بارہ فٹ تک بلند ہے کیونکہ اس کے نیچے سطح زمین کے ساتھ دو رویہ خانقاہیں ہیں اور چبوترے کے بعد دوسری منزل پر انہیں کی چھت پر خانقاہوں کی دوسری منزل ہے۔ دروازہ بہت بڑا اور دوہرا ہے۔ اسکی چھت پر نہایت خوبصورت گنبد اور ہیں جن تک پہنچنے کے لیے پھاٹک کے اندر سے راستے ہیں اور اوپر کا حصہ نقار خانہ یا نوبت خانہ ہے۔ جہاں بیس پچیس آدمی معہ نقاروں کے بآسانی بیٹھ سکتے ہیں پھاٹک

کے بعد پھر داہنے اور بائیں طرف خانقاہیں ہیں اور تقریباً دو یا تین سو فٹ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اصل درگاہ کی سیڑھیاں شروع ہوتی ہیں۔ جو دس یا بارہ ہیں چونکہ یہ درگاہ قبلہ رخ بنی ہوئی ہے لہٰذا دوسرے چبوترے کے زینے چڑھتے ہیں۔ ایک طویل مسجد شروع ہوجاتی ہے جس کے درمیان کی محراب کو چاک کر کے درگاہ کے اندر جانے کا راستہ بنایا ہے۔ اصطلاح میں اس کو 'درچاک' کہتے ہیں۔ نمازی درچاک کے دائیں اور بائیں سکون کے ساتھ نماز پڑھتے رہتے ہیں اور زائرین درچاک سے اپنی آمد و رفت جاری رکھتے ہیں۔ ایسے ہی درچاک شمال اور جنوب کے گوشوں میں بھی ہیں۔

اندر جانے کے فوراً بعد روضہ یعنی حجرہ اور گنبد ہے۔ صحن زیادہ وسیع نہیں ہے۔ مغرب کی طرف ایک چھوٹی سی مسجد ہے اور جنوب کی طرف ایک دالان ہے جس کے شرقی اور غربی حصوں میں ایک ایک حجرہ ہے۔ گنبد خاص کے سامنے اس دالان کے سامنے اس دالان کے ستون پر یہ عبارت کندہ ہے۔

یا اللہ المحمود فی کل افعال یا اللہ

(کہا جاتا ہے کہ حضرت خواجہ منتجب الدین اس کلمہ کو بکثرت پڑھا کرتے تھے)

اس دالان میں پتھر کے چھوٹے چھوٹے جھولے یا آویزے ہیں جن پر ناد علی کندہ ہے۔ اس مختصر سے احاطے میں ایک گنبد حضرت خواجہ کا ہے جس کے اندر دو مزار ہیں اور دوسرے گنبد میں جو مسجد کے قریب ہے آپکی والدہ ماجدہ حضرت بی بی ہاجرہ اور آپکے سگے ماموں حضرت سراج الدین آرام فرما رہے ہیں اور مغربی دیوار سے ملی ہوئی ایک اور قبر ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں آپکو غسل دیا گیا تھا۔ آپ کے قدموں کے پاس ایک چھوٹا سا چنبیلی کا پیڑ ہے جہاں 'سونا بائی' دفن ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

درچاک کے جنوبی حصے میں جیسے کہ میں بتا چکی ہوں دو منزلیں ہیں۔ نیچے اتر کر انتہائی جنوب میں دولت شاہ درباری اور ان کے بھائیوں کے مزارات ہیں اور اس کے بعد ایک سرخ پتھر کی خوبصورت بارہ دری ہے جہاں گنگا بائی کا مزار ہے جس میں پانی کی رسد کے لیے ایک خوبصورت حوض ہے اور اطراف میں حضرت کے اصحاب، خدام اور دیگر

ارادت مند دفن ہیں۔ درچاک کے شمال میں جب ہم نیچے اترتے ہیں تو وہاں ناہموار پگڈنڈیاں ہیں کچھ عمارتیں ہیں اور ایک بہت بڑی باولی جس میں پانی بھرا رہتا ہے۔

صدر دروازے کے سامنے موتی چوک کے اردگرد اب تک موتیوں کی طرح بکھرے شکستہ "اک درے" "قبّے" مزاروں کے چبوترے، سہ دریاں ہیں جن میں سب کے اوپر کسی زمانے میں گنبد موجود تھے۔ ان میں سب سے بڑا گنبد بحری نظام شاہ کا ہے (نظام شاہی احمد نگر یہ وہ ریاست ہے جو بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد بنی) اور اسی کے دوسرے سرداروں نے ازراہِ عقیدت حضرت منتخب الدین کے قدموں میں دفن ہونا پسند کیا تھا۔ عرس کے موقع پر اب ان کے چبوترے دوکانوں کے طور پر اور قبّے 'سائے' کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔

عجائبات

یوں تو حضرت زر زری زر بخش صاحب کا اس دور میں یہاں آنا اور اسلام کی روشنی پھیلانا ہی اس عہد میں بڑا عجیب سا لگتا ہے اور اس سے زیادہ محبت اور حیرت انگیز اس پوری عمارت کی تعمیر ہے لیکن ان دونوں باتوں سے ہٹ کر دو چیزیں یہاں نہایت عجیب ہیں ایک تو پتھر کے وہ جھولے اور زنجیریں ہیں جو جنوبی دالان میں آویزاں ہیں اور دوسرے آپ کے حجرے کی چوکھٹ ہے۔

زنجیریں نہ لوہے کی ہیں اور کسی اور دھات کی ہیں بلکہ ان کو پتھر کے ایک پتلے اور لانبے ٹکڑے تراش کر بنایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ لوہے سے بھی زیادہ مضبوط ہے۔ اور اس کی ایک ایک کڑی یوں ہی لچکتی اور گھومتی ہے جیسے لوہے کی زنجیروں میں ہوتی ہے ان کی کسی کڑی میں کوئی جوڑ یا ٹانکا نہیں ہے۔ اس لیے مضبوطی اور پائیداری میں یہ اپنا جواب آپ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں میں یہ فن اپنے عروج پر تھا کیونکہ اکثر مقامات پر دروازے انکی کنڈیاں، چولیں، قلابے اور دروازہ بند کرنے والی زنجیر بھی پتھر سے تراشی ہوئی ہے۔

دوسری عجیب چیز جیسا کہ میں بتا چکی ہوں حجرے کی چوکھٹ ہے جو سیاہ رنگ کے سخت پتھر کی ہے یہ غالباً سنگ سیلو یا سنگ موسیٰ ہے۔ دروازے کی اس چوکھٹ

کے سامنے بھی مضبوط پتھر کی دو چار سلیں سامنے نصب ہیں جو آج تک اپنی جگہ سے نہیں ہلی ہیں۔ سنگ سیلو یا سنگ موسی کی اس سیاہ چوکھٹ پر نظر پڑتے ہی آپ دیکھیں گے کہ اس میں بے شمار سونے کی کیلیں ہیں۔ سنگ ستارا، عقیق، یشب موتی اور فیروزے کے بڑے بڑے ٹکڑے جڑے ہوئے ہیں۔ یہی حال حضرت برہان الدین اولیاء کی چوکھٹ کا ہے اور یہی نقشہ حضرت زین الدین شیرازی کے آستانے کا ہے۔

سوال یہ ہے کہ پتھر کے اندر پتھر کیسے جڑے گئے ہیں اگر ان قیمتی پتھروں اور موتیوں کو سلاطین نے یہاں لگوایا ہے تو اس میں ان کے ذوق کے مطابق کوئی ترتیب ہوتی، کوئی گلکاری یا ڈیزائن ہوتا لیکن یہ بالکل بے ترتیب ہیں اور اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ صدیوں بعد بھی ان کے کسی طرف سے ہلنے کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ میں نے یہاں گھنٹوں گذارے ہیں اور ہفتوں اس مسئلہ پر غور کیا ہے کہ زائرین کی جبہ سائی اور آستاں بوسی سے یہ سونے کی کیلیں یہ عقیق کے ٹکڑے، فیروزے کے ذرے گھس کر چپٹے ہو گئے ہیں لیکن اب تک ہلے نہیں ہیں اور نہ اس غیر آباد مقام پر کسی نے ان کو حرا کرلے جانے کا خیال کیا۔

اپنی حیرت کو رفع کرنے کے لیے میں نے وہاں کے معمر اور پرانے مجاوروں سے پوچھا کہ آخر ان قیمتی پتھروں کو یہاں کیونکر نصب کیا گیا ہے؟ تو انھوں نے بتایا کہ یہ چوکھٹیں سیاہ اور سادہ تھیں۔ سنا ہے کہ قدیم زمانے میں جو درویش، فقیر اور صوفی یہاں آتے تھے ان کے پاس اس آستانے پر نذر کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی قیمتی پتھر ضرور ہوتا۔ وہ اکثر راتیں ان کے دروازوں کے سامنے عبادت اور مجاہدوں میں گذارتے اور ان سے روحانی فیض حاصل کرتے جیسا کہ انھوں نے اپنے آباؤ اجداد سے سنا ہے۔ یہ درویش اور صوفی پورے جوش و خروش کے ساتھ یا اللہ یا علی کا نعرہ لگاتے اور اس قیمتی پتھر کو اتنی زور سے مارتے کہ وہ سنگ موسی کی چوکھٹ کا سینہ چیر کر اس میں فٹ ہو جاتا۔

ان کے منہ سے یہ بات سن کر میں حیران رہ گئی۔ چونکہ میری سمجھ میں ان پتھروں کے جڑنے کی کوئی اور ترکیب نہیں آرہی ہے اور نہ ان کی مضبوطی کی کوئی توجیہہ ہے اور نہ ہی کوئی اس کی خاطر خواہ وضاحت کر سکا۔ اس لیے فی الوقت میں بھی اسی بات پر یقین کیے لیتی ہوں کہ

یہ عقیق، موتی، یشب اور سونے کی کیلیں کسی درویش صفت مرد مومن کی "ضرب کلیمی" سے جڑی گئی ہیں۔

محیر العقل واقعات کا جہاں تک تعلق ہے اس میں سنی سنائی باتیں زیادہ ہیں، البتہ اس بارگاہ کا ایک واقعہ میرے اور میرے گھرانے کے سامنے گذرا ہے۔ وہ یہ ہے کہ غالباً ۱۹۳۵ء یا ۳۶ء کی بات ہے کہ میری بڑی بہن کی شادی تھی۔ اقارب اور عزیز لکھنو، بارہ بنکی سے آئے ہوئے تھے دو تین ہفتے تک اچھی خاصی چہل پہل تھی۔ اس دوران عمی جان نے ان سب کو بڑی سی گاڑی میں بٹھایا اور دولت آباد اور خلد آباد کے مزاروں کی زیارت کے لیے چل پڑیں۔

یہ لوگ جب حضرت منتخب الدین زرزری زر بخش کے مزار پر پہنچے تو ان میں سے ایک خاتون کو جو رشتے میں میری چچی ہوتی تھیں زرزری زر بخش کے الفاظ بار بار دہرانا شروع کیے اور پھر از راہ مذاق ہنس کر بولیں کر کیا ان کے دربار سے سب کو سونا ملتا ہے؟ ہمیں سونا ملے تو جانیں اور اس کے بعد وہ میری والدہ کے پاس کھڑی ہو کر ہنسنے لگیں۔ اللہ ہی بہتر جانے کہ ان کے دل میں کیا کیا خیالات آئے اور کیوں آئے۔ بہرکیف عمی جان جو ان کی بزرگ تھیں، ان کو تنبیہہ کی اور فاتحہ خوانی کے لیے چوکھٹ کے سامنے لا کھڑا کیا۔ انھوں نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے اور جب ہاتھوں کو منہ پہ پھیرا تو "چھن" سے آواز آئی۔ ہم لوگ سب اس آواز پر متوجہ ہوئے۔ ان کے سامنے سونے کی ایک چھوٹی سی گول پتری پڑی ہوئی تھی۔ جس کو انھوں نے فوراً اٹھایا۔ ہم سب نے ہاتھ میں لے کر دیکھا پھر کیا تھا وہ اسی چوکھٹ کے پاس بیٹھ کر زار زار رونے لگیں۔ یہ آنسو سچی عقیدت کے تھے۔ زرزری زر بخش نے ان کو زر بخش دیا۔ انھوں نے وہ سونا سنبھال کر رکھا۔ اور وہ دونوں تا دم مرگ کسی کے محتاج نہ ہوئے۔

اگر یہ واقعہ میرا چشم دیدہ نہ ہوتا اور اب تک میرے گھر والوں کو یاد نہ ہوتا تو میں ضبط تحریر میں نہ لاتی۔

حالات زندگی حضرت منتخب الدین زرزری زربخش

حضرت خواجہ منتخب الدین زر زری زربخش حضرت خواجہ برہان الدین غریب کے سگے بھائی تھے اور عمر میں ان سے گیارہ برس چھوٹے تھے۔ آپ کے والد صاحب حضرت محمود ہانسوی بن جو حضرت جمال ہانسوی کے سگے بھائی ہیں۔ یہ وہی جمال ہانسوی ہیں جن کے نام نامی سے چشتیہ خاندان میں 'جمالی' سلسلہ چلا۔ دونوں بھائی حضرت بابا فرید گنج شکر سے بیعت تھے۔ انھیں سے متعلق بابا فرید نے حضرت ذکریا ملتانی سے فرمایا تھا کہ جمال میرا جمال ہے اور جمال ناقابل تقسیم ہے۔ ان کے مرتبے کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جب بابا فرید نے حضرت صابر صاحب کو دہلی کی خلافت دی تھی تو یہی کہا تھا کہ دہلی جاکر پہلے "جمال ہانسوی" سے میرے فرمان پر 'مہر تصدیق' ثبت کروالینا۔ آپ جب دہلی پہنچے تو وہاں طوفان باد و باراں تھے۔ شمع بار بار بجھ رہی تھی۔ حضرت صابر صاحب کو مہر لگانے میں جلدی تھی اور حضرت جمال ہانسوی فرمارہے تھے کہ اتنی جلدی کیا ہے، یہ کام صبح کو بھی ہوسکتا ہے لیکن جب حضرت صابر نے ضد کی تو آپ نے شمع منگوائی۔ اپنے پیر کے فرمان پر مہر لگانا چاہتے تھے۔ شمع بجھ گئی۔ حضرت جمال الدین ہانسوی نے اس کو مشیت الٰہی سمجھ کر ہاتھ روک لیے اور کہا صبح کی روشنی میں 'میں مہر لگا دوں گا' لیکن حضرت صابر کو تاب کہاں۔ انھوں نے جلال میں آکر پھونک ماری اور شمع جل اٹھی۔ حضرت جمال ہانسوی نے ان کو غور سے دیکھا اور کہا میاں صابر دہلی دارالخلافہ ہے۔ وہ تمھاری پھونک نہیں برداشت کر سکے گی۔ یہ کہہ کر انھوں نے اپنے پیر کا فرمان چاک کر دیا۔ (جمال الدین ہانسوی کا مطلب یہ تھا کہ دہلی کی ولایت میں جمال کا کام ہے جلال کا نہیں کیونکہ وہ بادشاہوں کی بستی ہے۔ وہاں کے اونچ نیچ برداشت کرنے والے کو وہاں کی ولایت ملنا چاہیئے) ان کی یہ بات سن کر حضرت کو جلال آگیا۔

طیش میں آکر کہا آپ نے اپنے پیر کا فرمان چاک کیا اور میں نے آپ کا سلسلہ چاک کر دیا (مطلب یہ ہے کہ آپ کی نسل سے کوئی اولاد نہیں ہوگی) ظاہر ہے کہ اس کے بعد حضرت جمال ہانسوی کے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ دوسرے دن دونوں افسردہ پژمردہ بابا فرید کے پاس پہنچے۔ حضرت جمال نے قدموں پر گر معافی چاہی اس وقت بابا فرید نے صابر صاحب کو 'کلیر' کی ولایت دی اور جمال ہانسوی سے فرمایا کہ "صابر کا چاک کیا ہوا سلسلہ نہ تو میں جوڑ سکتا ہوں اور نہ سی سکتا ہوں لیکن اس کے یعنی 'صابریہ سلسلے' کے کسی بزرگ کی دعا سے تمہارے یہاں اولاد ہوگی۔

چنانچہ یہی ہوا کہ صابریہ سلسلے کے ایک بزرگ حضرت شیخ جلال کبیر الاولیاء پانی پتی تشریف لائے اور حضرت جمال ہانسوی نے جب ان کی خاطر تواضع کی اور اپنا سلسلہ چاک کرنے کا واقعہ بتایا تو انھوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے جو اللہ کے دربار میں قبول ہوئی اور جمال الدین ہانسوی کے یہاں ایک فرزند پیدا ہوا جس کا نام نورالدین رکھا گیا۔ حضرت جمال ہانسوی اس کو لے کر فوراً "نظام الدین محبوب الٰہی کی خدمت میں گئے۔ آپ نے اس ششماہے بچے کو اپنا مرید کیا اور خلعت سے نوازا۔ یہی وجہ ہے کہ سلسلہ بیعت کے شجرے میں حضرت محبوب الٰہی کے نام کے بعد فوراً "نورالدین صاحب" کا نام لکھا جاتا ہے (حوالے کے لیے ملاحظہ کیجیے تذکرہ خواجگان چشت صفحہ ۲۱٦ مطبوعہ نفیس اکیڈمی)

اس واقعہ کا تفصیلی ذکر میں نے یہاں اس لیے کیا ہے کہ اکثر تذکرہ نویس اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ حضرت برہان الدین غریب اور منتخب الدین زرزری زربخش دونوں حضرت جمال ہانسوی کے صاحبزادے ہیں جو بالکل غلط ہے۔ یہ دونوں بھائی حضرت محمود ہانسوی کے بیٹے ہیں جن کی والدہ محترمہ کا نام بی بی ہاجرہ تھا۔ (جن کے مزار کا میں ذکر کر چکی ہوں کہ وہ اسی احاطے میں ہے) حضرت برہان الدین غریب اور حضرت منتخب الدین زرزری زربخش کی ولایت کے ساتھ شجرہ نسب مندرجہ ذیل ہے (حوالے کے لیے ملاحظہ فرمایئے روضۃ الاولیاء المعروف نفحات الاصفیا مؤلف مولانا غلام علی آزاد

بلگرامی کا اردو ترجمہ مطبوعہ ۱۳۴۷ھ ہجری م ۱۹۲۸ء صفحہ ۷)

شیخ برہان الدین غریب و منتخب الدین بن شیخ محمد محمود بن ناصر ہانسوی بن سلطان مظفر بن سلطان ابراہیم بن شیخ ابوبکر بن شیخ عبداللہ بن شیخ عبدالرشید بن شیخ عبدالصمد بن شیخ عبدالسلام بن امام اعظم ابوحنیفہ ۔

حضرت منتخب الدین کے والد حضرت محمود ہانسوی اور چچا جمال الدین ہانسوی دونوں حضرت بابا فرید گنج شکر سے بیعت تھے لیکن آپ کے محبوب خلیفہ جمال الدین ہانسوی تھے۔ اور دوسرے اللہ کے محبوب خلیفہ محبوب الٰہی نے۔

محمود ہانسوی صاحب حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کا بیحد احترام کرتے تھے۔ ان کے مرتبے کو پہچانتے تھے۔ اور اکثر و بیشتر ان کی صحبت میں رہا کرتے تھے حضرت محمود ہانسوی کثیر العیالی تھے انکی اولادیں چار بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ حضرت برہان الدین غریب ۲۔ حضرت منتخب الدین زر زری زر بخش
۳۔ عزیز قتال ۴۔ حضرت ابوالفتح

اور بیٹیوں کے اسمائے گرامی تھے بی بی خدیجہ، بی بی عائشہ، بی بی مریم، بی بی امنہ اور بی بی حمیدہ۔

ان میں سے حضرت منتخب الدین کے دونوں بھائیوں حضرت ابوالفتح اور عزیز قتال کے مزارات دولت آباد کے قلعے میں تھے تیسرے دروازے کے داہنی جانب دو کمانوں والی مختصر سی خانقاہ یا دالان میں ہے جو تادم تحریر موجود تھے۔ صاحبزادیوں کے مزارات بھی وہیں خلد آباد میں ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے اور آپ کے برادر محترم برہان الدین غریب نے اپنے پیرومرشد کے حکم پر اس طرح ہجرت کی کہ سارا خاندان ہی دلی سے چل پڑا۔ کیونکہ آپکی والدہ بی بی ہاجرہ اور آپکے ماموں کے مزارات بھی وہیں موجود ہیں۔

حضرت خواجہ منتخب الدین ۶۷۵ھ م ۱۲۷۶ء میں پیدا ہوئے پیدائشی ولی

تھے۔ آپ کی ولادت کے متعلق قلمی ذخیرہ میں جو مواد ملتا ہے وہ یہ ہے کہ جب آپ شکم مادر میں تھے تو آپکی والدہ محترمہ بڑے عجیب اور معنی خیز خواب دیکھا کرتی تھیں۔ ایک دن انہوں نے اپنے خوابوں کی تفصیل اپنے شوہر کو بتائی۔ انھوں نے حضرت نظام الدین محبوب الٰہی سے بتایا اور آن جناب نے فرمایا کہ "مبارک ہو کہ جو فرزند تمہارے یہاں پیدا ہوگا وہ بندگان خدا میں برگزیدہ اور اللہ کے رسول کا پیارا ہوگا۔

اس کے بعد آپکی ولادت کا زمانہ قریب آیا تو آپ نے نیم بیداری اور نیم خوابی کے عالم میں اپنی ماں سے بار بار کہا کہ میں دنیا میں برہنہ حالت میں جلوہ گر نہیں ہو سکتا جب تک میری ستر پوشی کا بندوبست نہ ہو میں شکم مادر سے باہر نہیں آؤں گا۔

یہ بڑی عجیب و غریب بات تھی اور نہایت انوکھی فرمائش تھی چنانچہ آپ کے والد صاحب دربار محبوب الٰہی کے دربار میں پہنچے۔ اپنی تشویش اور تردد بیان کیا، حضور نے تھوڑی دیر مراقبہ کیا اور فرمایا کہ تمہارا فرزند خاصان خدا میں سے ہے۔ اپنی بیوی کو ریشم کے چند تار یا تھوڑا سا کپڑا شکر یا گڑھ میں لپیٹ کر کھلادو اور پھر اللہ پر بھروسہ کرکے بیٹھ جاؤ اور اس کی قدرت کا تماشا دیکھو۔

حضرت محمود صاحب نے آپ کے کہے پر لفظ بہ لفظ عمل کیا اور جب حضرت خواجہ منتخب الدین پیدا ہوئے تو آپکی کمر کے گرد ایک چھوٹا سا تہبند تھا جس پر زریں دھاریاں تھیں۔ یہ کرامت آپ کی پیدائش تھی۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جسے سلسلہ چشتیہ کے ایک بہت بڑے بزرگ بو محمد جب پیدا ہوئے تو انھوں نے باآواز بلند کلمہ طیبہ پڑھا تھا۔

آپ کی پرورش اپنے والد کے زیر سایہ ہوئی۔ بچپن ہی سے غیر معمولی ذہانت اور ذکاوت کی وجہ سے اپنے ہم سبقوں میں ممتاز اور نمایاں رہے۔ قرآن، تفسیر حدیث فقہ جیسے علوم پر بہت جلد دسترس حاصل کی اور پھر روحانیت کی طرف مائل ہوئے اور وہاں بھی مرتبہ کمال کو پہنچے۔ کم عمری میں آپ کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی تالاب یا ندی کے کنارے بیٹھ کر بصد خلوص و عقیدت ذکر بالجہر فرماتے تو لا الٰہ کے ساتھ

پانی خشک ہونے لگتا اور آبی جانور تڑپ کر باہر آجاتے اور پھر الا اللہ کے ساتھ پانی اور اس کی موجیں جوں کی توں ہو جاتیں ۔

یہ خاصان خدا کے جذب اور خلوص عبادت، صدق نیت اور بے ریائی کا جذبہ ہے جو ان سے یہ کرامتیں سرزد ہوتی ہیں ۔ ورنہ آج بھی لب دریا بیٹھ کر ذکر کرنے والوں کی کمی نہیں ہے لیکن ان کی حلال اور صدق مقال اور دل کی لگن شرط ہے کہ جب یہ لوگ یاد الٰہی میں مصروف ہوتے تو اللہ کی ذات کے علاوہ کسی اور کا خیال تک دل میں نہ آتا۔ بقول اقبال ؎

آج بھی جو براہم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

حضرت منتخب الدین زرزری زر بخش حضرت بابا فرید گنج شکر سے بیعت ہوئے اور سلوک کی منزلیں حضرت محبوب الٰہی کے سایۂ عاطفت میں طے کیں اور نہایت کم سنی میں محبوبیت کے درجے پر فائز ہوئے۔

آپ کے دکن کے سفر اور ہجرت کے بارے میں منقول ہے کہ ایک روز آپ حضرت محبوب الٰہی کی خدمت میں بصد ذوق وشوق حاضر تھے ۔ عمر سترہ سال کی تھی حضرت نظام الدین محبوب الٰہی پر بھی اس وقت استغراق کا عالم تھا ۔ آپ نے اپنے نوعمر ارادت مند کو بغل گیر فرمایا اور ہاتھ پکڑ کر کہا کہ آؤ مراقبہ کرو ۔ اور اس کے بعد دونوں مراقبے میں چلے گئے اور مراقبے میں دربار سرور کائنات کو دیکھا کہ اصحاب کے ساتھ جلوہ افروز ہیں ۔ سبحان اللہ ۔ حضرت محبوب الٰہی نے اپنے نوعمر ارادت مند کو حضور کی زیارت سے مشرف فرمایا ۔ قدم بوسی کروائی اور فرمایا کہ یہ بندہ عاجز و مسکین آپ کی عنایت خاص کا امیدوار ہے ۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شرف قبولیت بخشا اور آپ کے سر پر دکن کی ولایت کا تاج رکھا اور فرمایا کہ ان کو دکن کی طرف اشاعت اسلام کے لیے روانہ کردو ۔

امام الاولیاء سید الاصفیا حضرت علی کرم اللہ وجہ اس محفل میں موجود

تھے ۔ آپ نے بصد ادب فرمایا کہ بہتر ہے کہ اس ولایت اور عنایت کی تشہیر بھی کردی جائے تاکہ عالم ارواح میں یہ بات مخفی نہ رہے چنانچہ یہی کیا گیا اور آپ اللہ کی خشیت اور سلطان المشائخ کے حکم پر سات سو پالکیاں جن میں چودہ سو کامل اولیاء موجود تھے دکن کی طرف روانہ ہوئے ۔ اس وقت آپ کی عمر سترہ سال کی تھی اور اس قافلے میں آپ کے عزیز ترین دوست خواجہ محمد صاحب بھی ساتھ تھے جو خواجہ محمد فرید الدین گنج شکر کے نواسے اور خواجہ بدرالدین اسحٰق کے صاحبزادے تھے اور اسی قافلے میں حاجی نظام بھی تھے جو اولیاء کی امامت فرماتے تھے۔

مجھے افسوس ہے کہ مورخ جب بادشاہوں کی فتوحات کا ذکر کرتے ہیں تو بڑی حیرت سے دو واقعہ بیان کرتے ہیں ایک محمود غزنوی کا غزنی سے گجرات پہونچنا اور سومنات کے مندر کو فتح کرنا اور دوسرا دہلی سے اتنا طول وطویل ان جانا راستہ طے کر کے سلطان علاؤالدین خلجی کا دیوگری آنا اور رام دیو کو شکست دے کر قلعہ فتح کرنا ۔ تاریخی حالات اور جغرافیائی اعتبار سے یہ دونوں فتوحات بڑی عجیب اور حیرت انگیز ہیں لیکن ان سے زیادہ تعجب خیز ان اولیاء اللہ کے قافلے کا سفر ہے جو تاریخ کے احاطہ کار سے باہر ہے لیکن غور کریں تو تاریخ میں اس کا جواب بھی نہیں ہے ۔ یہاں ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ وہ محمود غزنوی ہو یا علاء الدین خلجی دونوں کے ساتھ لشکر اور سامان حرب موجود تھا جب کہ اولیاء اللہ کا یہ قافلہ ان سے معرا تھا ۔ ان کا سب سے بڑا ہتھیار ان کا ایمان کامل تھا ۔ شاہی فوج اپنے ساتھ پورا پورا سامان خورد ونوش رکھتی تھی ۔ یہی نہیں بلکہ اپنی "قوت خریدہ" بھی ساتھ لے کر بھرتی بھی اور ان اولیاء کرام کا سرمایہ صرف ان کا توکل اور قناعت تھا ۔

دہلی سے دولت آباد تک کتنے پہاڑی سلسلوں کو عبور کرنا پڑتا ہے ۔ کتنے دریا پار کرنا پڑتے ہیں ۔ اس کا اندازہ نقشہ دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس دور کے ذرائع آمد ورفت اور حمل ونقل کو بھی ملحوظ رکھنا پڑتا ہے اور جب ہم ان دونوں باتوں کو ملحوظ رکھتے ہیں تو یہ "شاہان بے تاج" تمام سلاطین سے زیادہ باعظمت اور باوقار نظر آتے ہیں ۔

یوں تو مشائخ، صوفیا اور اولیاء کے حالات زندگی میں توکل اور قناعت کی بے شمار مثالیں موجود ہیں مگر یہ سب "انفرادی" اور ان کی ذات سے متعلق ہیں۔ اس اجتماعی قناعت پسندی اور باجماعت اللہ کی رضاجوئی میں اسی کی ذات واحد پر بھروسہ کرنے کی اگر کہیں مثال ملتی ہے تو صرف "سلطان ہند" کے نام لیواؤں میں حضرت محبوب الٰہی کے مریدوں کی ہے۔ جو اپنے پیر و مرشد کے حکم پر یوں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جیسے گھر سے نکل کر آنگن میں آرہے ہوں اور انکی یہ ہجرت یا اشاعت اسلام کے لیے اتنے طویل سفر پر نکل کھڑے ہونے کا واقعہ دو مرتبہ پیش آیا۔ ایک مرتبہ ۶۹۳ھ مطابق ۱۳۰۹ء میں حضرت خواجہ منتخب الدین کے ساتھ اور دوسری بار ستر یا اٹھارہ برس میں یعنی ۷۰۱ھ م ۱۳۴۷ء میں برہان الدین غریب کے ساتھ۔

ظاہر ہے کہ اگر خدا رسیدہ بزرگوں کے یہ قافلے سلطان محمد تغلق کے حکم پر یہاں آتے تو خلد آباد کی غیر آباد پہاڑیں، گلبرگ اور کرناٹک کے دور دراز علاقوں۔ احمد نگر اور گجرات کی بنجر سرزمینوں کے بجائے یہ سب اولیاء دولت آباد کے شاہی محلوں میں آرام کرتے رہتے اور آج ان کے نام سے بھی کوئی واقف نہ ہوتا۔

محبوب الٰہی نے جو خانقاہی نظام قائم کیا تھا اور صوفیا کرام کی روحانی تربیت کے لیے جو طریقہ کار استعمال کیے تھے وہ اپنی مثال آپ تھے۔ یہ ان کے مریدوں اور پیروں کا ضبط و نظم فرمانبرداری اور اپنے "شیخ" کی اطاعت کا جذبہ بے پایاں نہیں تو اور کیا تھا جس نے اسلام کو ہندوستان کے جنوبی علاقوں میں دور دراز تک پھیلا دیا اور جب سے یہ خانقاہی نظام تباہ ہوا ہے ہمارے پاس اخلاقیات اور مذہب کی عملی تربیت اور اجتماعی زندگی کے شعور کو ابھارنے کے لیے کوئی موثر ادارہ نہ رہا۔ کچھ دنوں تک مسجدیں انکی جگہ سنبھالتی رہیں لیکن نہ وہ اجتماعی شعور پیدا کر سکیں اور نہ اپنے قول و فعل میں یکسانیت برقرار رکھ سکیں۔ اس کے بعد جب سے علم اسکولوں اور کالجوں میں سرکاری طور پر حاصل ہونے لگا اس کی ساری ہیئت اور تمام اجزائے ترکیبی بدل کر بلکہ بکھر کر رہ گئے۔

حضرت منتخب الدین کے ساتھ جب یہ قافلہ اپنا دو تہائی سفر طے کر کے دریائے

تاپتی کے کنارے پہونچا تو حضرت نے وہاں قیام کیا۔ نماز پڑھی۔ اس سرسبز و شاداب خطے اور یہاں کے شیریں پانی کو دیکھ کر اللہ سے دعا کی کہ "پروردگار یہاں کے لوگوں کو شاد و آباد رکھ۔ یہ لوگ پھلیں پھولیں اور یہاں کی آبادی کو ہر آفت سے محفوظ رکھ"

ظاہر ہے کہ خواجہ منتخب الدین صاحب محبوبیت کے درجے پر فائز تھے۔ دعا قبول ہوئی۔ اسی مقام پر شہر "برہان پور" آباد ہوا اور فاروقی سلاطین نے اس کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔

کاغذی پورے کے پڑاؤ کے بعد ان لوگوں نے خلد آباد کی سب سے اونچی پہاڑی کا رخ کیا اور وہاں چند دنوں قیام کے بعد یہ قافلہ اپنے "رہبر و رہنما" کے حکم پر بکھرتا چلا گیا۔ جہاں جہاں محبوب الٰہی کا حکم ہوا حضرت منتخب الدین کے اشارے پر یہ لوگ رشد و ہدایت کے لیے چلے گئے۔

زر زری زر بخش کا لقب

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی تاریخ کے حوالے سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ اللہ والوں کا یہ قافلہ جب دہلی سے چلا تو اس میں سے کسی نے بھی یہ سوال نہ کیا کہ ہمارے "زاد راہ" کا کیا انتظام ہے۔ اشیائے خورد و نوش کب اور کہاں ملیں گی۔ کیونکہ یہ ان کے توکل کے خلاف تھا جو درویشی کی پہلی صفت ہے۔ یہ راز و نیاز صرف حضرت محبوب الٰہی اور ان کے چہیتے مرید حضرت منتخب الدین کے درمیان تھے جن کو یہ کرامت مل چکی تھی۔ تہجد یا فجر کے وقت جب آپ وضو کر کے نماز پڑھنے بیٹھتے تو آپ کو اپنی جانماز کے نیچے غیب سے سونے کے کچھ سکے مل جاتے جو آپ اسی وقت فقرا اور مساکین میں تقسیم کر دیتے۔

کچھ روایات میں یہ ہے کہ آپکو ہر روز سونے کا ایک چھوٹا سا ڈبہ ملتا جس میں سکے ہوتے اور آپ ان کو لٹا دیتے۔ ایک روایت یہ ہے کہ ہر روز صبح غیب سے آپ کو ایک سبز نعمت عطا ہوتا جس میں سونا لگا ہوتا اور وہ سونا آپ تقسیم فرما دیتے

میں نے ان تمام روایتوں کا بغور مطالعہ کیا اور اس نتیجہ پر پہونچی ہوں کہ پہلی روایت ہی صحیح اور قرین قیاس ہے کیونکہ یہ اکثر اللہ والوں کے ساتھ ہوتا رہا ہے اور اس سونے کی فیاضانہ تقسیم کی بنا پر آپ کا لقب زر زری زر بخش مشہور ہوا۔

حضرت زر زری زر بخش صاحب نے خلد آباد کی اس غیر آباد پہاڑی پر اپنا مسکن بنایا۔ "ہوڑہ" پہاڑ کی چوٹی پر ایک مختصر سی مسجد تعمیر کروائی جو اب بھی ہوڑے کی مسجد کہلاتی ہے۔ اور نہ جانے کتنی بار ان کے عقیدت مند اور خدا رسیدہ حضرات اس کی مرمت کروا چکے ہیں یعنی یہ اپنی اصلی حالت میں باقی نہیں ہے۔ البتہ اس کے قریب ایک نہایت ہی چھوٹا سا کمرہ ہے جس کی بلندی پانچ فٹ سے زیادہ نہیں ہے۔ لمبائی چوڑائی بھی بہت مختصر ہے۔ چھت گول ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت زر زری زر بخش نے چالیس۴۰ دن تک چلہ کشی کی تھی۔ اب بھی زائرین پہاڑ کی اس بلندی پر پہنچ کر آستاں بوس ہوتے ہیں۔

حضرت زر زری زر بخش جب اس پہاڑی مقام پر آئے تو یہاں ایک کنواں تھا (جو اب بھی موجود ہے اور سونا بائی کی باوڑی کہلاتا ہے) اس کنویں کا مالک راجہ یا بہت امیر و کبیر ہندو آدمی تھا جس کی چار بیٹیاں تھیں۔ ایک کا نام سونا بائی تھا دوسری بادلہ بائی تیسری کنٹھا بائی اور چوتھی کا نام ڈاک بائی تھا۔ ان میں مختار کل سونا بائی تھی۔ حسن و جمال میں اس کا جواب نہ تھا اور یہ باوڑی یا کنواں جس کا میں ذکر کر رہی ہوں اس کی ضروریات کے لیے مختص تھی۔ باقی تینوں لڑکیوں کے لیے علیحدہ علیحدہ تین باوڑیاں تھیں۔

سونا بائی کی باوڑی بڑی گہری تھی اور اس سے اس کے باغ کی آبیاری ہوتی رہتی اور اس میں تفریح کے لیے اکثر سونا بائی آیا کرتی تھی۔

حضرت زر زری زر بخش جب اس پہاڑی پر تشریف لائے تو اپنے کسی خادم کو وضو کے لیے پانی لانے بھیجا۔ اس نے پانی سونا بائی کے درباریوں سے طلب کیا لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ ادھر حضور کے خادموں نے اصرار کیا۔ اتفاق سے اس

وقت سونا بائی وہاں موجود تھی حال احوال دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ حضرت زر زری زر بخش کے خدام پانی کے طلب گار ہیں۔ آپ کی شہرت اور زر زری زر بخش کے لقب کی توجیہ سب کو معلوم تھی۔ اس لیے سونا بائی نے ازراہ تمسخر کہا۔

اگر تمہارے پیر و مرشد کو پانی کی ایسی ہی ضرورت ہے تو پانی اس شرط پر مل سکتا ہے کہ میری باؤلی کا پانی سونا بن جائے۔ سونا بائی نے یہ بات ناممکنات میں سے سمجھ کر محض ٹالنے کی خاطر کہا تھا لیکن جب حضرت زر زری زر بخش تک یہ بات پہنچی تو آپ نے فرمایا۔ یہ ہے تو یہی سہی۔ تم پہلے کنویں میں سے میرے وضو کے لیے پانی نکال لو اور پھر میرا رومال پانی میں دھو کر باؤلی میں نچوڑ دو اور خداوند قدوس کی قدرت کا تماشا دیکھو کہ وہی قادر مطلق ہے۔ چنانچہ آپ کے خدام پانی کا مشکیزہ لے کر وہاں گئے اور سونا بائی یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس مرد خدا نے اس کا چیلنج کس طرح قبول کر لیا۔ خدام نے مشک بھری اور حضرت کا رومال دھو کر کنویں میں نچوڑ دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے باؤلی کا پانی سیال سونے میں تبدیل ہو گیا۔ آپ کے خدام بے نیازی کے ساتھ رخصت ہو گیے اور سونا بائی حق حیران انگشت بدنداں یہ کرامت دیکھ کر کچھ دیر کے لیے سکتے میں رہ گئی اور جب حواس بجا ہوئے تو دیوانہ وار آپ کے آستانے پر پہنچی اور کہا۔ "جس مذہب کے لوگوں میں اتنی کرامت ہے، ان کا خدا" کس قدر قدرت والا ہوگا۔

حضرت زر زری زر بخش کی خدمت میں پہونچ کر وہ بڑے ادب سے آداب بجا لائی۔ آپ نے چونک کر کہا۔ تم کون ہو کیا نام ہے؟

جواب دیا میں سونا بائی ہوں۔ آپ نے اسی قلندرانہ شان اور صوفیانہ آن بان سے کہا۔ "سونا بائی کا مقصد سونا بنوانا تھا سو بن چکا۔ اب فقیر سے کیا کام ہے۔ اس نے جواب دیا۔

"اس سونے نے سونا بائی کو سونا بنانے والے گرو تک پہونچا دیا۔ اب اس سونا بنانے والے گرو کا کام ہے کہ سونا بائی کو سونا پیدا کرنے والے خدا سے ملا دے جو قادر مطلق ہے۔

آپ سونا بائی کی عقیدت اور خدا طلبی سے بہت محظوظ ہوئے اور نظر عنایت سے دیکھ کر فرمایا کہ انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔

اس کے بعد سونا بائی اپنی تمام ہمجولی داسیوں اور ملازمین سمیت مشرف بہ اسلام ہوئی اور اس واقعہ کے بعد اسلام میں داخل ہونے والے لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ سونا بائی اپنے گرو یعنی زرزری زر بخش صاحب کی نظر کیمیا اثر سے نہ صرف پکی مسلمان بن گئی بلکہ اونچے مراتب پر فائز ہوئی۔ مرنے کے بعد آپ کے مزار کے سامنے چنبیلی کے پیڑ کے نیچے دفن ہوئی۔ اس کا مزار اب تک اس درخت کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے اور اس کی باوڑی اب تک اسی کے نام سے موسوم ہے۔

جب تک حضرت زرزری زر بخش زندہ رہے۔ رشد و ہدایت میں مصروف رہے اور ان کے ساتھ انکے دوست انکے پیر بھائی خواجہ محمد صاحب جن کا ذکر پہلے آچکا ہے انکے ہم نوالہ اور ہم پیالہ رہے۔ افسوس ہے کہ حضرت زرزری زر بخش نے زیادہ عمر نہیں پائی۔ ۳۴ یا ۳۵ برس کی عمر میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور کل سترہ برس تک خلد آباد اور اس کے متعلقہ علاقوں کو اپنے نور ہدایت سے منور کرتے رہے چونکہ آپ کا وصال عالم شباب میں ہوا اور آپ کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے عوام الناس میں آپ زرزری زر بخش دولہا کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔

آپ کے دوست خواجہ محمد صاحب کو جب آپ کے وصال کی اطلاع ملی تو دل پکڑ کر بیٹھ گئے۔ جب ان کو پردہ خاک میں چھپا دیا گیا تو خواجہ محمد صاحب وفور غم میں یہ شعر پڑھ کر قبر پر گر پڑے۔

از یار غار ماندن تنہا بغار اولیٰ
بے یار زندہ بودن مردن ہزار اولیٰ

گرتے ہی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور بعد کو عقیدت مندوں نے انھیں کے پہلو میں آپ کو دفن کر دیا اور دونوں کا عرس ایک ہی دن اور تاریخ کو ہوتا ہے کیونکہ دونوں کی تاریخ وفات ۸ ربیع الاول ۷۰۹ھ مطابق ۱۳۰۹ء ہے۔ اس واقعہ کی مطابقت

حضرت محبوب الٰہی اور امیر خسرو کی موت سے ہے۔

آپ کا عرس خلد آباد اور اورنگ آباد کی بستی میں سب سے بڑا عرس ہوتا ہے۔ جس میں عاشقان خدا، اولیائے کرام، صوفیائے عظام اور محبان محبوب الٰہی اور عارفان کامل کے علاوہ فقراء، غربا اور مساکین ہزاروں کی تعداد میں شرکت کرتے ہیں اور بہشت خلد آباد میں تل دھرنے کی جگہ نہیں ملتی ہے۔

حضرت فرید الدین "ادیب"

حضرت فرید الدین ادیب کا مزار حضرت خواجہ منتخب الدین زرزری زر بخش کے بیرونی احاطہ میں مغرب کی جانب ایک چوکور اور مضبوط چبوترے پر ہے اور ان کے ساتھ اسی جگہ جو باقی تین مزارات ہیں وہ مندرجہ ذیل اصحاب کے ہیں۔

۱۔ فخر الدین شمس الملک ۲۔ معزب مبارک غوری ۳۔ فرید الدین یگانہ

یہ چاروں مزارات جس چبوترے پر ہیں وہ ترچھا ہے یعنی قبروں کا رخ مع چبوترے کے شمال "جنوبا" ہونے کے بجائے شمال مشرق اور جنوب مغرب ہے۔ جو زائرین کے لیے پہلی نظر میں بڑا عجیب سا لگتا ہے۔ جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

دراصل یہ چاروں بلند پایہ بزرگ حضرت برہان الدین غریب (جو حضرت زرزری زر بخش کے بڑے بھائی تھے۔ اور بعد کو اولیاء کے دوسرے قافلے کے ساتھ آئے تھے) کے سچے عقیدت مندوں اور مریدوں میں سے تھے۔ ان میں سب سے بلند مرتبہ حضرت فرید الدین باادب یا فرید الدین ادیب کا تھا جن کو لوگ "ادیب" یا "باادب" اسی لیے کہتے تھے کہ وہ اپنے پیر و مرشد حضرت برہان الدین غریب کا بے انتہا احترام کرتے تھے۔ حد یہ ہے کہ اپنے پیر و مرشد کے مکان کی طرف منہ کر کے نہ تھوکتے تھے اور نہ پیر اس طرف کر کے بیٹھتے تھے۔

فرید الدین ادیب بچپن ہی سے نہایت سعادت مند، با اخلاق اور ہونہار تھے۔ آپ خود بیان فرماتے ہیں کہ میں چھوٹا تھا تو کھانا بہت کھاتا تھا۔ ہر وقت بھوک سی لگتی رہتی ہے۔ پندرہ سال کی عمر میں ایک مرتبہ میں اپنے ماموں کے ساتھ محفل سماع میں گیا۔ جہاں حضرت برہان الدین غریب موجود تھے۔ میرے ماموں نے مجھے اٹھا کر شیخ کے قدموں میں ڈال دیا۔ میں جانتا تھا کہ صوفیا کے مسلک میں یہ تین چیزیں بہت اہم ہیں ایک قلت طعام دوسرا قلت کلام تیسرا قلت منام یعنی (کم کھانا، کم بولنا اور کم سونا)

اور یہی درویشی کی علامات ہیں۔ میں جب حضرت کے قدم بوس ہوا تو دل میں سوچا کہ یہ اگر واقعی بزرگ کامل اور سچے ولی ہوں گے تو میں بھی کم کھانا کھانے لگوں گا۔

چنانچہ جب میں وہاں سے آیا تو دل کو عجیب سا سرور اور سکون تھا۔ قلت طعام کی دعا قبول ہو چکی تھی اور چند مہینوں میں یہ نوبت آگئی کہ میں دن بھر میں ایک روٹی بڑی مشکل سے کھاتا اور دل سیر ہو جاتا۔

اٹھارہ برس کی عمر میں حضرت برہان الدین غریب کے دست حق پرست پر بیعت کی اور اس عقیدت و احترام سے کہ خود حضرت برہان الدین نے فرمایا کہ یہ جوان میری نظر میں اس طرح آیا ہے جیسے کوئی مرید تیس سال تک پیر کی خدمت میں رہا ہو اور اسی صورت میں ممکن ہے جب کسی مرید کو اپنے پیر کے ساتھ غائبانہ عقیدت ہو۔

آپ نے بہت جلد سلوک اور عرفان کی منزلیں طے کر لیں۔ آپ حضرت برہان الدین کے اتنے محبوب مرید تھے کہ آپ نے یہاں تک فرمایا کہ اگر کل قیامت میں خداوند قدوس مجھ سے پوچھے گا کہ ہماری بارگاہ میں کیا تحفہ لائے ہو تو میں عرض کروں گا کہ "فرید" کو لایا ہوں قبول کر لیں۔

حضرت فرید الدین یگانہ سے منقول ہے کہ میں ایک روز مولانا فرید الدین ادیب کی خدمت میں گیا کیونکہ وہ شیخ کے مقرب مرید تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے حضرت برہان الدین خلعت خلافت انھیں کو عطا کریں گے۔ میں نے دیکھا کہ وہ زار و زار رو رہے ہیں اور شدت گریہ ان کو نڈھال کر چکی ہے۔ میں پریشان ہو گیا اور اس پریشانی کے ساتھ گریہ وزاری کا سبب دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا۔

"میں نے سنا ہے کہ حضرت شیخ برہان الدین غریب کا حکم ہوا ہے کہ ان کی وفات کے بعد میں ان کے سجادے پر بیٹھوں (یعنی خلیفہ بنوں) بھلا کہاں میں اور کہاں یہ رتبہ۔ میں اس قابل نہیں ہوں۔" یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے۔"

میں رو رو کر اللہ کے حضور دعا مانگ رہا ہوں (اور تم بھی آمین کہو) کہ اس مرحلے کی نوبت نہ آئے۔ اور خداوند کریم ان کی زندگی ہی میں مجھے اس دنیا سے اٹھا لے۔"

اس چھوٹے سے واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواجگان چشت اور حضرت محبوب الٰہی کے نام لیوا اقتدار، شہرت اور خوشامد سے کتنی دور رہتے تھے۔ حرص و طمع ان کے قریب نہیں پھٹک سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خدا سے زیادہ قریب تھے۔ دعا جو مانگی تھی قبول ہوئی اور وہ اپنے پیر و مرشد حضرت برہان الدین غریب کی وفات سے تیرہ روز پہلے یعنی ۲۹ محرم ۷۳۸ھ میں اللہ کو پیارے ہوگئے اور حضرت منتخب الدین زر زری زر بخش کی درگاہ کے بیرونی احاطے میں مدفون ہوئے۔

حضرت برہان الدین غریب کا جب وصال ہوا تو ان کا مزار اور انکی درگاہ اسی رخ پر بنی جدھر فرید الدین ادیب کے پیر تھے۔ بعد کو ان کے تینوں ساتھی یعنی فرید الدین یگانہ، خواجہ مبارک غوری اور شمس الملک بھی اسی چبوترے پر دفن کر دیے گئے۔

اس واقعہ کو کم و بیش (۷۷) برس گذر گئے۔ ایک دن حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز حضرت منتخب الدین کے مزار پر قدم بوسی کے لیے آئے تو اس چبوترے کے پاس رُک گئے۔ ان کو لوگوں نے بتایا کہ یہ " فرید الدین با ادیب " اور ان کے ساتھیوں کے مزارات ہیں آپ نے تبسم فرمایا اور کہا۔ "یہ وہی مولانا فرید ہیں جو بہت زیادہ با ادب تھے! لیکن یہ کیا ادب ہے کہ اس وقت ان کے پاؤں کا رخ شیخ کی طرف ہے۔"

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہونے کی دیر تھی کہ آپ نے قبر میں اپنا رخ اس طرح تبدیل کیا کہ پورا چبوترہ ہی پلٹ گیا اور اب تک یہ ٹیڑھے رخ پر موجود ہے۔

آپ کے وصال کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ جس وقت آپ آخری سانسیں لے رہے تھے اس وقت ایک صاحب جو آپ کے پاس موجود تھے زور زور سے کلمۂ طیبہ پڑھنے لگے۔ چند لمحوں بعد آپ نے آنکھیں کھولیں اور فرمایا "کیا تو نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ میں خدا کی یاد سے غافل ہوں۔ خبردار ایسی گستاخی عاشقانِ خدا سے نہ کرنا ورنہ نقصان اٹھاؤ گے اور یہ کہہ کر جان بحق ہوئے۔

چنیں واجب کند در عشق مُردن
بجاناں جاں چنیں جائز سپردن

وفات کے بعد ایک بزرگ نے ان کو خواب میں دیکھا اور ان کو ایسا لگا جیسے کوئی کہہ رہا ہے۔ فرید ہمارا دوست تھا۔ ہم نے اس کو وہاں (دنیا میں) اس لیے نہیں چھوڑا کیونکہ وہ وہاں کے لائق نہ تھا۔

حضرت فخر الدین قدس سرہٗ (عراقی)

آپ کا مزار مبارک بھی حضرت خواجہ منتخب الدین زر زری زر بخش کے احاطے میں حضرت فرید الدین بااویب کی آرام گاہ سے تھوڑے سے فاصلے پر ہے۔ آپ حضرت برہان الدین غریب کے مریدان خاص اور خلفا میں سے تھے اور انہیں کو ان کے پیر و مرشد نے یہ عزت دی تھی کہ اپنی ہی زندگی میں ان کو مرید کرنے اور دوسرے لوگوں سے بیعت لینے کی اجازت دیدی تھی۔ آپ کے والد کا نام شمس الملک تھا یعنی حکومت کے خطاب یافتہ تھے۔ اسی لیے اچھے عہدے پر فائز ہونا لازمی تھا۔

دونوں باپ بیٹے حضرت برہان الدین غریب سے بیعت تھے۔ درویش اور صوفی تھے لیکن عرصہ دراز تک انھوں نے لباس فاخرہ اور امارت کے لبادے میں اپنے آپ کو ملبوس رکھا تاکہ دل کا فقر طبیعت کی غنا، روح کی اللہ سے رغبت ظاہر نہ ہونے پائے۔ اور یہی اللہ والوں کی پہلی صفت ہے کہ جس طرح اپنے آپ کو چھپا سکیں چھپائے رکھیں تاکہ مخلوق ان پر "اللہ والا" ہونے کا شبہ تک نہ کر سکے اور وہ خود دنیا کے فتنوں سے محفوظ رہیں۔ اس کے باوجود ان کا زیادہ تر وقت عبادت میں گذرتا۔ بقول ایک فارسی شاعر کے ؎

مرادِ اہلِ طریقت لباسِ ظاہر نیست
کمر بخدمتِ سلطان بہ بندہ صوفی باش

(اہلِ "طریقت" کی منزل مقصود ظاہری لباس نہیں ہے۔ سلطان یا حاکم وقت کی خدمت میں کمر بستہ ہو اور "صوفیا" کی بندگی کر)

(مجد الدین اپنے قلمی نسخے میں لکھتے ہیں کہ فخر الدین عرصہ دراز تک دنیا کے لباس

میں ریاضت اور مجاہدے میں مصروف رہے یہاں تک کہ وہ وقت آگیا جب سلطان محمد تغلق نے ان تمام لوگوں کو جن کو کھینچ گھسیٹ کر دہلی سے دولت آباد لایا تھا۔ حکم دیا کہ آپ لوگ واپس جائیں اور دہلی آباد کریں۔ مولانا فخر الدین اسی وقت اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا۔

مرشدی۔ میں اب تک دنیا داروں کی صحبت میں رہا ہوں اور آپ کا حکم ہے کہ میں اپنے مرید بناؤں۔ لوگوں کو راہِ حق دکھاؤں۔ دونوں باتیں ایک ساتھ نباہنا بہت مشکل ہیں اگر آپ کی مرضی ہو تو ملازمت ترک کر کے اپنی بقیہ زندگی آپ ہی کے قدموں میں بسر کر دوں۔

حضرت برہان الدین غریب نے فرمایا فخر الدین ابھی تجھے بہت کچھ دیکھنا باقی ہے دہلی چلا جا لیکن ایک وقت آئے گا جب لوگوں کو داخل بیعت کرے گا۔ چنانچہ آپ دہلی واپس چلے گئے اور مدت تک اپنی خدمت پر معمور رہے۔

اس کے بعد حضرت برہان الدین غریب نے ان کو ایک خط بھیجا جس کے سرنامے پر فارسی شعر لکھے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ :

تمہارے لیے خانہ کعبہ کا در کھل چکا ہے۔ اب بت خانے سے رہائی حاصل کر۔ تم "شہباز" ہو۔ زاغ و زغن میں کب تک بستے رہوگے۔

ان اشعار میں حج بیت اللہ کا اشارہ واضح طور پر موجود تھا۔ اس لیے آپ فوراً حج بیت اللہ کے لیے چل پڑے۔ ظاہر ہے کہ وہ دور آج کا دور نہ تھا۔ حج کا سفر جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ مہینوں میں سفر طے کیا اور مہینوں میں واپس آئے۔ جب دہلی پہونچے تو معلوم کہ حضرت برہان الدین غریب نے آپ کو بطور خاص دولت آباد سے پروانۂ خلافت اور اجازت نامہ بیعت بھیجا جس وقت آپ کو یہ دونوں چیزیں موصول ہوئیں۔ اس وقت دولت آباد میں حضرت برہان الدین غریب کا وصال ہو چکا تھا (لیکن آپ کو اطلاع نہ تھی) جو اصحاب اس وقت موجود تھے ان میں سے ایک کا بیان ہے کہ جس وقت حضرت فخر الدین صاحب کو جامہ پہنایا گیا

وہ زار زار رو رہے تھے۔ اجازت پڑھتے اوسان کی آنکھوں سے موتیوں کی لڑیاں ٹوٹنے لگتیں۔ آپ فرماتے جاتے۔

افسوس صد افسوس میری عمر عزیز دنیا داری میں گذر گئی۔ میں نہیں جانتا کہ اب میرا انجام کیا ہو گا؟ ان پر عاقبت کا خوف اور آخرت کی ہیبت اتنی طاری تھی کہ وہ لرزہ بر اندام تھے (ان کی جگہ کوئی اور ہوتا کہ اللہ نے دنیا کے ساتھ ساتھ مجھے دین بھی دیا لیکن یہ فخر یہ غرور تو کوئی دنیا دار ہی کر سکتا ہے جس کا مسلک انکساری جس کا شغل خاک ساری ہو اس کے یہاں بناوٹ کا کیا کام؟ وقت آ گیا تھا کہ دنیا چھوڑ دیں یا دین چنانچہ آپ نے دین کو دنیا پر ترجیح دی اور یہی سوچتے رہے کہ کس طرح اس دربار داری سے چھٹکارا حاصل کریں۔ درویش کے پاس سچی لگن اور اللہ سے التجا کے علاوہ رکھا ہی کیا تھا) کہ اس جامہ خلافت کو لے کر دربار میں نہیں جاؤں گا۔ چنانچہ رات بھر گریہ زاری اور دعاؤں میں صرف کی صبح کو بادل ناخواستہ دربار میں پہونچے۔ دعا قبول ہو چکی تھی۔ خدا کے علاوہ نہ کوئی مقلب القلوب ہے نہ مسبب الاسباب۔ یوں تو روز ہی آپ سلطان کی خدمت میں حاضر رہتے لیکن اس روز جب سلطان کی نظر فخر الدین صاحب پر پڑی تو فوراً اراکین سلطنت سے کہا۔

" مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ فخر الدین امور سلطنت اور میرے احکام کی بجا آوری کے لیے بالکل نا اہل ہیں۔ ان سے کوئی کام بالکل نہیں ہو سکتا۔ بہتر ہے کہ وہ میرے سامنے نہ آئیں۔ ان کو میں اب دربار میں نہیں دیکھنا چاہتا۔ ان کی ساری املاک ضبط کر لو۔

اس فرمان شاہی پر فوراً عمل ہوا اور فخر الدین صاحب نے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ دل کی مراد بر آئی۔ فوراً گھر آئے۔ ذاتی ملکیت میں ایک لونڈی تھی اور ایک گھوڑا۔ آپ نے فوراً لونڈی کو آزاد کیا اور گھوڑا بھی اس کو نان نفقے کے لیے دیدیا۔ اپنی خوش بختی پر فخر کیا۔ مدتوں عزلت گزیں رہے۔ اس کے بعد پھر حج کے لیے روانہ ہوئے اور وہاں سے واپس آنے کے بعد دہلی کے بجائے دولت آباد میں

قیام کیا اور وہاں پر اپنی ساری زندگی اپنے پیر و مرشد کے نقش قدم پر گذار دی ان کے حکم اور تلقین کے مطابق لوگوں کو اپنا مرید بھی بنایا اور آخر میں وہیں کی خاک میں سو رہے۔

اگر آپ کی زندگی پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ صوفیاً اور عارف امیرانہ اور شاہانہ لباس میں بھی ہو سکتے ہیں اور یہ خیال غلط ہے کہ جو خلعت فاخرہ میں ملے وہ درویشی کے دائرے سے خارج ہو جاتا ہے کیونکہ معرفت اور تصوف کا تعلق دل کی پاکیزگی صدق خیال اور ان کی حلال روزی سے ہے لباس سے نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ جتنے خدا پرست لوگ گذرے ہیں انہوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو دنیا والوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھا۔ اپنی ذات اور اپنے صفات کو چھپانے کی کوشش کی۔ ہمیشہ دنیا سے گریز کیا اور مال و متاع کو اپنے نفس اور اپنی سبک روح کے لیے ایک بہت بڑا بوجھ سمجھا۔

حضرت سید راجو قتال حسینی

آپ کا پورا نام حضرت سید یوسف بن سید علی بن سید محمد حسنی ہے آپکی عرفیت راجا تھی اور لقب "قتال" جو آپ کے جلال اور جذب کی وجہ سے ملا تھا۔ آپ نے اپنے اہل وعیال کے ساتھ ۲۰ رمضان سنہ ۷۲۵ھ مطابق سنہ ۱۳۲۴ء کو دہلی سے دولت آباد ہجرت کی اور چار ماہ کے طویل سفر کے بعد محرم الحرام سنہ ۷۲۶ھ کو یہاں پہنچے۔ سنہ ۷۳۱ھ مطابق سنہ ۱۳۳۰ کو اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔

آپ بڑے باعظمت اور صاحب جلال بزرگ تھے۔ آپ خود اور آپ کے والد ماجد سید علی حسنی دونوں حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی کے مریدوں میں تھے۔ آپکے تین فرزند ارجمند تھے۔ ایک سید راجو قتال حسنی دوسرے سید جلال الدین برج اولیاء اور تیسرے سید گل بہار صاحب۔

خود حضرت راجو القتال حسینی کے چار فرزند تھے۔ ایک جناب سید حسین جن کو لوگ چندن حسنی کے نام سے جانتے تھے۔ دوسرے جنوبی ہند کے مشہور ومعروف ولی کامل حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز جو گلبرگہ (کرناٹک) میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ تیسرے سید احمد جو کم سنی میں فوت ہوئے اور چوتھے سید علی حسنی جو لاولد رہے۔ آپ کی صرف ایک صاحبزادی تھیں جن کا نام بی بی رانی تھا اور غالباً یہ آپکی اولاد میں سب سے بڑی تھیں۔ کیونکہ وہ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی پیدائش سے چند دنوں قبل فوت ہو گئی تھیں۔

آپ کا مزار خلد آباد کے شاہی بنگلوں کے شمالی ڈھلان پر پہاڑی کے دامن میں

ہے اور یہاں سے حضرت زر زری زر بخش کا مزار زیادہ دور نہیں۔ اس کے قرب وجوار میں اولیاء مسجد ہے جو یہاں پر نماز پڑھنے کے لیے چودہ سو اللہ نے مل کر تعمیر کی تھی۔ سڑک کے راستے سے اگر ہم جائیں تو اس پر فضا پہاڑی کے دامن میں داہنی طرف ایک بڑا میدان اور چوکور احاطہ ہے جس میں "ملک عنبر" کا مزار ہے جس کے حالات ہم آگے بیان کریں گے۔ اس کے قریب اس کی بیوی سیدہ کریمہ کا مزار ہے۔

پہاڑ کے دامن میں مغرب کی طرف آگے چل کر ایک بڑا سا مضبوط پھاٹک ملتا ہے جس کے اندر سو قدم کا راستہ ہے جس میں باغ لگا ہوا ہے اور جہاں یہ ختم ہوتا ہے وہاں بائیں طرف ایک خانقاہ ہے اور داہنی طرف حضرت راجہ قتال حسینی کا مقبرہ ہے۔ جو ایک چبوترے پر بنے ہوئے حجرے پر مشتمل ہے اوپر گنبد ہے اور مغرب کی طرف ایک مختصر سی مسجد ہے۔

حضرت راجو قتال حسنی کے مزار مبارک پر جلال ہی جلال ہے۔ انکی زندگی میں ہی ان کے جلال کی وجہ سے کوئی ان کو نظر بھر نہیں دیکھ سکتا تھا اور موت کے بعد کوئی چڑیا یا پرندہ ان کے مزار پر سے اڑ کر نہیں گذر سکتا چنانچہ مزار کے دونوں طرف چڑیا کے جسم کے دونوں علیحدہ علیحدہ ٹکڑوں کی چھوٹی چھوٹی قبریں ہیں جو آپ کے گنبد پر سے پرواز کر رہی تھی اور آپ کے جلال کی وجہ سے دو ٹکڑے ہو گئی۔

ان کے ہیبت اور جلال کی وجہ سے عورتیں صرف خانقاہ تک جاتی ہیں اور وہیں بیٹھ کر فاتحہ خوانی کرتی ہیں اور مرد حضرات بہت سنبھل کر حاضری دیتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ اور بھی ہے کہ حضرت زر زری زر بخش، حضرت برہان الدین غریب، حضرت زین الدین شیرازی کی طرح آپ کی درگاہ کا فرش کالے پتھر کی بھاری سلوں سے نہیں بنا ہے بلکہ عرصہ دراز تک کچا رہا۔ اس لیے ان کے بے شمار عقیدت مندوں نے ان کے قدموں میں اپنے لیے جگہ رکھی اور وہیں دفن ہو گیے۔

حضرت راجو قتال حسینی چشتیہ نظامیہ سلسلے کے سچے پیروکار تھے۔ سماع سے اس مجذوبیت کے باوجود از خد رغبت تھی۔ ایک مرتبہ آپ نماز پڑھ رہے جو اشراق

کی تھی اور آپ کے دو شاگرد معتقدین جس میں سے ایک خوشنویس تھے اور دوسرے طالب علم تھے۔ سماع کے موضوع پر بحث مباحثہ کر رہے تھے۔

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز جو حضرت راجو القتال کے صاحبزادے تھے فرماتے ہیں کہ چند لمحوں بعد میرے والد بزرگوار نے سلام پھیرا اور دونوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "میں نماز میں تھا لیکن جو گفتگو تم لوگ آپس میں کر رہے تھے وہ میرے کانوں میں پڑ رہی تھی کہو تو دُہرا دوں لیکن جب سماع کا وقت ہوتا ہے تو میں کسی اور عالم میں ہوتا ہوں اور وہ ایسا وقت ہوتا ہے کہ میں دنیا مافیہا دونوں سے بے خبر ہو جاتا ہوں۔

آپ کا دولت آباد میں قیام بہت مختصر رہا لیکن برہان پور سے دولت آباد تک معتقدین پھیلے ہوئے تھے۔ حد یہ ہے کہ قطب شاہی (گولکنڈہ) کا آخری تاجدار ابو الحسن تانا شاہ" آپ ہی کے قدموں میں آسودہ ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ برسوں بعد بھی چشتیہ سلسلے سے شاہان سلف کی عقیدت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ کیونکہ حضرت راجو قتال حسینی کی وفات سنہ ۷۳۱ھ م سنہ ۱۳۳۰ء میں اور قطب شاہی سلطنت کو عالمگیر نے ۱۶۸۷ء م ۱۰۹۱ھ میں فتح کیا

حیرت یہ ہے کہ ابو الحسن تانا شاہ (قطب شاہی گولکنڈہ کا آخری تاجدار) اور اورنگ زیب عالمگیر دونوں مدتوں ایک دوسرے کے حریف رہے لیکن جب موت کا وقت آیا تو ایک نے حضرت راجو قتال حسینی کے در پر دفن ہونے کی وصیت کی دوسرے نے حضرت زین الدین اور شیرازی کے قدموں میں رہنے کی وصیت کی اور یہ دونوں بزرگ خلد آباد میں چشتیہ سلسلے کے مشہور بزرگ اور حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کے عاشق زار تھے۔

اس وقت گفتگو تاجداروں کی نہیں ہے بلکہ ان "شاہان بے تاج" کی ہے جن کے در پر ہر تاجدار نے سر جھکایا ہے۔ اس سلسلے میں فتح گولکنڈہ کا حال بھی تاریخ کے حوالے سے سن لیجئے۔

اورنگ زیب عالم گیر نہایت مدبر، بہادر اور موقع شناس تھا۔ دکن میں وہ کئی

ایک معرکے سر کر چکا تھا لیکن گولکنڈے (موجودہ حیدر آباد آندھرا پردیش) کا یہ قلعہ اس کے لیے وبال جان بن گیا۔ مہینوں محاصرے کے بعد بھی وہ قطب شاہی فوج کو شکست نہ دے سکا حالانکہ یہ وہی اورنگ زیب ہے جس کے لیے دیوگری کا پہاڑی قلعہ کوئی چیز نہ تھا۔

عالمگیر جب محاصرے سے پریشان ہو گیا تو وہی تدبیر کی جو سلطان محمود غزنوی نے سومنات کے معرکے میں کی تھی۔ یعنی خاک پر سر رکھ کر کئی سجدے کیے اور خداوند قدوس سے مدد کا طالب ہوا اور اسی عالم میں اس کی پلک جھپک گئی۔ رات کو بشارت ہوئی کہ دو دن بعد رات کو ایک خوفناک آندھی آئے گی۔ تمام خیموں کے چراغ بجھ جائیں گے چھاؤنی میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے گا تم اس وقت باہر نکل کر دیکھنا جس خیمے میں "دیا" جلتا ہوا ملے وہیں چلے جانا۔ جو سپاہی وہاں موجود ہوں وہی تم کو قلعہ فتح کرنے کی کوئی تدبیر بتائیں گے۔"

اورنگ زیب عالمگیر نے اس رات کا انتظار کیا اور بحکم خدا ایسی سخت آندھی آئی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیا۔ لشکر کی ساری مشعلیں اور خیموں کے سارے چراغ بجھ گئے۔ اورنگ زیب اللہ کا نام لے کر باہر نکلا اور بشارت کے مطابق دیکھا کہ صرف ایک خیمہ ایسا ہے جہاں چراغ ان آندھیوں میں بھی جل رہا ہے۔ چہرہ خوشی سے تمتمانے لگا۔ دبے پاؤں خیمے تک گیا۔ وہاں دیکھا کہ اس کے لشکر کے دو سپاہی یوسف اور شریف کلام پاک کی تلاوت فرما رہے ہیں۔ چراغ جل رہا ہے لیکن ان کے چہرے کا نور چراغ پر غالب ہے۔ آہستہ سے اندر آیا اور ہاتھ باندھ کر باادب کھڑا ہو گیا۔

قرآن کی تلاوت کرنے والوں نے جب شہنشاہ کو اپنے سامنے دیکھا تو حیران رہ گئے۔ کلام پاک بند کیا اور چاہا کہ بصد احترام کھڑے ہو جائیں لیکن عالمگیر نے روکا اور خود ان کے آگے سر جھکا کر کہا۔ بندہ ناچیز حاضر ہے۔ بتائیے گولکنڈے کی مہم کیسے سر ہو گی؟

ان دونوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ راز فاش ہو چکا تھا چند لمحے تذبذب میں گذارے اور بڑی پر وقار اور مختصر سی گفتگو کے بعد کہا۔

اللہ کی مشیت کے آگے ہم اور آپ دونوں مجبور ہیں ۔ یہ کہہ کر پاس ہی سے ٹوٹے ہوئے گھڑے کی تین ٹھیکریاں اٹھائیں ۔ اس پر کنکریوں سے کچھ نقش بنائے اور فرمایا ۔ ان میں سے ایک آپ اس موچی کو دے دیں یا بھجوا دیں جو گولکنڈے کے قلعے کے اصل دروازے پر انتہائی غربت کی حالت میں بیٹھا ہے اور اجرت پر جوتے سی رہا ہے جب وہ وہاں سے اُٹھ جائے تو دوسری ٹھیکری کے اندر پھینک کر بھرپور حملہ کریں ۔ اس کے بعد تیسری ٹھیکری اندر پھینک دیں ۔ انشاء فتح کا دروازہ کھل جائے گا ۔

اورنگ زیب عالمگیر نے صبح کا انتظار کیا اور رات بھر یہی سوچتا رہا کہ گولکنڈے کے قلعے کے صدر دروازے پر بیٹھے ہوئے شخص کو کس کے ہاتھ یہ ٹھیکری پہنچاوے ۔ کون ایسا معتبر شخص ہو سکتا ہے جس کو اس اللہ والے کی خدمت میں بھیجوں جو قلعہ تھامے ہوئے ہے ۔ بڑی سوچ بچار کے بعد اورنگ زیب نے فیصلہ کر لیا کہ وہ خود عام آدمی کا بھیس بدل کر جائے گا ۔ اور یہ خدمت انجام دے گا ۔

چنانچہ جب یہ خفیہ اور عارفانہ پیام ان تک پہنچا تو انھوں نے قاصد کی صورت بغور دیکھی اور اپنا سامان کفش دوزی سمیٹ کر بولے ۔ "مشیت خداوندی یہی ہے کہ قلعے کے فتح ہونے کا وقت آچکا ہے اور ہم یہاں سے ہٹے جاتے ہیں ۔ اس کے بعد وہ مجذوبانہ انداز میں وہاں سے چل دئے اور عالمگیر نے اپنے سپاہیوں اور شریف کے کہنے پر عمل کیا اور قلعہ فتح ہو گیا ۔

اورنگ زیب عالمگیر نے میدان کارزار کے جس حصے میں فتح کی خبر سنی تھی وہ جگہ اور وہ میدان اب تک "فتح میدان" کہلاتا ہے ۔ اس خوش خبری کو سننے کے بعد وہ سیدھا اپنے محسنوں کے خیمے میں پہنچا ۔ دیکھا کہ کلام پاک بند کیا ہوا رکھا ہے اور دونوں کی روحیں قفس عنصری سے پرواز کر چکی ہیں ۔ افشائے راز کے بعد عارفوں کے لیے پردہ کرنا ہی مناسب ہے ۔ ان دونوں بزرگوں کے مزار اور بہت بڑی درگاہ اب بھی فتح میدان کے قریب موجود ہے اور حیدرآباد (اندھرا پردیش) کا رہنے والا شاید ہی کوئی ایسا فرد ہو جو یوسف صاحب اور شریف صاحب کے آستانے پر سر نہ جھکاتا ہو ۔ ان کے عقیدتمند

میں ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگ شامل ہیں ۔

ابوالحسن کا لقب تانا شاہ تھا ۔ (دکن کی زبان میں "تانا" بچے کو کہتے ہیں) نہایت نازک مزاج اور نفیس طبیعت بادشاہ تھا ۔ گولکنڈے کے قلعے میں "مشک محل" اس کی سب سے بڑی یادگار ہے ۔ پھولوں اور خوشبو کا یہ عاشق تھا ۔ اورنگ زیب سے شکست کے بعد جب یہ گرفتار ہوا تو چودہ برس تک دولت آباد کے قلعے میں "چینی محل" میں قید رہا ۔

غلام علی آزاد بلگرامی اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ ابوالحسن تانا شاہ نے چودہ برس لڑکپن میں گذارے ۔ چودہ برس تحصیل علم میں صرف کیے اور چودہ برس تک اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں گذار دیے ۔ چودہ برس بادشاہت کی اور چودہ برس دولت آباد کے قلعے کے اندر چینی محل میں قید رہ کر کاٹ دیئے ۔

حضرت راجو قتال حسینی کی درگاہ میں بہت سے مزارات ہیں ۔ مسجد سے متصل ایک چھوٹی سی چہار دیواری ہے جس میں نواب رحمت خان صوبیدار اورنگ آباد مدفون ہیں اور دوسری میں داؤد خان 'برہان پور' کے صوبیدار کی بھانجیوں کے مزار ہیں جن کے کٹہرے زیادہ بلند نہیں ہیں اور نہ چبوترے اونچے ہیں ۔ اس درگاہ کی بناوٹ اور مزاروں کے کٹہروں پر سنگ تراشی کا کام صاف بتاتا ہے کہ یہ 'فاروقی سلاطین' کے دور کی نہیں ہے ۔ بلکہ بہت بعد کو تعمیر ہوئی ہے ۔

تاج محل میں سنگ مرمر کو تراش کر نہایت نفیس جالیاں بنائی گئی ہیں اور ان مزارات کے گرد جو جالیاں ہیں وہ سنگ سرخ کو تراش کر بنائی گئی ہیں ۔ باہر اورنگ آباد کے گرد و نواح میں پایا جانے والا مضبوط اور سخت سیاہ پتھر کو تراشا گیا ہے جو خوبصورتی کے ساتھ ساتھ پائیداری میں بھی اپنی مثال آپ ہے ۔

جب سیاہ پتھر اور اس سے تراشی ہوئی نفیس جالیوں کا ذکر آگیا ہے تو اس مقبرے کو بھی دیکھ لیں جو سیاہ پتھر کا ہے اور اس کی جالیاں خوبصورتی میں اپنا جواب آپ ہیں اور یہ مقبرہ جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں راجو القتال حسینی کی درگاہ کے سامنے ہی ہے اور اس کے اندر ملک عنبر حبشی آسودہ خواب ہے ۔

ملک عنبر حبشی

ہمارے معاشرے میں اگر کسی "ولی" یا "درویش" کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے مزار پر چڑھاوے چڑھیں۔ لوگ ان کی چوکھٹوں پر مرادیں مانگیں اور ہر سال ان کا عرس ہو اور ایک میلا لگے تو بیچارا ملک عنبر حبشی نہ کوئی ولی ہو سکتا ہے اور نہ پیر مرد، کیونکہ اس کا مزار ایک بڑے سے احاطے میں ایک سیاہ رنگ کے گنبد میں بنا ہوا ہے جو دور سے نظر آتا ہے لیکن اگر اللہ کی رضا اور اس کے رسولؐ سے بے پناہ محبت کے ساتھ جذبہ خدمت خلق کو بھی عبادات میں شامل کر لیا جائے تو ملک عنبر کا شمار بھی ایک حریت پسند درویش میں ہوگا جس کا دل پیاسوں کی پیاس سے تڑپتا تھا جو آب رسانی کے معاملے میں بہت بڑا انجینئر تھا۔

ملک عنبر، حبشہ، کا رہنے والا تھا۔ بچپن ہی میں بردہ فروشوں کے ہاتھ چڑھ گیا۔ انھوں نے اس کی دیکھ بھال اور پرورش کی۔ اس کے بعد حج کے زمانے میں اس کو مدینہ منورہ لے آئے تاکہ وہاں اس کے اچھے دام لگا کر کسی رئیس کے ہاتھ فروخت کر دیں۔ ملک عنبر شروع ہی سے بردبار، سمجھدار اور خدا ترس جوان تھا۔ رات کو جب سرزمین عرب پر بکاؤ مال کی طرح سو گیا تو اس کو خواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی کہ ملک عنبر تو آج خاک نشیں ہے لیکن کل تیرے سر پر تاج شاہی ہوگا۔ اور تجھے موت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک خلق خدا کے لیے کوئی بہت بڑا کام نہ انجام دے لے۔

ملک عنبر جب بیدار ہوا تو سخت تذبذب میں تھا۔ عقیدت رسولؐ کہتی تھی کہ خواب سچا ہے اور حالات کا تقاضا تھا کہ زبان بند رکھے۔ اس لیے اس نے دو ایک دن

خاموشی میں گذار دیئے۔

اتفاق کہیے یا مشیت خداوندی اسی سال نظام شاہی احمد نگر کا فرماں روا مرتضےٰ نظام شاہ حج بیت اللہ کے لیے آیا ہوا تھا۔ اس کی نظر ملک عنبر پر پڑی۔ فوراً اس کو منہ مانگے داموں خرید لیا اور ہندوستان میں اپنے دارالخلافے احمد نگر میں لے آیا۔

ملک عنبر اپنی غیر معمولی فراست اور خداداد صلاحیتوں کی بنا پر بہت جلد درباریوں میں شامل ہو گیا۔ اس نے ہندوستان کی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا اور مغلوں کی جنوبی ہند پر بار بار یورشس کے مدنظر اس نے فیصلہ کر لیا کہ میں دکن کو شمالی ہند کا غلام نہیں بننے دوں گا چنانچہ اورنگ زیب عالم گیر کو تنگ کرنے والے چھاپہ مار مرہٹے تھے سب اسی کے تربیت یافتہ تھے۔

نظام شاہی دور کے خاتمے کے اس نے اپنی چھوٹی سی خود مختار سلطنت قائم کر لی اور دیوگری سے تھوڑی دور کے فاصلے پر "کھڑکی" کے مقام پر (جو اب اورنگ آباد) ہے نیا شہر بسایا اور یہی شہر اس کی ذہانت اور غیر معمولی سائنسی دماغ کا شاہکار ہے ملک عنبر کا بسایا ہوا فتح نگر جو بعد کو اورنگ آباد کہلایا اس دور کے شہروں میں اپنا جواب آپ تھا۔ ملک عنبر سب سے بڑا کارنامہ خلد آباد اور دولت آباد کی پہاڑیوں کا مطالعہ اور وہاں کے زیر زمین پانی کی سطح کی دریافت تھی۔ چنانچہ اس نے ایک پہاڑی مقام پر جہاں سے یہ اپنی "نہر" جس کو عرف عام میں "نہر عنبری" کہتے ہیں لے کر چلا ہے وہاں کے متعلق تاریخ میں لکھا ہے کہ اس نے وہاں پر پہلے دو رکعت نماز ادا کی اور ایک پتھر جس پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا نقش قدم ثبت تھا نصب کیا۔ اس مقام کا نام "قدم رسول" رکھا اور اپنے ایک ساتھی اوصاف علی کے ساتھ مکہ معظمہ کے قریب "نہر زبیدہ" (ہارون رشید کی ملکہ) کے نمونے پر یہاں سے نہر بنانا شروع کی۔ یہ مقام "قدم رسول سے پہلے قرسول" اور بعد کو "ہرسول" بن گیا اور اب تک یہی نام ہے۔ یہ عجیب و غریب نہر بالکل خود کار تھی۔ نہ کبھی اس کی پائپ لائن چھٹتی تھی نہ ذخیرہ آب ختم ہوتا تھا اور نہ اس قدرتی نہر کے پانی کو کلورین وغیرہ سے صاف کرنے

کی ضرورت پیش آتی تھی ۔ اس نہر کا تاریخی نام "خیر جاریہ" ہے ۔ اس نہر کے پانی سے اورنگ آباد کی مسجدیں، مندر، خانقاہیں، دھرم شالے، دفاتر، سرکاری عمارتیں، رہائشی مکانات سیراب ہوتے تھے ۔ اس نہر کے نہ ختم ہونے والے پانی سے اورنگ آباد میں بیسوں باغات کی آبیاری ہوتی رہی ۔ جس میں منی بیگم کا باغ، بندے حسن کا باغ، انگوری باغ، شاہی باغ، حمایت باغ اور نہ جانے کتنے گلزار بے خزاں شامل تھے۔

یہ ملک عنبر کا اعلیٰ ذوق اور حسن کارکردگی تھا کہ اس نے اپنی بستی اس طرح بسائی کہ ہر چھوٹے سے لے کر بڑے گھروں تک پانی کے لیے ایک حوض موجود تھا۔ کوئی مکان چبوتروں اور حوض سے خالی نہ تھا۔ ہر حوض میں رواں دواں فوارے تھے اور انکے گرد پھولوں کی کیاریاں ۔ اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ وہاں پر اپنا بچپن گذارنے والے اور وہاں کی صحت بخش آب و ہوا میں پلنے والے یہ تصور تک نہیں کر سکتے کہ کوئی گھر بغیر حوض اور فوارے کے مکمل ہو سکتا ہے ۔ یہ حوض چوکور، گول، بیضوی، کشتی نما، کٹورے نما، پھول نما چھوٹے بڑے ہر سائز کے تھے جن میں ان کی جسامت کے مطابق ایک سے لے کر پانچ چھ فوارے لگے ہوتے تھے۔

ملک عنبر کی بنائی ہوئی عمارتیں بھی مضبوطی اور پائیداری میں اپنا جواب نہ رکھتی تھیں ۔ اس دور کے جس مکان کو دیکھئے اس میں محرابوں والے اکہرے، دوہرے یا تہرے دالان چبوترے، سہ نشین ضرور ملے گی ۔ چراغوں کے لیے بے شمار طاق اور برسات کے پانی کی بوچھاڑ سے بچنے کے لیے چوڑے چوڑے چھجّے تھے جن میں کنگورے دار کنارے تھے ۔ ان پر برسات کا پانی ہیرے کی کنی کی طرح چمک چمک کر موتیوں کی ٹوٹی ہوئی لڑی کی طرح نیچے آتا رہتا ہے۔

غرض کہ یہ ساری بہاریں ملک عنبر کی لائی ہوئی تھیں ۔ سڑکیں پختہ نالیاں اور مکانات اتنے پائیدار ہیں کہ اس وقت سے لے کر تادم تحریر جوں کے توں ہیں۔ ان کو کھود کر دوسرا شہر آباد کرنا اتنا کثیر المصارف منصوبہ ہوگا کہ کوئی حکومت اب یہ خرچ برداشت نہیں کر سکتی لہٰذا نئی بستیاں اسی لیے باہر آباد ہوئی ہیں ۔ اگر مورخ یہ لکھے تو بیجا نہ ہوگا کہ اورنگ زیب

کو "فتح نگر" کے نام سے ایک بنا بنایا شہر مل گیا تھا جس میں اس نے صرف نام تبدیل کر دیا۔

ملک عنبر کا محل "نوکھنڈہ" عالمگیر نے جوں کا توں رہنے دیا۔ اپنا دربار وہیں سجایا اور بعد کو یہ نظام الملک آصف جاہ کا محل بنا ان کی "گدی" اب تک موجود ہے اور اب وہاں پر آزاد گرلز کالج قائم ہے۔

ملک عنبر کی یہ نہر ۱۹۳۹ء تک اورنگ آباد کو سیراب کرتی رہی اور کبھی کوئی وبائی مرض وہاں نہیں پھیلا۔ اب بھی اس کا ایک حصہ باقی ہے۔

ملک عنبر صوفی منش اور درویش صفت ہے۔ اگر اس کے شہری نظام کو دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس میں اسکی ذہانت کے ساتھ ساتھ خدمت خلق کا جذبہ، خلوص نیت اور تائید غیبی بھی بڑی حد تک شامل تھی۔

اس کا مقبرہ سیاہ پتھر کا بنا ہوا ہے ۔ اس کا گنبد بھی سیاہ پتھر کا ہے اور تراش وخراش کے معاملے میں بڑا نادر اور نفیس ہے ۔ چہار دیواری پتھر کی ہے لیکن چاروں طرف سیاہ پتھروں سے ترشی ہوئی نفیس جالیاں ہیں ۔ جن کی تراش خراش تاج محل کی جالیوں سے ملتی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ اس نمونے پر تراشی گئی ہیں لیکن سنگ سیاہ ہونے کی وجہ سے نہ وہ میلی ہوتی ہیں اور نہ خراب۔

ان جالیوں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت سنگ تراشی اپنے معراج کمال پر تھی ۔ انتہا یہ ہے کہ دروازے بھی پتھر کے ہیں ۔ ان کی چولیں بھی پتھر کی ہیں اور زنجیر اور کنڈی بھی پتھر ہی سے تراش کر بنائی گئی ہے ۔ قبر بھی سیاہ پتھر کی ہے جو بالکل سادہ ہے ۔ اس پر کسی قسم کی نقاشی نہیں ہے۔

ایسا لگتا ہے جیسے ملک عنبر نے اپنی زندگی میں ہی یہ مقبرہ بنوایا تھا ۔ موجودہ دور کے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ملک عنبر یہاں دفن نہیں ہے بلکہ اس کو مسافر شاہ اور حضرت پلنگ پوش کے مزار یعنی پن چکی (جس کا ذکر آگے آئے گا) کے کسی گوشے میں دفن کیا گیا ۔ واللہ عالم بالصواب۔

بہر کیف سیاہ پتھر کا یہ مقبرہ اب بھی اسی کے نام سے موسوم ہے۔ دن کے وقت یہ بہترین تفریح گاہ ہے۔ جہاں برسات میں بڑی فرحت ملتی ہے لیکن شام بڑی بھیانک ہوتی ہے۔ بقول شخصے ـ

بر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

حضرت بُرہان الدین غریب

حضرت راجو قتال حسینی کے مزار مبارک سے لوٹ کر اگر ہم واپس خلد آباد کی بستی میں آئیں تو آمنے سامنے دو درگاہیں نمایاں نظر آئیں گی جو حضرت برہان الدین غریب اور حضرت زین الدین شیرازی کی ہیں۔ ان کا سرسری ذکر میں پہلے ہی کر چکی ہوں۔

یہ دونوں درگاہیں بہت بلند چبوتروں پر بنی ہوئی ہیں۔ ان کی وسعت اور ان کا استحکام ان کی تعمیر ہندوستان کی کسی درگاہ سے مماثلت نہیں رکھتی۔ سڑک پر مغرب کی جانب حضرت برہان الدین غریب کا مزار ہے۔ سیڑھیوں کے فوراً بعد ایک رعب آفریں پھاٹک اور اس کے ساتھ ایک بر دتھے نما کمرہ ہے جس پر چھوٹا سا گنبد ہے اندر چھت مدور ہے اس میں ایک پھاٹک باہر سے اندر آنے کا ہے اور دوسرا بجانب شمال درگاہ کے اندر داخل ہونے کا ہے باقی دونوں سمتوں میں پتھر کی مضبوط نشستیں بنی ہوئی ہیں جس پر خدّام اور پہرہ دار دیگر سائیں کے ساتھ ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ اس کے ایک طرف نقار خانہ ہے جو چشتیہ سلسلے کی درگاہوں کا نشان امتیاز ہے۔ اندر داخل ہونے کے بعد ایک بہت بڑا چوکور احاطہ ہے جس کا پکا فرش سیاہ پتھروں کی جڑائی سے بنا ہوا ہے۔ اس کے داہنے اور بائیں دوہرے دالانوں کی نہایت پائیدار خانقاہیں جو بیک وقت ہزاروں آدمیوں کو اپنے دامن میں چھپا سکتی ہیں۔ "چھتے" یا پھاٹک کے ساتھ مشرق کی طرف جو دو منزلہ خانقاہ ہے اس کو اب دینی مدرسے میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اس کا نام "مدرسہ برہانیہ" ہے۔ یہ دو رویہ خانقاہیں چوکور اور مضبوط ستونوں پر کھڑی ہیں اور ہر چار ستونوں کے مربع حصے کے اندر چھت مدور اور الماس تراش ہے۔ ان کی دیواریں

نہایت سفید اور چکنی ہیں اور چھت میں کبوتروں کے قیام و طعام کا نہایت عمدہ بندوبست کیا گیا ہے۔

جب ہم ان دو رویہ خانقاہوں سے گذر کر اس مستطیل صحن کے نصف حصے میں پہنچتے ہیں تو یہاں سے پھر کرسی بلند ہو جاتی ہے۔ دو تین سیڑھیاں چڑھنا پڑتی ہیں اور ان سیڑھیوں کے ساتھ ساتھ اس مستطیل صحن کی پوری لمبائی کو دو حصوں میں تقسیم کرنے والی ایک محراب دار دیوار ہے۔ محراب دار دیوار یعنی نئی اصطلاح ہو گی لیکن میں اس کے لیے کوئی اور اصطلاح وضع نہ کر سکی۔ پوری چوڑائی میں آٹھ یا دس ستون ہیں اور ہر دو ستونوں کے درمیان گذرنے کے لیے محراب ہے۔ اس کو آپ بغیر چھت کے دالان کا سامنے والا در بھی کہہ سکتے ہیں۔ غالباً سماع کی محفلوں میں اس پر شامیانہ لگایا جاتا ہو گا۔ اس طرح پہلا دو صحن کا اور دوسرا بارہ دری کا منظر پیش کرتا ہو گا۔ ظاہر ہے کہ اگر اس پورے حصے پر چھت ڈال دی جاتی تو دم گھٹنے لگتا۔ فضا کند ہو جاتی اور اس کا حسن ختم ہو جاتا۔

اس حصے کو طے کرنے کے بعد پھر چار پانچ سیڑھیاں چڑھنا پڑتی ہیں اور ہم مغرب کی سمت ایک بڑے سے مسجد نما دالان میں داخل ہو جاتے ہیں جہاں نماز بھی پڑھی جا سکتی ہے۔ یہاں پھر وہی در چاک ملتا ہے یعنی دروازہ جو مسجد کے اندر سے گذر کر اصل درگاہ تک جاتا ہے۔

یہاں درگاہ ایک وسیع احاطہ ہے جس کے بیچ میں حضرت برہان الدین غریب کا حجرہ مبارک ہے۔ مغرب کی سمت ایک خوبصورت سی مسجد ہے جس سے متصل ایک چبوترہ ہے جس کی چہار دیواری سے اگر ہم شمال کی سمت دیکھیں تو نیچے درگاہ کی بلندی سے پہاڑ کی وادی میں ایک نہایت حسین و دلفریب عمارت نظر آئے گی جس کا نام بینی بیگم کا باغ ہے۔ اتنا خوبصورت اور عمارت اتنی منفرد ہے کہ گھنٹوں دیکھنے کے بعد بھی جی نہیں بھرتا۔

درگاہ کے دوسرے گوشے میں ایک چھوٹا سا حجرہ ہے جس میں بصد عزت و احترام ۱۳۳۰ھ میں حکومت نظام نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک اور

اور آثار محفوظ کیے ہیں اور ہر سال ۱۲ ربیع الاول کو ہزاروں محبانِ رسولؐ ان کی زیارت کرتے ہیں۔

حجرے کے پائینتی جس کے بالکل قریب دو مزار بہت نمایاں ہیں۔ یہ دونوں حضرت برہان الدین غریب کے ہمشیر زادوں مولانا عبد اللطیف اور عبد الکریم کے ہیں۔

حجرے کے جنوب میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ ایک حوض ہے جس میں کبھی پانی لہریں لیتا تھا اور فوارے موتی لٹاتے تھے۔ زائرین یہیں وضو کرتے تھے لیکن ۱۹۸۵ء میں نہری نظام کی بربادی کے بعد اس کو چبوترے میں تبدیل کیا جا رہا تھا۔

حوض کے مغرب میں حضرت کے ہمشیر زادگان کے مزاروں کے بعد چہار دیواری میں میر قمر الدین خان نظام الملک آصف جاہ اول (بانی سلطنت آصفیہ) اور ان کی بیوی سیدہ زیب النساء کا مزار ہے جو حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی پوتی ہیں۔

اس کے بعد اسی رخ پر ایک کھلی (بغیر چھت والی) بارہ دری میں جو اصحاب مدفون ہیں ان کے نام یہ ہیں۔

۱۔ نواب ناصر جنگ شہید اور ان کی بیوی پاشا بیگم۔
۲۔ آصف جاہ کے بڑے بیٹے غازی الدین فیروز جنگ
۳۔ آصف جاہ کی برہان پوری بیگم ان کے نواسے مظفر جنگ اور ان کی بیوی۔
۴۔ آصف جاہ کے بیٹے صلابت جنگ اور انکی بیوی

اسی طرح حوض کے مشرق میں ایک چبوترہ سرخ پتھر کا ہے اور دوسرا سیاہ پتھر کا ایک پر آصف جاہ کی دیگر بیگمات دفن ہیں اور دوسرے پر اورنگ زیب عالمگیر کا کوئی بیٹا آسودہ خواب ہے جس کا نام شہزادہ معصوم ہے۔

حوض کے جنوب میں آصف جاہ کی دونوں بیٹیاں اور داماد عوض خان اور عبدالقادر دفن ہیں اور انھیں کے قریب نظام شاہی ملکہ کی کوئی ملکہ ہے۔

اس شاہی خاندان کے مزاروں کی تفصیلات دینے سے میرا یہ مقصد ہے کہ قارئین کو بیک نظر یہ اندازہ ہو جائے کہ سلاطین آصفیہ کو خواجگان چشت اور خصوصاً

برہان الدین غریب سے کس قدر والہانہ عقیدت تھی کہ انکی ساری ذریت آپ ہی کے قدموں میں آسودہ ہے۔ کیا اب بھی ان بے تاج بادشاہوں کے جاہ وحشم سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے؟

دنیائے اقتدار کے ان تابندہ ستاروں کے بعد آیئے ہم پھر ان درویشوں کا جائزہ لیں جو حشر تک ان شاہان سلف کے پہلو بہ پہلو آسودہ خواب رہیں گے۔

حوض کے مشرق کی سمت پانچ مزارات بہت زیادہ نمایاں ہیں جن کے نام یہ ہیں۔

۱۔ منظور الاولیاء حضرت کاکا شاد بخت شیرازی

۲۔ مقبول الاخیار حضرت خواجہ خیر الدین

۳۔ خواجہ مقبول ۴۔ خواجہ عبدالرحمٰن

۵۔ خواجہ جلدک

حوض کے جنوب میں ایک نمایاں دروازہ ہے جو ایک اور احاطے میں کھلتا ہے۔ اس میں دو خانقاہیں۔ ایک مسجد اور ایک حجرہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت برہان الدین اولیاء کا مطبخ تھا۔ مسجد کے قریب گنبد میں میر تقی اور میر غنی کے مزارات ہیں۔ مشرق میں ایک چبوترے پر حضرت برہان الدین کی نانی بی بی آسیہ اور سوتاقی بی بی کلثوم کا مزار ہے۔ مسجد کی دوسری سمت کمانوں کے درمیان جن کے مزارات ہیں ان صاحب کے نام یہ ہیں۔

۱۔ حضرت رکن الدین کاشانی ۲۔ مجید الدین کاشانی

۳۔ برہان الدین کاشانی ۴۔ عماد الدین کاشانی

یہ چاروں اصحاب اور ان کے ساتھی مولانا فضل اللہ، مولانا شمس الدین مولانا محمد لشکری حضرت زین الدین شیرازی خلیفہ حضرت برہان الدین کے مریدوں میں ہیں۔

یہ حصہ بی بی بیگم کے باغ اور لال باغ سے متصل ہے جہاں اورنگ زیب عالمگیر کے بڑے بیٹے شہزادہ اعظم کے بڑے لڑکے محمد بیدار بخت کی بیوی "جہاں بانو" آرام کر رہی ہے۔ اس باغ کا رقبہ بہت بڑا ہے جس کے چاروں کونوں پر چار مضبوط مینار نما برج ہیں

اور ان کے درمیان احاطے کی دیوار اس قدر مضبوط اور چوڑی ہے کہ یہی لگتا ہے کہ جیسے یہ کسی قلعہ کی دیوار ہو۔ اس بڑی سی چہار دیواری کے چاروں سمت حسینی باغ اور پھل والے درخت ہیں اور درمیان میں ایک سرخ پتھر کا نہایت نفیس مستطیل تالاب ہے جس کی گہرائی زیادہ نہیں ہے۔ اس کو حوض بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے مشرقی سمت کی عمارت منہدم ہو چکی ہے البتہ مغربی سمت سنگ مرمر کی ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد ہے۔ جنوب میں سنگ سرخ کی ایک بارہ دری ہے جس کے منقش بام و در جوں کے توں ہیں اور اس کے ساتھ ایک چبوترہ اور ایک چھوٹا سا حوض ہے۔ شمال کی سمت ایک دیو پیکر پھاٹک ہے جہاں سے اندر جانے کا راستہ ہے۔

یہ باغ اپنی تعمیر کے اعتبار سے منفرد ہے کیونکہ سنگ سرخ کی بارہ دری کے اطراف جو باغ ہے اس کی روشیں اور دیواریں سب سرخ ہیں اور اسی لیے اس کو لال باغ کہتے ہیں۔ مرکزی حوض یا مستطیل تالاب میں سنگ سرخ کی جڑائی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ حوض کے چاروں کونوں میں چار چھوٹی چھوٹی سہ نشین اور خوبصورت برجیاں ہیں اور ہر برجی کے اندر سے حوض میں اندر اترنے کا راستہ ہے۔ حوض کے عین مرکز میں ایک 'جوف' ہے۔ جس کے اندر جہاں بانو بیگم بیدار بخت کا مزار ہے جو سنگ سرخ کا ہے۔ یہ عجیب دغریب مقبرہ اور یہ نئی انوکھا طرز تعمیر یہیں ملے گا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنا بڑا مقبرہ، اتنا حسین باغ، اتنی نادر تعمیر ایسے گوشے میں کوئی ہے جہاں عام آدمی کا گذر بھی نہ ہو؟ اگر یہ عمارت شہر میں ہوتی یا خلد آباد کے کسی نمایاں مقام پر ہوتی تو نہ جانے کتنے سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنتی! سنگ سرخ کی بارہ دری چبوترہ اور فواروں والے حوض کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ رہائشی محل ہوگا۔ کیونکہ اس کے منہدم شدہ حصے بھی اس کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہاں مطبخ کے ملازمین کے مکانات ہونگے اور جہاں بانو عرف بی بی بیگم یہاں اپنی زندگی میں رہا کرتی ہونگی اور بعد کو ان کو وہیں دفن کر دیا گیا ہوگا۔

بہرکیف یہ 'دونوں' یعنی شہزادہ بیدار بخت اور جہاں بانو دونوں اپنی زندگی میں

وہیں رہتے ہوں یا بعد کو جہاں بانو ؒ کا مقبرہ وہاں اس کی وصیت کے مطابق تعمیر کیا ہوگا۔ دونوں صورتوں میں اس شاہی خاندان کے افراد کی حضرت برہان الدین غریب سے بے پناہ عقیدت اور خواجگان چشت سے والہانہ محبت ظاہر ہوتی ہے۔ ورنہ یہ دلفریب عمارت جس پر زر کثیر خرچ ہوا ہے حضرت برہان الدین کے قدموں میں نہ بنائی جاتی۔ خود بیدار بخت بھی وہیں مدفون ہے اور شہزادہ اعظم اپنے والد اورنگ زیب عالمگیر سے تھوڑے فاصلے پر حضرت زین الدین شیرازی کے قدموں میں ہے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس وسیع اور عریض باغ اور اس کے بڑے حوضوں کو وہ نہر سیراب کرتی ہے جو حضرت شاہ خاکسار صاحب کے تالاب سے کاٹ کر یہاں لائی گئی ہے۔

حضرت برہان الدین غریب کی ولدیت اور سلسلۂ نسب وہی ہے جو انکے چھوٹے بھائی حضرت منتخب الدین زر زری زر بخش کا ہے کیونکہ یہ دونوں حضرت محمود ہانسوی کے فرزندان ارجمند ہیں۔ آپکی ولادت باسعادت ۶۵۲ھ م ۱۲۵۴ء کو ہانسی ؒ کے شہر میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نام برہان الدین، خطاب بایزید، اور لقب غریب ہے۔ آپ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء کے خاص مریدوں میں تھے جن کو اپنے پیر و مرشد کی طرف سے نہ صرف خلافت ملی تھی بلکہ آپ نے اپنا خرقہ اور دیگر تبرکات بھی عطا کیے تھے۔

آپ کے والد جناب محمود ہانسوی اور والدہ بی بی ہاجرہ عبادت گذار متقی اور پرہیزگار تھیں۔ اس لیے سعادت مندی اور ہونہاری کے آثار آپ میں بچپن ہی سے تھے۔ جب آپ کی عمر چھ برس کی ہوئی تو آپ نے تنہائی میں اللہ کا ذکر کرنا شروع کر دیا تھا اور صوم و صلوٰۃ کی پابندی کے ساتھ ساتھ جب آپ تیرہ برس کی عمر کو پہنچے تو اپنی خوراک گھٹا کر صرف سات لقمے کر دی اور اسی وقت سے عہد کر لیا کہ میں اپنی ساری زندگی عبادت میں صرف کروں گا۔ اور تجرد کی زندگی گذاروں گا۔ آپکی ریاضت اور مجاہدے کا یہ عالم تھا کہ پچیس ۲۵ برس تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی اور تیس ۳۰ برس تک مسلسل روزے رکھے فجر کی نماز کے بعد مقررہ اور تسبیحات کے علاوہ سو رکعت صلوٰۃ التحفہ اور اٹھارہ رکعت چاشت کی نماز ادا کرتے پھر تین سپارے قرآن مجید کے پڑھنے کے بعد زیارت قبور

کے لیے جاتے اور ایک ہزار مرتبہ سورہ اخلاص پڑھتے۔ عشاء کی نماز باجماعت تہائیٔ رات کے بعد ادا کرتے۔

ذکر الٰہی اور مجاہدہ نفس کی وجہ سے آپ کا دل آئینہ تھا۔ کشف باطن میں ہر بات آپ پر عیاں ہو جاتی۔

ظاہر ہے کہ جس شخص کے لیل و نہار خدا کی یاد میں گذرتے ہوں، اس کو دنیا سے کیا کام؟ تاہم آپ کی والدہ بی بی ہاجرہ چاہتی تھیں کہ اور مردوں کی طرح آپ کا بھی گھر آباد ہو۔ آپ نہ ماں کے حکم کو ٹال سکتے تھے اور نہ یاد الٰہی میں کسی اور کو خلل ڈالنے کی اجازت دے سکتے تھے۔ لہذا آپ نے غذا میں اور زیادہ قلت کر دی یہاں تک کہ آپ کی نقاہت دیکھ کر آپ کی والدہ نے یہ خیال ترک کر دیا۔ آپکی کمزوری کا یہ عالم تھا کہ آسمان کی طرف بڑی مشکل سے سر اٹھا سکتے تھے۔

آپ نے ۱۹ برس کی عمر میں اور بعض روایات کے مطابق ۲۹ برس میں حضرت محبوب الٰہی سے بیعت کی اور فرمایا کہ میں نے اس بیعت سے پہلے خواب دیکھا تھا کہ میں ایک گہرے گڑھے میں گر پڑا ہوں اور باوجود کوشش کے باہر نہیں نکل سکتا تھا یہاں تک کہ حضرت سلطان المشائخ نظام الدین تشریف لائے اور اپنا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دے کر آپ کو اس گڑھے یا خندق سے نکال لائے۔

حضرت محبوب الٰہی نے یہ خواب سُن کر تبسم فرمایا اور بڑی شفقت سے کہا "برہان الدین ہم نے اسی دن تجھ کو اپنا ہاتھ دے دیا تھا جس روز تو نے یہ خواب دیکھا تھا۔

حضرت برہان الدین غریب نے سلطان المشائخ کی خدمت میں عرض کیا کہ "حضور آپ کے پیر و مرشد بابا فرید الدین گنج شکر نے آپ پر بڑی عنایتیں کی ہیں۔ آپ ایک نظر عنایت مجھ پر بھی فرما دیں جس کا میں اُمید وار ہوں۔

جواب دیا "میں جانتا ہوں کہ تم امیدوار ہو! لیکن چاہتا ہوں کہ اور زیادہ امیدوار ہو، یعنی طلب بڑھاتے رہو جہاں تک طرف اجازت دے کیونکہ

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

آپ کی اس طلب اور سلطان المشائخ کے اس جامع اور ساتح جواب سے اندازہ ہوتا ہے کہ راہ سلوک میں سب سے اہم اور اصل چیز طلب ہے۔

آپ کا خطاب "بایزید" تھا۔ ظاہر ہے کہ حضرت بایزید بسطامی کس پائے کے عارف تھے اور بزرگان دین میں ان کا کیا درجہ تھا اس سے کوئی واقف نہیں۔ ان سے کسی شخص کو نسبت دینا اس شخص کے لیے انتہائی خوش نصیبی ہے اور یہ خطاب حضرت برہان الدین ایک روز حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی کے دربار میں حضرت بایزید بسطامی کا ذکر نہایت ادب و احترام کے ساتھ ہو رہا تھا۔ جب یہ ذکر ختم ہوا تو حضرت محبوب الٰہی نے فرمایا "ہم بھی ایک بایزید رکھتے ہیں۔"

ایک دوست نے عرض کیا وہ کہاں ہیں؟ کیونکہ سب کو اشتیاق تھا کہ حضرت محبوب الٰہی نے یہ بات کس کے لیے فرمائی ہے۔ "آپ نے جواب دیا۔ وہ اس وقت جماعت خانے میں ہے"۔ اقبال نامی ایک خادم شوق اور تجسس میں جماعت خانے گیا کہ دیکھے کہ وہ خوش نصیب کون ہے۔ وہاں سوائے حضرت برہان الدین کے کوئی دوسرا نہیں تھا۔ اس روز سے آپ کو یہ خطاب مل گیا۔

"غریب" کا لقب اس طرح مشہور ہوا کہ جب آپ اپنے وطن ہانسی سے دہلی تشریف لائے تو انتہائی سادہ پر قناعت اور فقیرانہ زندگی بسر فرماتے تھے۔ آنے کے بعد ایک چھوٹی سی مسجد میں قیام کیا اور یاد الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ ہر چند اپنے آپ کو چھپایا لیکن نور معرفت ظاہر ہو کر رہا۔ مخلوق خدا آپ کی طرف رجوع ہونے لگی۔ ساری خلقت آپ کے گرد جمع ہو گئی لیکن اس دوران اپنے پیر و مرشد کے یہاں آمد و رفت جاری رکھی۔ ایک روز جب آپ سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہی کی خدمت میں حاضری کے لیے گئے تو اقبال نامی خادم نے عرض کیا کہ "آپ سے ملاقات کے لیے حضرت برہان الدین غریب تشریف لائے ہیں۔"

یہ بات سن کر حضرت محبوب الٰہی نے فرمایا۔ ساری مخلوق ان کی آشنا ہے اور

وہ اب بھی غریب ہیں۔ اس روایت کو مولف سیر الاولیاء نے بیان کرتے ہوئے سچ کہا ہے کہ ؎

غریب است ایں محب حق بدنیا

حبیب اللہ فی الدنیا غریب

اس کے بعد ان کے لقب "غریب" پر مہر صداقت پر ثبت ہو گئی۔ آپ کو اپنے پیر و مرشد سے والہانہ محبت تھی۔ یقین محکم اور عمل پیہم نے آپ کو اپنے ساتھیوں میں امتیازی درجہ دیدیا تھا۔ ادب کا یہ حال تھا کہ آپ گھر میں ہوں یا حالت سفر میں کبھی غیاث پور کی طرف پیر پھیلا کر نہ لیٹے نہ بیٹھے نہ ادھر پشت کی اور نہ اس طرف منہ کر لعاب دہن زمین پر ڈالا کیونکہ غیاث پور ہی حضرت محبوب الٰہی کا مسکن تھا اور آخر میں مدفن بھی وہیں بنا اور غالباً اسی ادب نے آپ کو اتنے بلند مقام پر پہنچایا۔ بقول اقبال ؎

ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

اسی ادب و احترام کی وجہ سے آپ حضرت محبوب الٰہی کی نگاہوں میں بھی محبوب و محترم ہو گئے چنانچہ غریب الکرامات میں سراج السلوک کے حوالے سے یہ بات کہی گئی ہے کہ حضرت سلطان المشائخ نظام الدین محبوب الٰہی نے فرمایا۔

"میرے فرزند مولانا برہان الدین کی محبت میں جو رہے گا وہ بھی مقبول خلائق اور صاحب حشمت ہوگا۔ ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا۔ "برہان ہمارا مجموعہ ہے" یعنی میرے اخلاق و عادات نعمتوں اور علوم لدنی کا مجموعہ ہے۔

جس وقت دیوگیری یعنی دولت آباد میں حضرت خواجہ منتخب الدین زر زری زر بخش کا وصال ہوا تو سب سے پہلے اس کا علم بذریعہ کشف حضرت محبوب الٰہی کو ہوا کیونکہ انھیں کی ہدایت پر آپ سات سو پالکیاں چودہ سو اولیا کی لے کر دیوگیری گئے تھے۔ حضرت محبوب الٰہی اپنے سعادت مند اور ہونہار مرید کی وفات پر تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ اس کے بعد حضرت برہان الدین غریب انکی خدمت میں آئے تو آپ نے ان سے سوال کیا۔

برھان الدین تمہارے چھوٹے بھائی منتجب الدین کی عمر کتنی ہوگی ؟ یہ سوال بڑا معنی خیز تھا۔ آپ نے بھی مراقبہ کیا اور بات کی تہہ کو پہنچ گئے۔ جواب میں بڑے صبر اور تحمل سے کہا چونتیس یا پینتیس سال اور پھر گھر آکر بھائی کے لیے رنجیدہ اور افسردہ بیٹھ گئے۔ حضرت محبوب الٰہی بہ نفسِ نفیس انکی خدمت میں آئے۔ اس وقت انکی والدہ بی بی ہاجرہ حیات تھیں۔ ان کو تسلی دلاسا دیا۔ اپنے مرید کے لیے ختم پڑھی اور دعائے مغفرت فرمائی۔ اور چند دنوں بعد مولانا برہان الدین غریب کو اپنا خرقہ خلافت مرحمت فرمایا اور دکن کی ولایت دے کر دولت آباد رخصت کیا۔

حضرت برہان الدین غریب کے ساتھ دہلی سے دکن آنے والے اولیاء اور حضرت محبوب الٰہی کے مریدوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ بہرکیف آپ اپنے احباب و اصحاب کے ساتھ یہاں آئے اور پر فضا پہاڑی پر قیام فرمایا۔ جہاں اب آپ کا مزار مبارک ہے یہاں آپ نے نہ صرف قرآن و حدیث کے مطابق اپنی زندگی گذاری بلکہ اپنے پیر و مرشد کے نقشِ قدم پر تاحیات چلتے رہے۔ آپ کے ملفوظات اور آپکی تعلیمات دنیائے تصوف میں گوہر شب چراغ ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ نے جو کچھ فرمایا اس پر پہلے خود عمل کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپکی باتیں، آپکی نصیحتیں فلسفیانہ تدبر اور تفکر کی جان ہیں۔

آپ کے متعلق حضرت وجیہہ الدین یوسف (جن کی وساطت سے آپ سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہی کی خدمت میں پہنچے تھے اور جو کیلوکری (غیاث پور) کے رہنے والے تھے) فرماتے ہیں کہ حضرت برہان الدین غریب اکثر فرمایا کرتے کہ اگر تو بے عیب دوست ڈھونڈے گا تو عمر بھر کسی کو دوست نہ بنا سکے گا اور بے دوست رہ جائے گا۔ (کیونکہ بے عیب ذات صرف خدا کی ہے۔)

ایک مرتبہ کسی شخص نے آپ سے فرمایا کہ میں اپنے نفس اور اپنی ذات کے عیبوں کو جس قدر دور کرتا ہوں دوسرے اور عیب ظاہر ہونے لگتے ہیں کیا کروں ؟

آپ نے جواب دیا یہی آدمی کا کمال اور انسانیت کی معراج ہے۔ بقول ظفرؔ

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

اور یہی فلسفہ ہے اپنی ذات اور اپنے ضمیر کے محاسبے کا جس کا آجکل چرچا تو بہت ہے لیکن اس پر عمل پیرا کوئی نہیں ہے۔

دولت آباد کے قیام کے دوران ہزاروں آدمی آپکی ذات بابرکات سے مستفیض ہوئے اور ایک موحد اور مخلص ذات کی وجہ سے ہزاروں راہ گم کردہ لوگوں نے راہ پائی۔ آپ کے اقوال بڑے حاکمانہ اور اعمال بڑے صالح اور نیک تھے۔

چنانچہ ایک مرتبہ ایک مسافر حضرت برہان الدین غریب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ایک طرف معرفت اور تصوف کے سارے خزانے برہان الدین غریب کے قدموں میں ہیں دوسری طرف امراء، وزرا اور سلاطین آپ کے دربار میں دست بستہ سر جھکائے کھڑے رہتے ہیں۔ اس لیے اس نے عرض کی۔

کہ مرد باخدا! میں آپ کے پاس دو چیزوں کی طلب میں آیا ہوں ایک "دین" حاصل کرنے کیلئے اور دوسرے "دنیا" کے لیے۔ مطلب یہ کہ مجھے دین دنیا دونوں کی دولت سے نواز دیجئے۔

آپ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور کہا "ان دونوں چیزوں پر خداوند قدوس کا اختیار ہے۔ وہی ان کا بخشنے والا ہے۔ پہلے اپنے خدا کو "پا" پھر وہی یہ دونوں چیزیں تجھے عطا کرے گا۔

جواب جتنا معقول تھا اتنا ہی مفکرانہ! دین اور دنیا کی طلب بڑی آسان اور بڑی پرکشش ہے لیکن اس کے پانے کا راستہ ایک ہی ہے اور وہ بڑا کٹھن اور مشکل ہے۔

یہی نہیں بلکہ آپ نے اپنی ساری زندگی میں پاکیزگی نفس اور طہارت باطن پر بہت زور دیا کیونکہ اس کے بغیر نہ کوئی عبادت قبول ہوتی ہے اور نہ عمل صالح۔

پاکیزگی یا طہارت دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک جسم کی اور ایک دل کی۔ فی زمانہ لباس اور جسم کی صفائی پر سب ہی زور دیتے ہیں لیکن طہارت قلب اور پاکیزگی باطن

کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔ جب تک دل حرص و ہوا، بغض و کینہ، بدگمانی اور ریا سے پاک نہ ہو انسان انسان نہیں بنتا۔ وہ کسی بھی مرتبے کو حاصل نہیں کر سکتا۔ دل و دماغ کی یہی طہارت درویشی کی جان ہے۔ آپ فرماتے کہ جو "چیز" یعنی نعمت فقیر یا درویش سے صحیح معنوں میں حاصل کی جاتی ہے وہ مہد سے لحد تک ساتھ رہتی ہے۔

فقیر کے لیے سوال بہت بڑا عیب ہے۔ اللہ پر توکل اور بھروسہ رکھنے کے بعد غیر اللہ سے مانگنا بہت بڑی منافقت ہے۔ آپ فرماتے کہ خدا کی ذات دانا و بینا، علیم و خبیر ہے۔ وہ میرے حال کو جانتا ہے۔ اس سے کیا مانگوں، رہ گئی مخلوق سے مانگنے کی بات تو اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ان حالات میں سب سے بہتر سب سے افضل صبر ہے۔

ان حالات درویشی اور فقیری میں بھی درویش مہمان نوازی میں کوتاہی نہ کرے جو ہاتھ میں ہو دیدے جو جانتا ہو وہ سکھا دے۔ اگر کوئی مسافر مقیم کے پاس پہنچے تو مقیم درویش کو لازم ہے کہ دو برتن گرم پانی کے اس کے سامنے پیش کرے۔ ایک میں منہ ہاتھ دھونے کے لیے گرم پانی دوسرے میں "گرم شوربہ" تاکہ مسافر اپنی بھوک مٹا سکے!

آپ اکثر و بیشتر فرماتے کہ دنیا کی مثال ایک "سائے" کی طرح ہے جو انسان کے ساتھ ہے لیکن اس کو کوئی پکڑ نہیں سکتا جب اس کو پکڑنے کے لیے آگے بڑھو تو یہ دور بھاگتا ہے اور جب اس سے پیٹھ موڑ لو تو یہ خود پیچھے چلنے لگتا ہے۔

آپ حضرت امیر حسن بن علاء سنجری کا ایک لطیفہ اکثر دہرایا کرتے کہ انسان کی مثال بکری کی طرح ہے جب وہ پانی پیتی ہے تو اتنی احتیاط اور دانش مندی سے پیتی ہے کہ اس کے پاؤں تک تر نہیں ہوتے (بکری پانی سے بہت بھاگتی ہے) لیکن جب یہ مر جاتی ہے تو اس کے چمڑے کو دباغت کر کے اس کی مشک بناتے ہیں اور سر سے لے کر پاؤں تک پانی اس کے اندر بھر دیتے ہیں۔ یہی حال انسان کا ہے جب تک

زندہ رہتا ہے ذرا سی گرد اپنے لباس پر یا مٹی اپنے جسم پر برداشت نہیں کرتا لیکن موت کے بعد اس کے جسم کو اسی مٹی اور خاک میں دبا دیتے ہیں۔

درویش کامل کے لیے لازم ہے کہ تین باتوں پر عمل کرے۔

۱۔ کبھی کسی کی کوئی امانت اپنے پاس نہ رکھے۔ نہ جانے کس وقت پیام اجل آ پہنچے

۲۔ درویش کو کبھی کسی کا ضامن نہیں ہونا چاہیئے۔

۳۔ درویش کو کبھی کسی کی گواہی شاہدی کے چکر میں نہ پڑنا چاہیئے کیونکہ یہی تین چیزیں گوشۂ عافیت کے لیے فتنہ ہیں۔

فرماتے ہیں کہ انسان کی زندگی ایک سایہ دار درخت کے مانند ہونا چاہیئے جو دن بھر کڑا دھوپ میں تپتا رہے لیکن اس کی ٹھنڈی چھاؤں میں مسافر اور جانور آرام کریں کیونکہ یہی اصلی فیض رسانی ہے جس کی بنیاد ایثار پر ہے۔

محبت الٰہی کا مقام دل ہے۔ اس میں بیک وقت دو چیزیں نہیں سما سکتی ہیں یعنی اللہ کی محبت کے ساتھ دنیا کی محبت نہیں سما سکتی۔

اور جب اللہ کی محبت دل میں جاں گزیں ہو جاتی ہے تو پھر دنیا کے اسرار اس کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہتے۔ وہ چرندوں کا مافی ضمیر سمجھتا ہے۔ ذروں کے قلب میں نور الٰہی دیکھتا ہے۔ فرماتے ہیں، میں نے ایک چڑیا کی زبانی سنا کہ ؎

اک لحظہ عنایات تو اے بندہ نواز
بہتر از ہزار سال تسبیح و نماز

جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کر چکی ہوں کہ درویش اور صوفیوں کے مسلک میں سب سے اہم چیز شاہان وقت سے بے نیازی اقتدار سے گریز اور حاکم کی خوشامد سے پرہیز ہے اور یہی اللہ والوں کی پہچان ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی وجہ سے ہر تاجداران شاہان بے تاج کے دربار میں سر جھکائے با ادب کھڑا ہوا ملتا ہے۔

حضرت برہان الدین غریب صوفی کامل تھے اور اس عہد میں خلد آباد کی پہاڑیوں میں اپنے تصوف کا جادو جگا رہے تھے جب سلطان محمد تغلق اپنے دارالخلافہ کی منتقلی

کی آخری ہم طے کر رہا تھا۔ شیخ حماد الدین کاشانی سے روایت ہے کہ اسی دور میں میں ایک روز حضرت برہان الدین غریب کی خدمت میں حاضر تھا۔ باتوں ہی باتوں میں کسی نے کہا کہ سلطان محمد تغلق اپنے کام کو مکمل کر کے اب دکن آگیا ہے اور گرد و نواح کی مہمات بھی تقریباً سر ہو چکی ہیں۔

آپ چونکہ اہل دنیا سے تنگ تھے۔ اس لیے پوچھا۔ 'وہ اس وقت کہاں ہے"

جواب ملا 'دردھا' تک آچکا ہے۔

اس وقت حضرت برہان الدین غریب علیل اور صاحب فراش تھے لیکن فوراً دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے کہ پروردگار اس کو (محمد تغلق) مجھ سے دور رکھ!

ادھر جب محمد تغلق دولت آباد آیا تو اس نے اپنے وزیر اعظم ملک احمد ایاز جس کا لقب خواجہ جہاں تھا پوچھا کہ ہم نے یہاں کے تمام علماء اور مشائخ سے ملاقات کی ہے اگر ان میں سے کوئی باقی ہو تو بتا دو۔

ملک احمد ایاز نے دست بستہ عرض کی کہ حضرت برہان الدین غریب باقی ہیں۔ یہ سن کر سلطان محمد تغلق نے کہا۔ دوبارہ شیخ کا ذکر نہ کرنا۔ میں جوانی میں انکی خدمت میں حاضر ہوا تھا لیکن ان میں کمال کا استغنا ہے۔ بلا کی بے نیازی ہے۔ وہ کسی کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے۔

ظاہر ہے کہ یہ بات اس نے حیرت اور استعجاب کے عالم میں کہی تھی ادھر چند دنوں بعد پھر سلطان نے حضرت برہان الدین سے ملاقات کا ارادہ کیا۔ جمعہ کے روز اس نے جامعہ مسجد قطبی میں نماز ادا کی اور کہا کہ میری سواری کو اب حضرت برہان الدین غریب کے آستانے پر لے چلو۔

اس کے منہ سے یہ لفظ نکلا تھا کہ حضرت امیر خسرو کے صاحبزادے ملک مبارک حسین کو حضرت برہان الدین سے ویسی ہی عقیدت اور محبت تھی جسے حضرت امیر خسرو کو محبوب الٰہی کے ساتھ تھی۔ تیز تیز حضرت برہان الدین غریب کی خدمت میں آئے اور آمد سلطان کی خبر دی۔ یہاں تک کہ وہ اپنی شاہانہ سواری اور شاہی دبدبے کے ساتھ ہٹو بچو کے شور

چوب داروں اور نقیبوں کی آوازوں میں حضرت کے محلے تک پہنچ گیا اور لوگ شاہی سواری کی آواز سننے لگے۔

اس وقت حضرت محبوب الٰہی نے حاضرین سے فرمایا کہ آؤ ہم سب مل کر اس نیت سے سورہ فاتحہ پڑھیں کہ سلطان کی سواری کا رخ پلٹ جائے اور وہ یہاں نہ آئے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اور نہ جانے سلطان کے دل میں کیا آئی کہ اس نے اپنی سواری کا رخ موڑ دیا اور واپس دولت آباد چلا گیا۔

لیکن یہ وقتی چیز تھی۔ سلطان محمد تغلق پلٹ تو گیا لیکن اس کے دل سے حضرت برہان الدین غریب کی عقیدت نہ ختم ہوئی اور نہ کم ہوئی چنانچہ کچھ اور فتوحات کے بعد سلطان محمد تغلق نے تین ہزار تنکہ زر یعنی سونے کے سکے جن کو اشرفیاں کہہ سکتے ہیں بعد احترام فیروز شاہ تغلق کے ہاتھ حضرت برہان الدین غریب کی خدمت میں ارسال کیں جب یہ اس صوفی کے آستانے پر پہنچا تو ملک نائب نے حضرت برہان الدین غریب کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا۔

سلطان سلام عرض کرتا ہے اور تین ہزار تنکہ زر سرخ کا نذرانہ خدمت عالی میں بھیجا ہے اور عرض کر رہا ہے کہ آں جناب کی توجہ اور برکت کی وجہ سے ہم نے یہ مہمات سر کی ہیں۔

حضرت شیخ برہان الدین نے چونک کر اس کی صورت دیکھی اور فرمایا "مجھ درویش کا سلام سلطان کو پہنچا دو اور کہو کہ اس فقیر نے آپکی مہمات کے لیے کوئی توجہ نہیں کی تھی۔ اس لیے یہ نذرانہ جائز نہیں ہے۔

ملک نائب نے ایک ایک لفظ سلطان کو بتایا اور کہا کہ شیخ کا جواب یہ ہے۔

فیروز شاہ تغلق بھی درویشوں کے مزاج اور صوفیاء کے آستانوں کے آداب سے واقف تھا اس لیے پھر ادب سے کہا۔

اگرچہ آپ نے ان مہمات کے لیے کوئی توجہ نہیں فرمائی لیکن یہ فتوحات آپ ہی کے قدموں کی برکت سے ہے اور یہی ہمارا یقین ہے اس لیے یہ نذرانہ آپ کی خدمت میں

دوبارہ پیش ہوا۔

اس کے بعد آپ نے اس کو اندر بلایا اور کاکا شاد بخت کو آواز دی اور حکم دیا کہ اس حقیر فقیر کے گھر میں جو بھی موجود ہے لے آؤ۔ اس نے گھر میں جو کچھ تھا حاضر کر دیا اور آپ نے ان سب کو تین ہزار تنکوں کے ساتھ ملا کر فقراء اور مساکین میں تقسیم کر دیا اور اسی قاصد کے ہاتھ جانماز اور کھجوریں سلطان کی خدمت میں اپنی طرف سے تحفہ کے طور پر بھیج دیا اور کہا جو شعر میں پڑھ رہا ہوں اس کو غور سے سن۔

مرد آں درود کہ کشتہ باشد　　زن آں پوشد کہ رشتہ باشد
شربت کہ برائے خویش بہ پیشت آرند　　ہم کردہ تست آں بہ پیشت باشد

(آدمی وہی فصل کاٹتا ہے جو وہ بوتا ہے۔ عورت وہی کپڑا بنتی ہے جس کا دھاگا اس نے کاتا ہو۔ جو مٹھائی یا شربت تیرے سامنے دنیا پیش کرتی ہے وہ تیرے ہی عمل کا صلہ ہے)

اس سے مراد یہ تھی کہ دنیا عاقبت کی کھیتی ہے۔ آخرت میں تم اسی کی فصل کاٹو گے جس کا بیج اس دنیائے دنی میں بوتے ہو۔

یوں تو بہت سی کرامتیں آپ سے منسوب ہیں اور ہر ولی سے کوئی نہ کوئی خرق عادت بات ضرور منسوب ہوتی ہے لیکن اگر حقیقت پسند نظروں سے دیکھا جائے تو موجودہ دور کے معاشرے اور تمدن کو دیکھتے ہوئے انکی یہ کرامت کیا کم تھی کہ دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے دور رہے۔ زندگی اس طرح گزاری جیسے کیچڑ میں کنول کا پھول جس کی پنکھڑیاں ہمیشہ پاکیزہ رہتی ہیں۔ اپنے مسلک اور اپنی تعلیمات کے مطابق ہزاروں لاکھوں کی دولت کو ٹھکرانا آسان بات نہیں ہے۔ ان کے دل کو احساس تھا کہ اگر ہم نے اس سونے کو قبول کر لیا تو کل اس کی بیڑیاں ہمارے پیروں میں ہونگی جو ہم کو کشاں کشاں دربار تک لے جائیں گی اور بادشاہ کے ہر جا و بے جا حکم پر سر جھکانے پر مجبور کریں گی۔ لہٰذا اس فتنے کو سر اٹھانے سے پہلے ہی کچل دینا بہتر ہے اور یہ وہی شخص کر سکتا ہے جس کو اللہ کی ذات سے پر پورا توکل اور اس کے رازق اور ستار ہونے پر پورا یقین ہو۔

اور یہی یقین بندے کو خدا سے قریب تر کرتا جاتا ہے۔ اللہ کی محبت میں بندہ اتنا سرشار ہو جاتا ہے کہ اس کو عشق الہٰی کی حلاوت کے علاوہ دنیا کی کسی چیز میں مزا نہیں آتا۔

اس سلسلے میں ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ حضرت برہان الدین غریب کی خدمت میں صبح و شام رہنے والے کاکا سعد بخت نے آپ کو کھانے کے لیے مغز بادام کے ساتھ کچھ مصری کی ڈلیاں پیش کیں۔ آپ نے برائے نام تناول فرمایا اور کہا۔

کاکا! مجھے اس کھانے میں کوئی لذت یا مزا نہیں مل رہا ہے۔

کاکا سعد بخت نے از راہِ خوش مزاجی جواب دیا کہ ایک وقت وہ تھا جب آپ لوبیا کے ساتھ جو کی روٹی بڑے شوق سے تناول فرمایا کرتے تھے اور اب آپ کو بادام اور مصری جیسی خوش ذائقہ چیز میں بھی ذائقہ نہیں مل رہا ہے۔

فرمایا تم سچ کہتے ہو جس وقت میں لوبیا اور جو کی روٹی کھاتا تھا وہ میرے مجاہدے کا وقت تھا۔ محبوب سے فراق کا زمانہ تھا۔ اب وصال الہٰی کے سامنے یہ مغز اور بادام اور مصری کیا ساری دنیا کی نعمتیں بے لذت ہیں۔

دنیا سے بے نیازی اور اللہ سے والہانہ محبت ہی وہ جذبہ ہے جو درویشی کی جان اور تصوف کی آن ہے۔ حضرت برہان الدین غریب کی حیات کا ایک اور واقعہ ہے کہ جب سلطان محمد تغلق دکن آیا تو اس کے ساتھ اس کے استاد محترم قتلغ خان بھی تھے ایک تو استاد ہونا ہی ان کے لیے باعث فخر تھا دوسرے سلطان تغلق کا استاد اپنے آپ کو بڑا اور معزز انسان سمجھتے تھے۔ اکثر و بیشتر حضرت برہان الدین کی خدمت میں آیا کرتے تھے مگر تکبر اور تمکنت کے ساتھ بادشاہ کا استاد ہونے کا خیال دل ہی سے نہ جاتا تھا چنانچہ اکثر علمی بحث مباحثہ میں الجھ جایا کرتے تھے۔

ایک روز حضرت برہان الدین غریب نے بصد انکسار فرمایا کہ قتلغ خان بیٹھ جاؤ۔ نہ جانے اس نرم آواز میں کیا جادو تھا کہ قتلغ خان دو زانو باادب بیٹھ گئے اور حضرت برہان الدین نے بذریعہ کشف ان کی ماضی کے زمانے کی باتیں بتانا شروع کر دیں جو ان پر

آئینہ کی طرح روشن تھیں۔ ان میں بیماریاں، بزرگوں کی اموات سے لے کر ان کی اس محبت کا بھی حال تھا جو انھوں نے جوانی میں کسی سے کی تھی۔ آپ ایک ایک بات بتاتے جاتے اور وہ سنتا جاتا۔ بالآخر وہ فرطِ عقیدت میں قدم پکڑنے پر مجبور ہوگیا اور فوراً اپنے تکبرانہ لہجے میں معافی مانگی اور حلقہ ارادت میں شامل ہوگیا۔

قتلغ خان خود تحریر کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حضرت برہان الدین غریب کے سادہ سے دسترخوان پر ان کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا اور دل میں یہ سوچ رہا تھا کہ جو مغفور کے ساتھ کھانا کھائے اس کی مغفرت بھی یقینی ہے۔ دل میں یہ خیال آیا ہی تھا کہ خود حضرت برہان الدین غریب نے توجہ فرمائی اور کہا۔ "یہی نہیں بلکہ اگر مغفور کی جماعت کے ساتھ بھی کھانا کھالیں تب بھی مغفور ہو جاتے ہیں۔"

حضرت کے فیضِ محبت سے قتلغ خان کا دل بھی نورِ عرفان سے منور ہوگیا چنانچہ ایک مرتبہ ایک مہم کے دوران یہ سلطان کے ساتھ خیمہ زن تھے۔ پر تکلف دسترخوان بچھا تھا انواع و اقسام کے کھانے چنے ہوئے تھے اور قتلغ خان کا یہ حال تھا کہ ہر شخص کو پکڑ کر دسترخوان پر لاتا اور کہتا "یہ شیخ الاسلام حضرت برہان الدین غریب کا دسترخوان ہے۔"

یہی وہ قتلغ خان ہے جس نے دولت آباد کے نواح میں ایک بہت بڑا اور خوبصورت حوض تعمیر کروایا تھا جس کے گرد ایک باغیچہ تھا۔ مدتوں یہ پانی سے لبریز رہا اور دنیا اس سے سیراب ہوتی رہی۔ "حوض قتلغ" عوام الناس کی زبان میں "حوض قتلو" مشہور ہے جس کی بہار میں نے اپنے بچپن میں دیکھی تھی۔ اس وقت تک محکمۂ آثار قدیمہ مملکت آصفیہ اس کی دیکھ بھال کرتا رہتا تھا لیکن اب یہ ابتدائے زمانہ کے ہاتھوں خشک ہو چکا ہے۔ باغ اور سبزہ سوکھ چکا ہے جو برسات میں پھر ہرا ہو جاتا ہے لیکن اس کی پتھریلی منڈیر اور گرد بنی ہوئی چوکیاں اب تک اس کی عظمت رفتہ کی یاد دلاتی ہیں۔

قتلغ خان کے دل میں خدمتِ خلق کا بے پناہ جذبہ موجود تھا۔ اسی وجہ سے اس پر حضرت برہان الدین کی نظر خاص تھی۔ فرماتے تھے کہ میرے لیے یہی ایک مرید کافی ہے۔ چنانچہ جب قتلغ خان کا آخری وقت آیا تو اس نے کلام پاک کی تلاوت شروع کر دی اور یوں ہنستے کھیلتے

اللہ کا کلام پڑھتے پڑھتے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

یوں تو تمام اولیاء کو اسی طرح کرامات عطا ہوئی ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو معجزات بخشے ہیں لیکن اولیاء اللہ کی عظمت اسی میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو فتنہ دنیا سے محفوظ رکھنے کے لیے جہاں تک ممکن ہو چھپائے رکھیں۔ اسی وجہ سے وہ کرامات سے بھی حتی الامکان گریز کرتے اور جب کوئی کرامت ظاہر ہو جائے تو پردہ کر لیتے ہیں۔

حضرت برہان الدین کے مرتبے کے بہت کم اولیاء ایسے ہیں جن کے کرامات ان کے وصال کے بعد ظاہر ہوئے ہوں اور یہ کرامات ان کے روحانی فیض کا ایک حصہ ہوتی ہیں۔ یعنی وصال کے بعد بھی وہ خلق خدا کی رہبری کے لیے موجود رہتے ہیں اور ان سے درپردہ گفتگو کرتے ہیں۔ "درپردہ" کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ ان خاموش اشاروں کو سننے اور ان کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے بھی کوئی ایسا انسان ہونا چاہیئے جس کا نفس طاہر دل طیب ذہن صاف اور عقیدہ پختہ ہو۔

حضرت برہان الدین غریب سے ایسی کئی ایک کرامات سرزد ہوئیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

حضرت حماد کاشانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ روزہ دار تھا اور دل میں نیت کرلی تھی کہ "طے" کے روزے رکھوں گا۔ چنانچہ مغرب کی نماز پڑھ کر روزہ افطار کیے بغیر دوسرے روزے کی نیت سے حضرت برہان الدین غریب کے گنبد مبارک میں داخل ہو گیا۔ پلک جھپکتے میں دیکھا کہ حضرت برہان الدین غریب سامنے ہیں اور ارشاد فرماتے ہیں کہ پہلے پانی سے افطار تو کر لو۔ چنانچہ میں فوراً باہر آیا اور پانی سے افطار کر کے دوبارہ حاضر خدمت ہوا۔

یہ کرامت کی بہت بڑی قسم ہے کہ ان کی روح پاک سے ملاقات ہو اور ملاقات کرنے والے کے لیے انتہائی عزت افزائی ہے۔

اسی طرح کی کئی ایک کرامتوں کا ذکر آپ کے مریدوں اور ساتھیوں نے کیا ہے۔
ان میں ان کی روح پاک سے ملاقات، سلام کا جواب اور بعد وصال فیض رسانی شامل ہے

لیکن ان سب کو چھوڑ کر ان کی ایک اور کرامت ہے جو اب بھی ان کے روضے پر دکھائی دیتی ہے۔

آزاد بلگرامی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ حضرت برہان الدین غریب کے وصال کو ساٹھ ستر برس سے زیادہ گزر چکے تھے۔ آپکی درگاہ تعمیر ہو چکی تھی جس کی چوکھٹ سنگ سیاہ کی تھی جس پر جڑے ہوئے بے ترتیب جواہرات کا ذکر میں حضرت منتخب الدین زرزری زربخش کے احوال میں بیان کر چکی ہوں۔ سامنے کا فرش شاہ آبادی پتھروں کا ہے جن کا رنگ چمکدار سُرمی ہے اور یہی وہ پتھر ہیں جو سارے دکن کے گھروں کے کمروں دالانوں اور آنگن میں عام طور پر بچھے ہوئے ہیں۔

آپ کے وصال کے عرصہ دراز بعد ایک سال سخت قحط پڑا۔ پانی کے قال کی وجہ سے غلہ بہت مہنگا ہو گیا۔ اور درگاہ کے متوسلین، سجادہ نشینوں اور فراشوں کی گزر اوقات مشکل سے مشکل تر ہو گئی۔ اب نہ تغلق کی شاہی تھی نہ دولت آباد دارالخلافہ تھا بلکہ بہمنی سلطنت کا طوطی بول رہا تھا جس کا پایۂ تخت "بیدر" منتقل ہو چکا تھا یہ لوگ جاتے تو کہاں جاتے۔ سب کی سب دھرنا دے کر مزارِ مبارک کے قریب بیٹھ گئے۔ دعائیں مانگیں مراقبے کیے اور ان کو بشارت ہوئی کہ تم لوگ بے فکر رہو۔ رزق کا ضامن اللہ ہے۔ کوئی نہ کوئی سبیل پیدا ہو جائے گی۔

چنانچہ دوسرے دن صبح کو ان کے آستانے کے سامنے جو پتھر کی سلیں جڑی تھیں ان میں سے چاندی کے "اکھوے" پھوٹے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک بالشت تک "میخ نما" چاندی کی سلاخیں باہر آ گئیں۔ درگاہ کے متوسلین نے ان کو کاٹ کر اپنا خرچہ نکالا اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ خشک سالی اور قحط باقی رہا۔ یہ واقعہ چھ سو برس پرانا تھا۔ لیکن اب بھی جب زائرین یہاں آتے ہیں تو پتھروں کے اندر ان چمکتے ہوئے نگینوں کو دیکھتے ہیں۔ جہاں سے چاندی کی یہ میخیں کونپلوں کی طرح پھوٹتی تھیں۔ ان میں سے کچھ سیاہ ہو چکے ہیں اور کچھ اب بھی سفید اور چمکدار چاندی کی طرح اندر چمک رہی ہیں جیسے کوئی چیز ابھر کر باہر آنا چاہتی ہو۔

میں سنہ ۸۲ء، سنہ ۸۳ء، سنہ ۸۵ء میں اپنے اورنگ آباد قیام کے دوران گھنٹوں اس

آستانے پر بیٹھی ہوں اور بار بار ان چاندی جیسے نگینوں کی ماہیت پر غور کیا جن کے نشان اب بھی پتھروں میں ہیں لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی۔ یہ پتھر اتنے عام ہیں کہ اورنگ آباد بلکہ دکن کے ہر گھر، دفتر اور پلیٹ فارم پر بچھے ہوئے ہیں۔ اگر ان کو پتھروں کے اندر ہونے والا کوئی تغیر یا کیمیائی کہا جائے تو اس کے لیے اور مقامات بھی تھے۔ کہیں بھی اس قسم کا کوئی نشان نہیں ملتا ہے۔

حضرت برہان الدین غریب اور حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی میں بڑی گہری دوستی تھی۔ دونوں پیر بھائی تھے اور حضرت محبوب الٰہی کے نظر کرم سے ولی کامل بنے تھے جب بھی حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی ادھر سے دہلی آتے، حضرت برہان الدین غریب کے مکان پر قیام فرماتے لیکن یہ ساتھ اس وقت چھوٹا جب آپ دکن تشریف لے آئے۔

یہاں پر آپ نے لاکھوں انسانوں کو فیض پہونچانے اور نیکی کا راستہ دکھانے کے بعد ماہِ صفر ۷۳۸ھ م سنہ میں وفات پائی۔

وفات سے پہلے آپ نے اپنے چار خلیفہ مقرر فرمائے تھے جن کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ خلیفہ اول مولانا فرید الدین ادیب جن کا ذکر پہلے آ چکا تھا کہ وہ آپ کے وصال سے صرف ۱۳ دن قبل اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

۲۔ دوسرے مولانا فخر الدین شمس الملک دہلی میں تھے جن کو آپ نے خرقۂ خلافت روانہ کیا۔

۳۔ مولانا سید نصیر الدین تھے۔

۴۔ آپ کے سب سے ممتاز اور مشہور خلیفہ حضرت زین الدین داؤد شیرازی ہیں جن کا مزار آپ کے روضے کے سامنے ہے اور انہیں کے نام اور انہیں کی ذات کی وجہ سے خلد آباد کی زمین بائیس ۲۲ خواجہ کی چوکھٹ کہلاتی ہے۔ (جس کی تفصیل آگے آئے گی)

آپ کے خواہر زادے مولانا لطیف الدین فرماتے ہیں کہ اکثر راتوں کو تنہائی میں اپنے ماموں اور پیر و مرشد کی خدمت میں استفادے اور حصول فیض کے لیے حاضر رہا کرتا تھا۔ ایک

مرتبہ آپ نے فرمایا کہ تم کو بتاؤں کہ درویشی اور فقیری کیا ہے؟

فقیر وہ ہے جس کے سامنے کائنات کی ہر چیز عیاں ہو چنانچہ میں یہ جانتا ہوں کہ مشرق سے مغرب تک جتنے گھروں میں جو چراغ جل رہے ہیں ان کا تیل کہاں سے آیا ہے یعنی اس کی حلال کی روشنی ہے یا مال حرام کی۔

یہ تعریف ہے فقیری کی اور یہ مرتبہ ہے درویشی کا جس کا اظہار آپ نے اپنے بھانجے سے کیا تھا۔ اور اسی وجہ سے آپ کو اپنی موت کا ادراک ہو چکا تھا۔ ۷۳۵ھ کے اوائل میں جب آپ بیمار ہوئے تو آپ کے مریدوں اور عقیدت مندوں کو سخت تشویش ہوئی جب آپ کو اپنے لواحقین کی پریشانی کی اطلاع ملی تو آپ نے عبداللہ مطبخی (جن کے سپرد مطبخ کا انتظام تھا) بلاکر فرمایا کہ لوگوں سے کہہ دو کہ میری صحت کی وجہ سے متردد نہ ہوں اس مرتبہ میں یقینی شفایاب ہو جاؤں گا کیونکہ ابھی میرے خواجہ نظام الدین نے مجھے جن باتوں کا امیدوار کیا ہے وہ پوری نہیں ہوئی ہیں۔ اس کے بعد میں پھر بیمار پڑوں گا اور وہ ایک سال کی متواتر علالت کے بعد جب اسی حالت میں مجھے شب قدر حاصل ہو جائے گی میں انتقال کروں گا اور اس کے بعد عبداللہ مطبخی کو تاکید کر دی کہ درویش کا یہ راز کسی پر ظاہر نہ کرنا۔ بس اتنا کہہ دینا کہ میں صحت یاب ہو جاؤں گا۔

اس کے بعد آپ واقعی صحت یاب ہوئے اور پھر دوبارہ بیمار پڑے اور صاحب فراش ہو گئے۔ اس وقت حضرت مبارک غوری آپ کے پاس موجود رہتے۔ آپ اکثر اپنی علالت میں رویا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت مبارک غوری کی سوالیہ نظروں کو دیکھ کر کہا۔ "یہ نہ سمجھنا کہ میں اپنی بیماری یا درد سے روتا ہوں بلکہ [illegible] یہ ہے کہ اگر ایک لمحہ بھی خدا کی یاد سے غافل رہوں تو دل بھر آتا ہے۔ عاشقاں خود زحمت کو رحمت اور درد کو علاج جانتے ہیں۔

اب وہ دور آچکا ہے جب ناعاقبت اندیش محمد تغلق نے دہلی کی بربادی دیکھ کر دولت آباد کی رعایا کو حکم دے دیا تھا کہ وہ دولت آباد سے دہلی واپس جا سکتے ہیں۔ آپ کے اکثر مریدوں اور ساتھیوں نے آپ سے عرض کی کہ آپ بھی دہلی واپس چلیں۔ ہم زاد راہ

اور سامان سفر تیار کر دیں لیکن جو بندگان خدا اللہ کی رضا پر اپنے پیر و مرشد کے حکم سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے ان کو فرمان شاہی کی کیا پرواہ تھی! وہ بادشاہ وقت کے کہنے پر کیوں چلے جاتے لہٰذا آپ نے جواب دیا۔

مجھے جہاں میرے پیر و مرشد نے بٹھا دیا ہے وہاں سے اٹھ کر کہیں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور پھر اپنے مرشد مبارک کی زمین کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ میرا یہ مقام ہے۔

اس کے بعد لوگ خاموش ہو گئے لیکن مبارک غوری کا دل دہلی میں اٹکا ہوا تھا۔ انھوں نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر جانے کی اجازت چاہی اور آپ نے بڑی شفقت اور دردمندی سے فرمایا۔

"مبارک کہاں جاتا ہے؟ اس کے بعد مجھے کہاں پائے گا؟" آپ کی زبان مبارک سے یہ جملہ سن کر مبارک غوری نے اپنا ارادہ ترک کر دیا اور اسی بات کے پورے چالیس دن بعد آپ نے وفات پائی۔

آخری وقت میں مریدوں کو بلا کر وصیت کی اور سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء کی تسبیح ہاتھ میں لی۔ دستار مبارک تجدید بیعت کی نیت سے گردن میں ڈالی اور فرمایا "میں مسلمان ہوں۔ امت رسول ﷺ ہوں۔ شیخ کا مرید ہوں۔ اگر میں خود نیک نہ تھا تو نیکوں سے ملا ہوں۔ اپنا انصاف میں خود کرتا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے سجدے میں چلے گئے۔

۱۲ صفر ۷۳۸ھ کو سہ شنبہ کے روز چاشت کے وقت آپ نے اپنے تمام خادموں کو طلب کیا اور کہا کہ تم سب باورچی خانے میں جا کر کھانا کھاؤ۔ سب چلے گئے۔ صرف خواجہ رشید الدین حاضر خدمت رہے اور اس بات کے تھوڑی دیر بعد آپ نے زیر لب کلمۂ طیبہ پڑھتے ہوئے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی اور ۱۳ صفر کی رات کو آپکی تدفین عمل میں آئی۔

آپ کی وفات کے بعد حضرت کا کا سعد بخت آپ کے متولی مقرر ہوئے جن کا نام استمال سے کا کا شاد بخت ہو گیا ہے۔ ان کا وطن شیراز ہے۔ یہ وہیں پیدا ہوئے۔ آب و دانہ دہلی لایا وہاں کچھ وقت گذارا اور پھر دہلی سے ہجرت کر کے دولت آباد آ گئے۔ جب

حضرت برہان الدین غریب یہاں تشریف لائے تو آپ ہی کے مکان میں کچھ عرصے کے لیے قیام فرمایا اور اسی دوران کاکا شاد بخت حضرت برہان الدین کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گیے اور ساری زندگی انھیں کی خدمت میں خلدآباد شریف میں گذار دی۔ وہ جس خلوص اور عقیدت سے شیخ کی خدمت گذار رہے اس کا جواب نہیں اسی بنا پر آپ کو منظور الاولیاء مقبول الانبیاءؑ کہا جاتا ہے۔

آپ کے مراتب بہت بلند تھے چنانچہ کاکا شاد بخت نے ایک مرتبہ رات کو حضور اقدس سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ فوراً ذوق محبت میں قدم بوس ہوئے اور التجا کی کہ یا رسول اللہ میں زوال ایمان سے ڈرتا ہوں۔ اس کے زوال ایمان سے ڈرتا ہوں اس کے ثبات وقیام کے لیے کچھ بتائیں۔ چنانچہ حضورؐ اقدس نے اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمایا کہ تم یہ دعا پڑھا کرو۔ لا الہ الا اللہ ایماناً باللہ لا الہ الا امانً من اللہ لا الہ الا اللہ اماناً من عند اللہ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ ط

کاکا شاد بخت نے عرض کی کہ یا رسولؐ اللہ میں جاہل آدمی ہوں۔ یہ دعا بھول جاؤں گا۔ یاد نہیں رہے گی۔ اس پر حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مولا علیؓ کو اشارہ کیا جو پاس ہی کھڑے ہوئے تھے اور کہا کہ یہ کلمات لکھ دو۔ چنانچہ فاتح خیبر شیر خدا نے سبز رنگ سے یہ کلمات کاکا شاد بخت کے ہاتھ پر لکھ دیئے۔

صبح کو جب کاکا شاد بخت بیدار ہوئے تو یہ کلمات سبز رنگ سے اپنے ہاتھ پر لکھے ہوئے پائے۔ فرطِ عقیدت میں زار زار روتے ہوئے اپنے پیر و مرشد حضرت برہان الدین کے پاس پہنچے اور سارا ماجرا بیان کیا۔ آپ نے فرمایا۔ یہ دعا تو ہمارا وظیفہ خاص ہے اور کسی وقت بھی فوت نہیں ہوتا (یہ روایت احسن الاقوال سے منقول ہے)

حضرت کاکا شاد بخت کے علاوہ آپ کے بہت سے ارادت مند مختلف قسم کی خدمتوں پر معمور تھے۔ مثال کے طور پر مولانا عبدالکریم محرر تھے جو شجرے، فرمان، خلافت نامے، اور دیگر خطوط لکھا کرتے تھے۔

اس کے علاوہ کوئی دسترخوان بچھانے اور کوئی درویشوں کو پانی پلانے اور کوئی کھانا کھلانے پر معمور تھا۔ احسن الاقوال کے مطابق مولانا عبداللطیف کا کام صرف خلال پیش کرنا تھا۔ ان کے متعلق حضرت برہان الدین غریب خود فرماتے ہیں کہ خلال پیش کرنے کا ثواب اور برکتیں کتنی ہیں کیا بتاؤں؟ معلوم نہیں خود مولانا عبداللطیف بھی اس کے اجر سے واقف ہیں یا نہیں۔

غرض کہ آپ جامع صفات اور ولی کامل تھے۔ آپ کی بارگاہ آج بھی خلدآباد میں مرجع خاص وعام ہے اور تصوف کا یہ روشن چراغ اب تک خلدآباد کی پہاڑیوں میں اپنا نور پھیلا رہا ہے۔ میں اپنی عقیدت کو صرف ان دو شعروں میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہی ہوں۔ خدا کرے قبول بارگاہ ہوں!

بزم عرفانی میں محبوب الٰہی کے حبیب
مالک گنج تصوف نام برہانِ غریب

چند آنسو ہیں عقیدت کے انھیں کیجے قبول
کون جانے کب حضوری کی سعادت ہو نصیب

حضرت زین الدین داؤد شیرازی

جن کی وجہ سے خلد آباد

بائیس ۲۲ خواجہ کی چوکھٹ ہے

نام زین الدین زین الحق وطن شیراز لقب بائیس ۲۲ خواجہ (جس کی مفصل تشریح ہو گے آئے گی) مزار مبارک اپنے پیرو مرشد حضرت برہان الدین غریب کی درگاہ کے بالمقابل ہے دونوں درگاہیں طرز تعمیر اور کرسی کے لحاظ سے اتنی مماثل ہیں کہ ان کو توام بارگاہیں کہا جاتا ہے۔

یہ درگاہ سڑک کے مشرق میں ہے اور بہت اونچی کرسی پر زینے چڑھنے کے بعد ایک بردھے نمارعب آفریں بلند دروازے والا کمرہ پڑتا ہے جس کے اندر خدام کے لیے نشستیں ہیں اور دوسری طرف درگاہ کے اندر جانے کا راستہ ہے۔ چونکہ یہ درگاہ مشرق کے رخ ہے اس لیے اندر داخل ہوتے ہی ایک خوبصورت اور دلفریب مسجد ملتی ہے جو خلد آباد کی مسجدوں میں سب سے زیادہ خوبصورت ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصل مسجد یا تو خطرناک حد تک مخدوش ہو گئی تھی یا خود شہید ہو چکی تھی۔ اس لیے اس کو دوبارہ تعمیر کروایا گیا ہے کیونکہ اس کے محراب و ممبر خالصتاً مغلیہ طرز کے ہیں اندر تہرا دالان ہے سامنے ایک حوض ہے اور چوکیوں سے آراستہ کر دیا گیا ہے مسجد کے بالکل سامنے ایک بہت بڑا صحن ہے جس کی وسعت کا اندازہ مشکل ہے اور اس کے آخر میں یعنی مشرقی سمت میں پھر ایک بہت بڑا تہرا دالان ہے جو یہاں کی خانقاہ ہے اور سماع کی محفل میں صحن اور دالان ہزاروں کے مجمع کو اپنے دامن میں جگہ دے سکتا ہے۔ جنوب کی سمت میں بھی خانقاہ کے آثار ہیں جو اب شکستہ ہو رہے ہیں۔ شمالی دیوار کے ساتھ اسی پر جو عمارت اور خانقاہ ہے وہ شکستہ نہیں ہے۔ اس میں دو دروازے

ہیں ایک داخلے کے پھاٹک سے متصل جہاں سے اورنگ زیب عالمگیر کے مزار تک جانے کا راستہ ہے اس کو اب چہار دیواری کے ذریعہ علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ ورنہ پہلے یہ اسی احاطے میں تھا جہاں حضرت زین الدین شیرازی کے مزار کا اصل حجرہ ہے۔

دوسرا راستہ اس خانقاہ کے بالکل بیچ میں ہے وہاں ایک بہت بڑا صحن ہے، جس کے داہنے ہاتھ سنگ مرمر کی جالیوں میں اورنگ عالمگیر کے بیٹوں کا مزار ہے اور اس کے بعد مرکز میں اصل حجرہ ہے۔

اس کی وسعت، گنبد اور چوکھٹ بالکل اسی نمونے کی ہے جیسے حضرت برہان الدین کی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کے مزار کے حجرے کے سامنے دروازے سے متصل ایک خوبصورت چوکور شامیانے نما چھجا ہے جو فاتحہ خوانوں اور زائرین کو دھوپ اور بارش سے پناہ دیتا ہے۔ آپ کی چوکھٹ بھی سیاہ پتھروں سے بنی ہوئی ہے اور اس پر ویسے ہی قیمتی پتھر بے ترتیب جڑے ہوئے ہیں جیسے حضرت منتجب الدین زر زری زر بخش اور حضرت برہان الدین غریب کے مزارات کی چوکھٹ پر ہیں۔

گنبد والے چوکور صحن میں چاروں کونوں میں چار عمارتیں ہیں۔ شمال مشرقی حجرے میں خرقہ مبارک پیراہن شریف محفوظ ہے جس کا تفصیلی ذکر آگے آئیگا۔ جنوب مشرق اور شمال مغرب کے حجروں میں درگاہ کا سامان محفوظ ہے۔ یہ کمرے بطور توشہ خانہ استعمال ہوتے ہیں۔ جنوب مغرب میں اورنگ زیب عالمگیر کا مزار ہے۔

گنبد کے پائنتی مولانا فضل اللہ، مولانا تاج الدین لشکری اور مولانا احمد صاحب کے مزارات ہیں۔ ان حضرات کے قبروں کے جنوب میں ایک سنگ مرمر کی چہار دیواری ہے جس میں حضرت زین الدین کی بے پالکونٹی خان بی بی اور اورنگ زیب کے بیٹے عظیم الشان اور ان کی بیوی کے مزارات ہیں اور اسی چہار دیواری سے نکل کر شہزادہ عظیم الشان کے بیٹوں کی قبریں ہیں۔

جس طرح نظام الملک آصف جاہ اول کی ساری ذریت حضرت برہان الدین غریب کے قدموں میں آسودہ ہے۔ اس طرح اورنگ زیب کی ذریت حضرت زین الدین داؤد کے

پائینتی ابدی نیند سورہی ہے۔ اس کو آپ ان تاجداروں کی "شاہان بے تاج" سے عقیدت کے سوا اور کیا کہیں گے کہ ان میں سے کسی نے بھی اپنا عالی شان مقبرہ بنوانا پسند نہیں کیا بلکہ نہایت ہی سادگی کے ساتھ ان بزرگوں کے قدموں میں سکون کی نیند سوگیے۔

حضرت زین الدین شیرازی بائیس خواجہ کہلاتے ہیں۔ کیونکہ بائیس خواجہ کا خرقہ خواجگان چشت اہل بہشت کا سلسلہ آپ ہی پر ختم ہوا ہے۔ اس کے لیے میں کتابچہ مکاشفات اولیاء خلد آباد مطبوعہ اجمل پریس بمبئی کی صفحہ سات اور آٹھ کی عبارت جوں کی توں نقل کر رہی ہوں۔

"حضرت ناشاہ زین الدین زین الحق داؤد حسین شیرازی تحریر فرماتے ہیں کہ حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام وافضل التحیۃ بتوسط حضرت شاہ ولایت شمع جمیع ہدایت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہٗ بانعمت خلافت دلفرمان اجازت خرقہ امام المسلمین حضرت خواجہ ابوسعید حسن بصری چشتی قدس اللہ سرہٗ کے استاد ہر دو صاحبزادگان یعنی سیدنا امام حسن و حضرت امام حسین رضی اللہ عنہم اور خلیفہ منیر الزماں تھے عنایت ہوا۔

بعد ازاں آنحضرت خلافت بموجب اجازت خرقہ حضرت خواجہ ابو الفضل عبد الواحد بن زید چشتی قدس اللہ سرہٗ کو مرحمت ہوا۔ اور فرمایا کہ یہ خرقہ مقدس میراث حضرت زین الدین زین الحق داؤد حسن چشتی شیرازی کی ہے کہ وہ شیراز میں پیدا ہوں گے۔

۵۔ بعد ازاں خواجہ فضیل بن عیاض قدس اللہ سرہٗ

۶۔ بعد ازاں ابواسحاق سلطان ابراہیم ادھم بلخی قدس اللہ سرہٗ

۷۔ بعد ازاں رشید الدین خذیفۃ المرعشی قدس اللہ سرہٗ

۸۔ بعد ازاں امین الدین ہبیرہ البصری قدس اللہ سرہٗ

۹۔ بعد ازل کریم ممشاد علوی دینوری قدس اللہ سرہٗ

۱۰۔ بعد ازاں شریف الدین ابواسحٰق چشتی قدس اللہ سرہٗ

۱۱۔ بعد ازاں سعید ابواحمد چشتی زندنی قدس اللہ سرہٗ

۱۲۔ بعد ازاں ناصح الدین ابویوسف چشتی قدس اللہ سرہٗ

۱۳۔ بعد ازاں ناصر الدین ابویوسف چشتی قدس اللہ سرہٗ

۱۴۔ بعد ازاں قطب الدین مودود چشتی قدس اللہ سرہٗ

۱۵۔ بعد ازاں نیر الدین حاجی شریف زندنی قدس اللہ سرہٗ

۱۶۔ بعد ازاں عثمان ہارونی چشتی قدس اللہ سرہٗ

۱۷۔ بعد ازاں خواجہ معین الدین چشتی قدس اللہ سرہٗ

۱۸۔ بعد ازاں قطب الدین بختیار کاکی قدس اللہ سرہٗ

۱۹۔ بعد ازاں حضرت بابا فرید گنج شکر قدس اللہ سرہٗ

۲۰۔ بعد ازاں حضرت نظام الدین محبوب الٰہی بدایونی قدس اللہ سرہٗ

۲۱۔ بعد ازں حضرت برہان الدین غریب ہانسوی

حسب فرمائش پیر و مرشد دہلی سے دولت آباد کی طرف راہی ہوئے۔ اس وقت حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی نے حضرت خواجہ برہان الدین اولیاء کو خرقہ خلافت دوم جامع مقدس بزرگانِ سابق بطریق امانت جو کہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عنایت ہوا تھا دیا گیا اور نصیحت کی کہ یہ نعمت خلافت خرقہ حضرت خواجہ زین الدین زین الحق داؤد حسین شیرازی کو نصیب ہوگا۔ بعد چند مدت حضرت خواجہ سلطان برہان الدین اولیاء نے خلافت سلسلہ خود بموجب اجازت فرمان عالی شان پیر و مرشد حضرت زین الدین زین الحق داؤد شیرازی کو عنایت کیا۔ چنانچہ بائیس خواجہ کا خرقہ خواجگان چشت اہلِ بہشت کا سلسلہ آپ پر ختم ہوا۔

یہ عبارت مکاشفات اولیاء سے نقل ہے لیکن قلمی کتب شمائیل الاتقیا اور راحت القلوب میں بھی خواجگان چشت کا شجرہ ہے جس کے حساب سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جناب امیر المومنین حضرت علی اور اس کے بعد جناب خواجہ حسن بصری کو عنایت ہوا۔ حسن کا نمبر خلافت میں چوتھا ہے اور اس کے بعد پانچویں نمبر پر خواجہ فضیل بن عیاض ہیں۔ اگر اسی طرح شمار کیا جائے تو اکیس نمبر پر حضرت برہان الدین غریب رہیں جنھوں نے بائیسویں خواجہ حضرت زین الدین داؤد شیرازی کو اپنا خرقہ عنایت کیا

اور اس کے بعد انہوں نے اپنے کسی مرید کو نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بعد کے خلفاء میں کسی کا مرتبہ اتنا بلند نہیں ہے جتنا حضرت زین الدین زین الحق داؤد شیرازی بائیس[۲۲] خواجہ یعنی بائیسویں خواجہ کا ہے)

سید زین الدین زین الحق داؤد شیرازی کا شمار اولیائے کرام میں بہت بڑے درجوں میں ہوتا ہے جن کے علوم ظاہری و باطنی کا شہرہ ہوتا ہے اور ان سے کرامات سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ آپ کی ولادت باسعادت ۷۰۱ھ میں شیراز میں ہوئی۔ آپ کا نسب نامہ مصنف " باغ سعادت " نے اس طرح لکھا ہے۔

سید داؤد عرف زین الدین زین الحق دولت آبادی بن سید حسین بن سید محمود بن سید طاہر بن سید علم الدین بن سید احمد بن سید قطب الدین سید داؤد بن سید خیر الدین بن سید شمس الدین بن سید احمد علی بن سید علی رومی حسن بن سید احمد الفراح بن حضرت امام علی موسیٰ رضا علیہ السلام۔

شجرہ نسب سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے آباؤ اجداد شیراز میں رہے اور آپ وہیں پیدا ہوئے۔ والدہ ماجدہ نے آپکی کم سنی ہی میں وفات پائی۔ اس لیے آپ کی پرورش آپ کے والد ماجد خواجہ حسن نے کی۔ بچپن ہی سے سعادت آثار اور نیک تھے۔ اسی لیے اپنی جوانی کے آغاز ہی میں اپنے والد ماجد کے ساتھ حج کی سعادت حاصل کی۔ اس سے پہلے آپ پورا کلام پاک حفظ کر چکے تھے۔ اللہ نے توفیق عطا فرمائی تو تحصیل علوم باطنی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔

یہ وہ دور تھا جب دہلی میں علمائے کرام موجود تھے۔ چنانچہ آپ کو اسی سرزمین کی کشش ہندوستان لائی اور یہاں پر آپ نے مولانا کمال الدین صاحب سامانی سے علوم باطنی کی تکمیل کی اور انہوں نے ہی اپنے ہونہار شاگرد کو معراج کمال پر پہونچایا جس زمانے میں سلطان محمد تغلق نے دہلی کے باشندوں کو جبراً دولت آباد بھیجنا شروع کیا اسی دور میں آپ بھی مولانا کمال الدین سامانی، مولانا داؤد و حسین کے قافلے کے ساتھ دکن آئے۔ اس وقت آپ کے لیل و نہار علماء کی صحبت میں علمی مباحث اور

درس و تدریس کے شغل میں بسر ہوتے تھے۔ علم دین میں یہ جد و جہد اس لیے تھی کہ آپ چاہتے تھے کہ آپ کا کوئی قدم خلاف شریعت نہ اٹھے۔ دن رات اس شغل کے ساتھ ساتھ خداوند قدوس کی عبادت میں مصروف رہتے۔ اس کو اگر میں یوں لکھوں تو غلط نہ ہوگا کہ آپ علم حاصل کرنے عمل کے لیے اور عمل کرتے۔ اس لیے کہ خدا خوش رہے اور بندگان خدا کو سچی رہبری ملے۔ مشائخ اور صوفیاء کی صحبت سے آپ حتی الامکان دور رہتے۔

دولت آباد خلد آباد اور اس کے نواح میں اس وقت حضرت برہان الدین غریب کا طوطی بول رہا تھا۔ لوگ جوق در جوق ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہو رہے تھے۔ سماع کی محفلیں عام تھیں اور اس کا وجدان بندوں کو خدا سے قریب کر رہا تھا۔ اس کو استاد مزاج کہیے یا شیراز کے خاندان کا پس منظر کہ حضرت زین الدین کو یہ محفلیں بالکل پسند نہ تھیں بلکہ اگر علماء کی صحبت میں آپ اکثر استہزا کے انداز میں " سماع " کی محفلوں کا ذکر کیا کرتے۔ غالباً ان کا یہ خیال تھا کہ اہل علم کو ان محفلوں سے دور رہنا چاہیئے یا وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ " اہل حال " کے پاس سوائے وجدان کے کچھ نہیں ہے۔ وہ علم سے بے بہرہ ہیں۔ بہر کیف ان کے دل میں چاہے جو بھی ہو خدا ہی عالم الغیب ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ برسوں ان صحبتوں سے گریزاں رہے۔ یہاں تک کہ ایک دن بیٹھے بیٹھے نہ جانے کیا خیال آیا کہ آپ نے چند انتہائی مشکل علمی سوالات (جن کا شافی جواب ان کو اپنے استادوں سے بھی نہیں ملا تھا) حضرت برہان الدین غریب کی خدمت میں بطور امتحان روانہ کر دیئے۔ آپ نے وہ پرچہ جس پر سوالات لکھے تھے ملاحظہ فرمایا اور ایک ایک سوال کے کئی کئی جوابات نہایت سلجھے ہوئے تشفی بخش انداز میں لکھ کر دے دیئے۔ حضرت زین الدین یہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اب انکار کی کوئی گنجائش باقی نہ تھی تالیف قلب کا وقت آ چکا تھا چنانچہ آپ نے مولانا رکن الدین حماد کاشانی کے توسط سے حضرت برہان الدین غریب کی خدمت میں اپنا معروضہ پیش کیا اور ۷۳۶ھ میں آپ نے انتہائی عقیدت اور احترام کے ساتھ حضرت برہان الدین غریب کے دست حق پرست

پر بیعت کی اور اس طرح بیعت کی کہ آپ ہی کو خلافت عطا ہوئی۔

بیعت کے وقت حضرت برہان الدین غریب نے اپنے پیر و مرشد حضرت محبوب الٰہی کا ایک واقعہ سنایا کہ جب انھوں نے مولانا حسام الدین کو شرفِ ارادت بخشا یعنی اپنا مرید بنایا تو ایک نہایت عمدہ نصیحت کی اور وہی نصیحت آپ نے حضرت زین الدین کے سامنے دہرا دی کہ ؎

تکمیل مرید میں کوشش کرو نہ کہ تکثیر مرید میں

حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی کا یہ جملہ واقعی آب زر سے لکھنے کے لائق ہے۔ ہر سماج ہر دور اور ہر ملک میں اس کی افادیت یکساں ہے۔ دورِ حاضر کی تعلیم کو لے لیجیے۔ ہم صرف طلبہ کی تعداد اور فارغ التحصیل لوگوں کی اکثریت بڑھانے پر اپنا سرمایہ لگا رہے ہیں لیکن ہم میں سے کوئی بھی ان کی شخصیت کی تکمیل یا کردار کی جلا پر زور نہیں دیتا۔ اسکول ہوں یا کالج ہر ادارہ یہی کوشش کرتا ہے کہ پاس ہونے والے طلبہ کا اوسط فیصد ہر سال بڑھتا جائے لیکن بورڈ آف اسکول ایجوکیشن ہو یا یونیورسٹی کوئی یہ سوچنے کی زحمت نہیں کرتا کہ جو کچھ ہم نے ان کو پڑھایا ہے اس کو طالب علم نے کہاں تک ذہن میں بٹھایا ہے اور وہ کہاں تک اس قابل ہے کہ اپنے معلومات یا علم کے ذخیرے کو دوسروں کی تدریس میں صرف کرے۔

یہ خانقاہی نظام اور مشائخ کی تعلیم تھی کہ وہ بہت کم لوگوں کو اپنا مرید بناتے تھے۔ جب تک اس کے کردار اور ظرف کو پرکھ نہیں لیتے تھے اس کو حلقہ ارادت میں شامل نہیں کرتے تھے اور جب تک خوب ٹھونک بجا کر نہ دیکھ لیں خلافت نہیں دیتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ آجکل بغیر تربیت کے ہم لوگ جو تعلیم کو عام کیے ہوئے ہیں وہ معاشرے ملک اور قوم سب کے لیے زہر قاتل ہے۔ اس سے بہتر تھا کہ ہم پرانے زمانے کی طرح صرف چند تربیت یافتہ اور صالح لوگوں کو تعلیم دیتے اور وہ یگانہ روزگار بن کر نکلتے۔

مریدوں کی شخصیت اور ان کے کردار کی تکمیل ہی خانقاہوں کا سب سے بڑا

مقصد تھا جہاں علم کتابوں تک محدود نہ تھا بلکہ زندگی کے ہر ہر گام پر اس کا عملی مظاہرہ کرنا تھا۔ حضرت زین الدین داؤد شیرازی کیسے عالم باعمل تھے اس کا ذکر ہم آگے کریں گے

قرآن حکیم اور فرقان حمید میں جا بجا تفکر کی تعلیم دی گئی ہے کہ فکر کرو یا خداوند قدوس اپنی نشانیوں کے بارے میں ہدایات دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ یہ میری نشانیاں صرف ان لوگوں کے لیے ہیں جو عقل سے کام لیں غور و فکر کریں۔ اور غور و فکر کی عادت سرسری مطالعہ سے پیدا نہیں ہوتی۔ جتنا علم سیکھو گے اس کی لذت بڑھے گی۔ اتنی ہی اس علم کی طلب ہوگی جس قدر غور و فکر ہوگا۔ اتنے ہی حجابات اٹھتے گے۔ نت نئے نکات سامنے آئیں گے چنانچہ حضرت زین الدین سے بیعت کے بعد حضرت برہان الدین غریب نے فرمایا کہ جاؤ "مرصاد العباد" پڑھو۔ حضرت خواجہ زین الدین "مرصاد" پڑھ چکے تھے۔ لیکن پیر و مرشد کے حکم کی تعمیل میں دوبارہ مرصاد پڑھی اور فرمایا کہ واللہ یہ وہ مرصاد نہیں جو میں نے پہلے پڑھی تھی۔ فرمایا پھر ایک بار پڑھو اور تیسری بار پڑھنے کے بعد پھر حضرت زین الدین شیرازی نے فرمایا کہ واللہ یہ وہ مرصاد العباد نہیں ہے جو میں نے پہلے پڑھی تھی۔

اس کا مطلب علم کی لذت اور حلاوت ہے جتنی بار سیکھو ایک نیا کیف ہے۔ نیا سرور ہے اور یہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب پڑھنے والا صدق دل اور صدق طلب سے پڑھے۔ ایسے ہی موقع کے لیے مولانا رومی نے فرمایا ہے کہ ؎

علم را بر تن زدن یارے بود
علم کا را بر دل زدن یارے بود

اس کے بعد آپ نے اپنے شیخ کی ہدایت کے بموجب دن رات ریاضت شاقہ میں گذارے۔ تزکیہ نفس کے ساتھ ساتھ سلوک کی منزلیں طے کرتے رہے۔ علم کے ساتھ ساتھ عمل کو بھی صدق دل اور خلوص نیت کے ساتھ معراج کمال پر پہنچایا اور بالآخر ۱۷ ربیع الآخر ۷۳۰ھ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کے عرس کے روز جو حضرت

برہان الدین غریب کے پیر و مرشد تھے۔ آپ نے اپنا خرقہ خلافت حضرت زین الدین شیرازی کو عطا کیا۔ اور وہ اپنے "پیر" کے وصال کے بعد بڑی تمکنت کے ساتھ مسند خلافت پر متمکن ہوئے اور لوگ جوان کے پہلے ہی سے مرید تھے جوق در جوق "مرید" ہونے کے لیے حاضر ہوتے گئے اور یوں دن بدن آپ کا حلقہ ارادت وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکی ہوں حضرت زین الدین داؤد شیرازی ایسے عالم باعمل تھے کہ ان کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہ تھا۔ ان کے دل میں خدا کے خوف کے علاوہ کسی حاکم یا صاحب اقتدار کا رتی برابر ڈر نہ تھا۔ ان کی اسی روش کی وجہ سے شاہانِ وقت لرزہ براندام تھے۔

تاریخ شاہد ہے کہ دکن یعنی جنوبی ہند نے ہمیشہ یہی کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح شمالی ہند کی غلامی کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکے چنانچہ سلطان محمد تغلق کی حکومت کے خلاف دکن میں بغاوت کے آثار سب سے پہلے پیدا ہوئے اور اسمٰعیل فتح خان نے سب سے پہلے بغاوت کا علم دیوگری (دولت آباد) میں بلند کیا اور اپنی تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔ اس وقت سلطان محمد تغلق اس فتنے کو دبانے کے لیے خود آیا۔ (یہ واقعہ بہمنی سلطنت کے قیام سے پہلے کا ہے) اور اس کی سرکوبی کے بعد سب کو واپس دہلی جانے کا حکم دیدیا گیا۔ وہ حضرت زین الدین شیرازی کے ساتھ بڑی عقیدت سے پیش آیا اور وہ بھی اسی لشکر کے ساتھ دولت آباد سے دہلی واپس جانے لگے۔ (واضح رہے کہ ۷۳۸ھ میں حضرت برہان الدین غریب کا وصال ہو چکا تھا۔) میر حسن صاحب مؤلف ہدایت القلوب تحریر کرتے ہیں کہ میں بذاتِ خود اپنے ساتھیوں اور حضرت زین الدین کے مریدوں کے ہمراہ ان کو رخصت کرنے گیا اور "ایلورا" کی سرحد تک ان کو پہونچا دیا۔

حضرت زین الدین شیرازی کے لیے یہ سفر بھی وسیلہ ظفر بنا۔ دہلی پہونچ کر آپ نے سب سے پہلے حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی کی بارگاہ میں حاضری دی اور دہلی کے بڑے بڑے بزرگوں سے ملاقات فرمائی۔ سب سے فیض حاصل کیا اور آپ جدھر

جدھر تشریف لے گئے لوگ آپ کے حلقہ بگوش ہوتے گئے۔

دہلی ہی کے قیام کے دوران آپ نے صدر الدین مفتی سے ملاقات کی جو حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کی اولاد میں سے تھے اور وہاں آپ کو نور الدین امام سے بھی فیض ملا جن کے متعلق آپ نے خود فرمایا ہے کہ نور الدین نورک اللّٰہ فی الدارین۔ آپ ان کی خدمت میں رہ کر تجوید و قرأت کے ساتھ چند سیپاروں کی "صحت" کرتے رہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اتنا علم حاصل کرنے کے بعد بھی آپ اپنے آپ کو کامل نہیں سمجھتے تھے اور ہر وقت سیکھنے اور کچھ حاصل کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ یہی اہل علم کی عظمت اور یہی ان کی بڑائی ہے۔ انھیں نے آپکو نماز میں امامت پر فائز کیا اور اسی دوران آپ نے اپنی کتاب "ارشاد المریدین" تصنیف کی جس کے متعلق غلام علی آزاد صاحب نے فرمایا ہے کہ کتاب نہایت لطیف اور پاکیزہ ہے جو علم و عرفان کے مطالبہ عالیہ و مقاصد پر مشتمل ہے۔ طالب علموں کو چاہیے کہ اس کتاب کو نسخہ کیمیا سمجھ کر ساتھ رکھیں۔

منقول ہے کہ ۷۴۹ھ میں حضرت زین الدین شیرازی نے فرمایا کہ دو مہینے کا عرصہ ہوا میں رات کو اپنے "دادا پیر" حضرت سلطان المشائخ نظام الدین محبوب الٰہی کے مزار پر رات دن حاضر رہتا ہوں۔ روزانہ ایک کلام پاک ختم کر کے ان کی روح پر فتوح کو اس کا ثواب پہنچاتا ہوں اور صبح فجر کی اذان کے وقت تک تسبیحات اور ذکر میں مشغول رہتا ہوں اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ جو کچھ مجھے آپ کے دربار سے ملا ہے وہ میری بساط سے زیادہ ہے اور آپ کا میرے حال زار پر فضل بے پایاں ہے۔ اسی سلسلے میں آپ نے فرمایا کہ میں اکثر راتوں کو مرقد سلطان المشائخ سے یہ بیت "راتوں کے سناٹے میں سنتا رہتا ہوں جو درج ذیل ہے۔

بیا سائے کہ حُسن خود کہ جانم از تو آسود ست
توحُسنِ من بر افزدی خدا حسنت بیغزاید

آپ کی خدا پرستی اور علم کا شہرہ سنی کہ سلطان محمد تغلق بذاتِ خود آپ کے پاس حاضر ہوا اور کہا کہ آپ اپنی مرضی کے مختار ہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ دہلی میں

رہیں یا مرضیِ مبارک ہو تو زیارت حرمین کو جائیں اور اگر دولت آباد واپسی کا ارادہ ہے تو بھی مناسب ہے۔ میں ہر صورت میں آپ کی خدمت کے لیے تیار ہوں۔

آپ اس کا مطلب سمجھ گیے اور مسکرا کر جواب دیا کہ ابھی میرا ارادہ کوئی نہیں ہے یعنی آپ نہایت خوش اسلوبی سے بات ٹال گیے کہ کہیں اس بہانے سلطان وقت آپ کو کسی جال میں نہ پھانس لے۔

اس واقعہ کے چند ماہ بعد سلطان محمد تغلق کا انتقال ہو گیا اور ۷۵۲ھ میں اس کا بیٹا فیروز شاہ تغلق تخت نشین ہوا۔ اس نے بادشاہ بننے کے بعد سب سے پہلے یہی کام کیا کہ حضرت زین الدین شیرازی کے حضور سرِ عقیدت خم کیا اور کہا کہ میری سب سے بڑی آرزو یہی ہے کہ آپ مستقل دہلی میں قیام کریں۔

اس التماس کے بعد حضرت زین الدین شیرازی کے لیے انتہائی فیصلہ کن گھڑی آگئی۔ اس لیے انھوں نے نہایت بردباری سے فرمایا کہ "اے سلطان اگر تم مجھ پر مہربانی کرنا چاہتے ہو تو صرف اتنی مہربانی کرو کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو یہی ہے کہ میں اپنے پیر و مرشد حضرت برہان الدین غریب کے آستانے پر دم توڑوں اور اس کے بعد آپ نے دہلی سے دولت آباد واپسی کا عزم کر لیا۔ سلطان نے ازراہِ عقیدت کچھ نقد و جنس آپ کی خدمت میں بطور نذرانہ ارسال کر دی۔ جو آپ نے کھڑے کھڑے فقراء اور مساکین میں تقسیم کر دی اور پاک پٹن سے اجمیر کے راستے دولت آباد کی راہ لی۔

حضرت زین الدین شیرازی کا دہلی سے روانگی کا منظر تقریباً وہی تھا جو حضرت قطب الدین بختیار کاکی کی روانگی کے وقت تھا۔ علماء سرنگوں تھے۔ اکابرین خاموش تھے اور اہل دل، دل تھام کر آپ کو رخصت کر رہے تھے۔ حضرت قطب الدین دہلی سے نکل کر اپنے پیر و مرشد سلطان ہند کے حکم پر دوبارہ دہلی آ گیے اور حضرت زین الدین پر ان کے پیر و مرشد حضرت برہان الدین غریب کی کشش غالب آئی۔ سلطان المشائخ کے خلفاء، آپ کی اولادیں، شہزادگان، علماء اکابر شہر، عمائدین سلطنت

سب ہی قافلے کی صورت میں حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلوی کی قیادت میں حوض شمسی تک آپ کو رخصت کرنے آئے۔ حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کا مرتبہ یوں بھی بڑا ہے اور حضرت زین الدین کے لیے تو وہ حضرت برہان الدین کی جگہ تھے کیونکہ یہ دونوں حضرات نہ صرف یہ کہ پیر بھائی تھے بلکہ دونوں ایک دوسرے کے گہرے اور مخلص دوست بھی تھے۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی نے حوض شمسی پر پہونچ کر قبلہ رو کچھ دعائیں پڑھیں۔ حضرت زین الدین کا ہاتھ میں ہاتھ لے کر کچھ خدا کے حضور التجا کی اور اس کے بعد ان کے سر سے عمامہ اتار کر اپنا عمامہ یا دستار ان کے سر پر رکھ دی اور یہ کسی مرید یا خلیفہ کے لیے بہت بڑا اعزاز ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ آپ نے حضرت سلطان المشائخ کے تبرکات وغیرہ بھی آپ کو عنایت فرمائے اور آپ پاک پٹن یا اجودھن روانہ ہو گیے وہاں حضرت شیخ الاسلام بابا فرید گنج شکر نے ان کی آمد سے پہلے ہی اپنے سجادہ نشین حضرت شیخ محمد بن شیخ علاؤ الدین بن شیخ الاسلام بابا فرید گنج شکر کو خواب میں بشارت دی کہ میرے محبوب مرید کا محبوب مرید میری زیارت کو آرہا ہے تم استقبال کے لیے تیار ہو جاؤ۔ ظاہر ہے کہ آپ یعنی حضرت شیخ محمد بن علاؤ الدین بابا فرید کے پوتے بھی تھے اور اس وقت وہ بہت زیادہ معمر اور ضعیف تھے۔ روایات کے مطابق عمر گرامی سو سے زیادہ تھی لیکن آپ اجودھن (پاک پٹن) کی بستی سے باہر آئے اور آپ کا استقبال کیا۔

حضرت زین الدین نے تین دن اور تین رات مسلسل بابا فرید کے حجرے میں بیٹھ کر روحانی اور جسمانی حاضری دی۔ دن رات ذکر میں مشغول رہے۔ اور کیفِ باطنی سے دل کھول کر منور کرتے رہے۔ سوائے نماز کے اوقات کے باہر نہیں نکلتے۔ ہر روز چار کلام مجید ختم کرتے۔ اجودھن میں آپ نے تقریباً ایک مہینہ قیام کیا اور اجمیر شریف کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ وہاں کے سجادہ نشین یعنی بابا فرید گنج شکر کے پوتے نے آپ کی خدمت میں بابا کے تبرکات پیش کیے اور حسب ہدایت جدا مجد آپ کو اجودھن سے باہر ایک منزل آگے تک رخصت کرنے کے لیے گیے۔

حضرت زین الدین جس طرح درجہ بدرجہ بلندیوں کی طرف بڑھ رہے تھے اس کا اندازہ قارئین کو ہو چکا ہوگا کہ حضرت سلطان الہند کے مزار پر پہنچنے کے بعد آپ فرطِ عقیدت سے بے تاب ہوگیے وہاں ایک ہفتہ تک سلطان الہند کے روضۂ مقدس میں خلوت گزیں رہے۔ اور روزانہ چار کلام پاک کے حساب سے کل اٹھائیس قرآن پاک ختم کیے۔ اس دوران آپ کے عرفان اور وجدان میں اور زیادہ اضافہ ہوا۔ خواجہ صاحب کے روحانی فیض نے آپ کے دل کے سونے کو کندن بنا دیا۔ سلطان الہند پر دکن کا رخ کیا اور وہاں سے روانگی کے وقت ان کو اور زیادہ تبرکات اور مرتبے حاصل ہوئے۔ وہاں کے لوگ آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے۔ اور آپ وہاں اپنا فیض بے پایاں اور نظر کرم عام کرتے ہوئے دولت آباد کی طرف بڑھنے لگے۔ آپ جدھر جدھر سے گذرے لوگ آپ کو سر آنکھوں پر بٹھانے لگے۔ آپ نے اپنے قدموں سے راستے میں سینکڑوں بستیوں کو عزت بخشی اور جب آپ منزل مقصود کو پہنچے تو اس وقت خلقت آپ کی مطیع ہو چکی تھی۔ کیا درویش کیا فقیر، کیا امیر کیا سلطان سب آپ کے اشارے پر سر تسلیم خم کرنے میں اپنی خوش نصیبی سمجھتے تھے جس کی مثال ذیل کا ایک چھوٹا سا تاریخی واقعہ ہے جس کا ذکر تاریخ فرشتہ میں بھی ملتا ہے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ آپ دولت آباد تشریف لائے تو اس وقت دکن میں بہمنی سلطنت قائم ہو چکی تھی۔ سلطان محمد شاہ بہمنی تخت نشین ہو چکا تھا۔ اس نے چاہا کہ اس کے دربار میں امراء اور وزراء کے ساتھ ساتھ درویش اور فقراء بھی حاضری دیں اور "کورنش" بجا لائیں لیکن وہ درویش ہی کیا جو بادشاہ کے سامنے سر جھکا دے اور پھر حضرت زین الدین کا تو اپنا خاص مرتبہ تھا۔ انھوں نے شاہی دربار کی اس رسم کو یکسر نظر انداز کر دیا جیسا کہ ان کو کرنا چاہیے تھا لیکن محمد شاہ بہمنی ان کو نظر انداز نہ کر سکا اور اس نے یہ بات دل میں رکھ لی۔

بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی بلکہ اس نے اکثر مشائخ اور درویشوں کو اپنے دربار میں بلا کر ان سے اپنے ہاتھ پر بیعت لی اور جب یہ دوسرا حکم حضرت زین الدین شیرازی

تک پہنچا تو آپ نے فرمایا کہ فرمانروائی کے لائق صرف وہی شخص ہے جو اللہ اور رسول کے احکام پر عمل پیرا ہو۔ قرآنی احکامات کی سربلندی اس کا شعار ہو۔ حرام سے بچے اور وہ راستہ اختیار کرے جو اللہ کے رسول نے معین کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کا یہ کھرا جواب سلطان محمد شاہ بہمنی کے لیے بڑا تلخ تھا کیونکہ وہ شراب کے نشے میں دھت رہتا تھا اور ہر ناجائز بات کو اپنے اقتدار کے نشے میں جائز قرار دے دیتا تھا لیکن آپ کی یہ کڑوی بات اس کو برداشت کرنا پڑی۔ اس کو ساری عسکری قوت بھی اس بادشاہ بے تاج کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکی جس کا نام زین الدین زین الحق داؤد شیرازی ہے اور محمد شاہ کسی اور موقع کی تلاش میں گھات لگائے بیٹھا رہا۔

اسی عرصے میں ملک کے طول و عرض میں شورشیں شروع ہو گئیں۔ سلطان محمد شاہ بہمنی ان کو بچانے کے لیے اتفاق سے بیجا نگر تک چلا گیا جو آجکل وجے نگر کہلاتا ہے۔ اس کو وہاں مصروف دیکھ کر دولت آباد کے حاکم بہرام خان نے بغاوت کر دی اور اپنے چند ساتھیوں کی مدد سے سلطان سے مقابلے کی ٹھان لی۔ ادھر محمد شاہ بہمنی لشکر لے کر سیدھا دار الخلافہ پہنچا اور دولت آباد سے دو کوس پہلے اپنا پڑاؤ ڈالا تاکہ قلعہ دولت آباد کے محاصرے میں آسانی ہو۔ اس کو یقین تھا کہ بہرام خان حاکم دولت آباد قلعہ میں بند ہو کر لڑائی لڑے گا جیسا کہ اس دور کی جنگوں میں ہوتا تھا۔

ادھر بہرام خان نے جب یہ صورت دیکھی تو سخت پریشان ہوا اور سوچنے لگا کہ مجھے قلعہ کے اندر بند ہو کر لڑنا چاہیئے یا نہیں۔ اس مشکل اور پریشانی میں اس کو حضرت زین الدین شیرازی یاد آئے۔ اقتدار کے بھوکے ایک بار پھر درویش بے نوا کے قدموں پر گرنے کے لیے مجبور ہوئے۔ بہرام شاہ نے خدمت اقدس میں عرض کی کہ "آپ اس وقت دولت آباد کی صورت حال سے واقف ہیں۔ خدا کے لیے مجھے مشورہ دیں کہ اب میں کیا کروں۔ اگر آپ کا حکم ہو تو قلعہ میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لوں یا آپ میرے حسب حال جو ارشاد فرمائیں اسی پر عمل پیرا ہوں۔

حضرت زین الدین نے کمال انکساری سے فرمایا کہ جب تو اس فقیر کے پاس آیا

اور خلوص دل کے ساتھ مشورے کا طالب ہے تو سن لے کہ مشورہ دینے والا اور مشورہ لینے والے راز کا امانت دار ہوتا ہے۔ اس میں خیانت جرم ہے۔ تمہاری بھلائی اور بہبود اسی میں ہے کہ قلعہ میں بند ہونے کی غلطی نہ کرو کیونکہ یہی بموجب ہلاکت ہے اور عقلمندی سے   ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم اپنی بیوی اور بچوں کو اپنے ساتھ لو اور گجرات کی راہ اختیار کرو۔

آپ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلنا تھے کہ بہرام خان نے وہیں یعنی حضرت زین الدین شیرازی کے مکان پر بیٹھے بیٹھے اپنی بیوی بچوں کو بلایا اور کہلا بھیجا کہ تم لوگ اس وقت پیرومرشد زین الدین شیرازی کی قدم بوسی کے لیے آجاؤ بعد کو نہ جانے موقع ملے یا نہ ملے کیونکہ اس کے بعد ہم لوگ قلعے میں بند ہو کر لڑائی لڑیں گے۔ (آخر کار یہ جملہ اس نے مصلحتاً کہلایا تاکہ پیامبروں اور شاہی جاسوسوں کو یقین ہو جائے کہ وہ واقعی قلعے کے اندر بیٹھ کر لڑائی لڑنے والا ہے)

بہرام خان کے اہل و عیال حضرت زین الدین شیرازی کے مکان عزت نشان پر بلا تاخیر حاضر ہو گئے جہاں تازہ دم گھوڑے موجود تھے۔ جب یہ لوگ یہاں سے روانہ ہونے لگے تو حضرت زین الدین شیرازی نے اپنا دست مبارک بہرام شاہ کی پشت پر رکھا اور فرمایا۔ سوار ہو جاؤ خدا کے فضل و کرم سے عافیت اور سلامتی تمہارے ساتھ شامل ہے۔ وہ تو گجرات کی سمت آپ کی دعاؤں کے سائے میں چل دیا لیکن سلطان محمد شاہ کا بہت وقت ضائع ہو گیا اور جب اس کو پتہ چلا کہ دولت آباد کا قلعہ خالی ہے اور بہرام شاہ گجرات بھاگ چکا ہے تو اس نے اپنی سلطنت کی حدود تک اس کا تعاقب کیا اور پھر دولت آباد لوٹ آیا۔ جہاں اس کو ساری تفصیلات معلوم ہوئیں کہ وہ کس طرح اور کیسے یہاں سے فرار ہوا۔ اب اس کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ فوراً اپنے ایک خاص آدمی کی معرفت حضرت زین الدین شیرازی کو پیغام بھیجا کہ آپ فوراً میرے دربار میں حاضر ہوں۔

سلطان کی جھنجھلاہٹ کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس نے آپ کے جواب کا انتظار کیے بغیر تھوڑی ہی دیر بعد قاضی القضات کو آپ کے پاس بھیجا اور سمجھا دیا کہ جس طرح

ممکن ہو ان کو میرے دربار میں لے آؤ۔ اگر وہ اپنی ضد پر قائم رہتے ہوئے آپ کے ساتھ نہ آویں یا انکار کریں تو میری خلافت پر ان کا اقرار لو اور رضامندی کے دستخط ثبت کروا کر لاؤ۔

خلافت اور ملوکیت کی جنگ بہت پرانی ہے۔ شرار بولہبی اور چراغ مصطفوی کی چشمک سے کون واقف نہیں ہے؟ یہاں یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ "مردان خدا" کسی درباری معاملات میں ملوث تھے یا اپنے آپ کو کسی ایک فریق کا ساتھی بنانا چاہتے تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بہرام شاہ خود آپ کے پاس مشورے کے لیے بصد عقیدت حاضر ہوا تھا۔ آپ نے خود آگے بڑھ کر اس کو کوئی اچھا یا برا مشورہ نہیں دیا تھا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ سلطان محمد شاہ بہمنی خدا اور اس کے رسول کا باغی تھا اور بیچارا بہرام صرف اپنے بادشاہ سے سرکشی کے جرم میں پکڑا جانے والا تھا۔ ایک مرد حق پرست کے لیے دنیا کی یہ چھوٹی سی بغاوت اتنی سنگین نہیں تھی جتنی دین سے بغاوت تھی۔

غرض کہ جب قاضی شہر اور سلطان کا خاص ایلچی حضرت زین الدین شیرازی کی خدمت میں پہونچے اور سلطان کا پیام سنایا تو آپ نے نہایت صبر و سکون کے ساتھ ان کی ایک ایک بات سنی اور بڑی شگفتگی اور بذلہ سنجی کے ساتھ فرمایا کہ:

سنو بھائی! اگلے زمانے میں ایک سید صاحب ایک بہت بڑے عالم فاضل بزرگ اور ایک بیچارا مخنث کفار کے نرغے میں پھنس گئے۔ ان کافروں نے ان تینوں کو پکڑ کر کہا کہ تم تینوں میں سے جو شخص بھی ہمارے بت کو سجدہ نہیں کرے گا ہم اس کی گردن اڑا دیں گے اگر جان کی امان چاہتے ہو تو فوراً اس بت کو سجدہ کر دو۔ تینوں بہت چکرائے۔ عالم صاحب نے اپنا علم صرف کیا اور سوچا کہ اگر دل ایمان پر قائم ہو تو بدرجہ مجبوری اکراہ سے بھی کام کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے بڑی کراہیت کے ساتھ دل کو ایمان پر قائم رکھ کر بت کو سجدہ کیا اور اپنی جان چھڑائی۔

اس کے بعد سید صاحب کی باری آئی۔ جان بڑی پیاری ہوتی ہے سوچا کہ میں سید ہوں، آل رسول ہوں۔ میری شفاعت میرے جد امجد ضرور فرمائیں گے۔ اس یقین

کے ساتھ اس نے اپنا سر بت کے آگے جھکا دیا اور ان کی بھی گلو خلاصی ہوگئی آخر میں
بیچارے "مخنث" کی باری آئی تو اس نے کہا " میری تمام عمر اعمال ناشائستہ اور
گناہ میں گذر گئی۔ نہ میں عالم ہوں اور نہ سید جو بخشش کی توقع رکھوں میری جمع پونجی
اور توشۂ عاقبت صرف کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کے سوا کچھ بھی نہیں
اگر میں تھوڑی سی پونجی بھی اس وقت لٹا کر بیٹھ گیا تو کل حشر میں میری بخشش کا کیا
سامان ہوگا ؟ اس لیے بھائی مجھے تو معاف کردو۔ اگر سر کو تن سے جدا کرنا چاہتے ہو
تو کر ڈالو۔ کہ جان اسی کی امانت ہے اور وہ کلمہ پڑھ کر شہید ہوگیا۔

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہُوا

حضرت زین الدین شیرازی نے یہ حکایت بیان کی اور کہا کہ اپنے سلطان
بہمنی سے کہہ دو کہ میں اس مخنث سے بھی زیادہ ذلیل و خوار ہوں گا اگر تیرے دربار
میں جاکر تیری خلافت کا اقرار کروں۔

قاضی شہر نے یہ حکایت لفظ بلفظ سلطان کے روبرو سنادی اور آخر میں آپ کا
جملہ بھی دہرا دیا جس کے بعد سلطان محمد شاہ بہمنی کے غیض و غضب کی انتہا نہ رہی۔
لیکن آپ کے چہرہ کی مبارک پر بدستور سکون اور بے نیازی برستی رہی۔ سلطان نے
برافروختہ ہوکر حکم دیا کہ حضرت شیخ "زین الدین شیرازی" سے کہہ دو کہ وہ میرے شہر
(دولت آباد) سے نکل جائیں اور ایک پل کے لیے بھی یہاں نہ ٹھہریں۔

جب یہ حکم شاہی آپ تک پہونچا تو آپ نے پھر بے نیازانہ انداز میں تبسم فرمایا
بقول میر انیس

طبل علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہوکے کرے گا زمانہ کیا!

زمانے نے واقعی ان کا کچھ نہیں بگاڑا کیونکہ زمانہ خود انکی رہبری چاہتا تھا۔
حضرت زین الدین نے اپنے مصلے کو کندھے پر ڈالا اور حضرت برہان الدین غریب کے

مزار مبارک کے پاس اس کو بچھا کر بیٹھ گئے اور ببانگ دہل اعلان کیا کہ اب اگر
کوئی مرد میدان ہو تو وہ یہاں آئے اور مجھے یہاں سے اٹھائے۔

یہ تھی شاہان بے تاج کی بادشاہی کہ سلطان محمد بہمنی بالکل بے بس ہوکر
رہ گیا اور ان سے کوئی تعرض نہیں کیا۔

دنیا میں کوئی ایسا انسان آج تک ایسا پیدا نہیں ہوا جس کے سینے میں
دل اور ضمیر نہ ہو وہ چاہے کتنے طویل عرصے کے لیے خفتہ یا بے حس کیوں نہ پڑا رہے
انسان کی اپنی زندگی میں کبھی کبھی ضرور جاگتا ہے اور ایک نہ ایک وقت ایسا آتا
ہے جب آدمی اس کی خاموش آواز کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ یہی حال سلطان محمد شاہ
بہمنی کا ہوا۔ وہ اپنے شاہی دبدبے اور اقتدار کے نشے میں سرشار تھا لیکن حضرت
زین الدین شیرازی کی بے نفسی اور حق گوئی کو مانتا تھا اپنے کہنے پر پشیمان ہوا اور
تمہید کے طور پر آپ کے پاس کہلا بھیجا کہ۔

حضور زین الدین شیرازی صاحب ! آپ یہاں سے نکل کر کہیں جانے کی زحمت
نہ کریں بلکہ خلد آباد کی پہاڑیوں میں اپنے پیر کے مقبرے کے پاس ہی اقامت اختیار کریں
اس کے جواب میں آپ نے سکوت اختیار فرمایا لیکن خدا کی ذات مقلب القلوب
ہے۔ سلطان کی دنیا بدلنے کا وقت آچکا تھا۔ آپ کے سکوت پر اس کی بیقراری ختم
نہیں ہوئی۔ اس نے ایک پیام اور بھیجا کہ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں توبہ کرتا
ہوں اور آئندہ سے احکام شریعت کی پابندی کا وعدہ کرتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی
ایک شعر اپنے دست خاص سے لکھ کر بھیجا وہ یہ تھا

من زاں تو ام توزاں من باش
خوش باشد عشق اتفاقے

آپ نے اس کا پیام سنا شعر پڑھا اور جواب میں فرمایا کہ اگر غازی سلطان
محمد شاہ بہمنی شریعت محمدی کی حفاظت کرے اور اپنی سلطنت سے شراب کی سازی
دوکانیں ختم کردے اور اپنے باپ کے طریقہ پر عمل کر عالمان دین اور شاہی

کارندوں کو حکم دے کہ وہ امر معروف ونہی "حق و باطل کا فرق لوگوں کو بتائیں اور خود بھی اس پر عمل پیرا ہوں تو میں یعنی زین الدین فقیر سے بڑھ کر اس کا کوئی اور دوست نہیں ہوگا۔ اور پھر اس کے شعر کے جواب میں یہ رباعی اپنے دست مبارک سے لکھ کر بھیج دی۔

تاسن بزیم بہانہ خوئی نہ کنم — جز نیک دلی و نیک خوئی نہ کنم
آں ہاکہ بجائے من بدیہا کردند — گر دست رسد بجز نیکوئی نہ کنم

سلطان محمد شاہ اپنے نام کے ساتھ غازی کا خطاب دیکھ کر بہت مسرور ہوا اور اس کے بعد سے لفظ غازی کو اپنے نام کا جز بنالیا اور اسی روز مرہٹواڑی کا مقبوضہ علاقہ مسند علی خان کی نگرانی میں دے کر خود گلبرگہ "روانہ ہوا (واضح ہو کہ بہمنی سلطنت کا پہلا دارالخلافہ دولت آباد تھا۔ اس کے بعد گلبرگہ (کرناٹک) دارالخلافہ بنا لیکن دولت آباد کی حیثیت ثانوی دارالخلافے کی باقی رہی) گلبرگہ پہنچ کر اس نے فوراً شراب نوشی اور شراب کی کشید اور خرید و فروخت پر پابندی لگا دی۔ چوروں ڈاکوؤں اور رہزنوں کی سرکوبی اور سرزنش کے لیے سخت سے سخت احکام جاری کیے اور حکم دیا کہ جس قدر قاتل رہزن اور ڈاکو ملیں ان سب کے سر کاٹ کر فوراً یہاں روانہ کر دو تاکہ ہمیں انتظامیہ کی کارکردگی کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

ظاہر ہے کہ اگر کسی برائی یا خرابی کی روک تھام صدق دل کے ساتھ حکام بالا اور افسران شاہی کرنے لگیں تو نیچے والے بے بس ہو جاتے ہیں اور عوام خود بخود راہ راست پر آجاتے ہیں چنانچہ صرف چھ سات ماہ میں بیس بائیس ہزار مجرموں کے سر کاٹ کر گلبرگہ روانہ کر دیے گئے۔ پوری بہمنی سلطنت میں چوروں اور رہزنوں کا نام و نشان باقی نہ رہا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں سکون کی نیند سونے لگے۔ مسافروں اور تاجروں کے لیے راستے محفوظ اور مامون ہو گئے۔ سال چھ مہینے کے اندر سلطان محمد شاہ بہمنی نے ایسا اسلامی نظام عملی طور پر قائم کر دیا کہ لوگ آج تک مثال دیتے ہیں۔ یہاں ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ بہمنی سلطنت میں اکثریت غیر مسلموں کی تھی لیکن جب حکام نے اسلامی شعار اختیار

کیے اور ان سے فراخدلی اور رواداری کا سلوک کیا، ان کو مذہبی معاملات میں پوری پوری آزادی دی تو وہ بھی حاکم وقت کا کلمہ پڑھنے لگے۔

سلطان محمد شاہ بہمنی نہایت سرخروئی کے ساتھ دولت آباد واپس آیا اور جب تک زندہ رہا حضرت زین الدین شیرازی کے حضور سر نیاز خم کرتا رہا۔ مندرجہ بالا واقعات کا اشارہ تاریخ فرشتہ میں بھی موجود ہے اور حضرت غلام علی آزاد نے تو اپنی کتاب میں بڑی تفصیل سے ان امور کا ذکر کیا ہے۔

اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جب تک انسان عملی طور پر اصلاح کی طرف قدم نہ اٹھائے معاشرے کا بگاڑ درست نہیں ہو سکتا۔ شاہان وقت کے درباروں میں کلمہ حق کا کہنا ان درویشوں اور ولیوں کا کام رہا ہے جو دنیا اور اس کی ہوس سے بے نیاز رہے ہیں۔ جلد یا بدیر انکی یہی بے نیازی صداقت اور خلوص ایسا رنگ لایا کہ نہ صرف حاکم وقت کی دنیا بدلی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ پورا نظام مملکت تبدیل ہو گیا۔

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

دور ابراہیمی مدت ہوئی ختم ہو گیا اس کی تلمیحات اور استعارے باقی رہ گیے لیکن یہ حقیقت آج بھی زندہ ہے کہ قوت ایمانی آگ کو گلزار میں تبدیل کر سکتی ہے۔ اس کے لیے سب سے بہتر مثال حضرت خواجہ معین الدین چشتی سلطان ہند کی حیات طیبہ کا ایک واقعہ ہے کہ جب اجمیر کے نواح میں آپ کا مقابلہ ہندو جوگیوں سے ہوا تو ان میں سے کسی نے کہا کہ "ہم نے یہ سنا ہے کہ اللہ رسول کے نام کا کلمہ پڑھنے والے مسلمانوں کو عذاب کی آگ نہیں جلاتی۔ آپ کا درجہ تو بہت بڑا ہے۔ اگر آپ کا دین سچا اور خدا کی وحدانیت برحق ہے تو ہم آگ جلاتے آپ اس میں اپنا ہاتھ یا پیر رکھیں۔ ہم دیکھیں گے کہ آپ جلتے ہیں یا نہیں۔

کفار کا یہ بہت بڑا چیلنج تھا۔ سلطان ہند نے فرمایا، اچھا تم آگ جلاؤ اور خدا

کی قدرت کا تماشا دیکھو۔ اس کے بعد آپ نے دو رکعت نماز نفل ادا کی۔ خدا سے مدد چاہی اور ایک مرتبہ جذب کے عالم میں اپنے دونوں تعلین (جوتے) اتار کر آگ میں ڈال دیئے اور کہا کہ " معین الدین تو معین الدین ہے اس آگ کی یہ مجال بھی نہیں ہے کہ میری جوتیوں کو جلا سکے"۔

ایمان کی پختگی، یقین کے استحکام، خدا سے قربت، اس کے رسول سے محبت سلطان ہند اپنا جواب آپ تھے۔ آگ کے شعلے بلند ہوتے رہے اور آپ کی جوتیاں بدستور اس میں رکھی رہیں۔ کفار کے لیے اب مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہ تھی سوائے اس کے کہ اسی خدائے واحد کا کلمہ پڑھ لیں جس نے آگ سے جلانے کی تاثیر وقتی طور پر سلب کر لی تھی۔

اس قسم کی کرامت خواجہ صاحب سلطان ہند کے علاوہ برصغیر کے کسی اور ولی میں ہو تو ہو لیکن میری نظر سے نہیں گذری۔ البتہ مولانا غلام علی آزاد اپنی مشہور کتاب روضۃ الاولیاءؒ میں تحریر فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک درویش جو جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر ان کو فروخت کرتا اور اپنا پیٹ پالتا تھا لکڑیوں کا ایک گٹھر لے کر حضرت برہان الدین کی خانقاہ میں حاضر ہوا تاکہ تبرکاً اور مساکین کے لیے کھانا تیار کیا جاسکے لیکن جب ان کو سلگایا گیا تو ایک لکڑی بھی نہیں جلی۔ لوگ حیران رہ گیے۔ آگ جلا کر پھونکیں مارتے رہے لیکن لکڑیاں آگ پکڑنے کا نام نہ لیتی تھیں۔ آخر اس لکڑہارے سے پوچھا گیا کہ کیا بات ہے لکڑیاں کیوں نہیں جل رہی ہیں۔ تم ان کو کہاں سے کاٹ کر لاتے ہو۔ اس نے جواب دیا میں جہاں سے روز لاتا ہوں وہیں سے لایا ہوں۔ البتہ راستے میں، میں تھک کر حضرت زین الدین شیرازی کے مکان کے پاس رک گیا۔ گٹھا ان کی دیوار سے لگا کر کھڑا کر دیا۔ تاکہ اٹھانے میں آسانی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہ آگ سے محفوظ ہیں۔ اس کرامت کے بعد مصنف موصوف حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ :

" سبحان اللہ ! یہ اس مکان کی فضیلت ہے کہ جس میں آپ کا قدم چند سال رہا تھا اور آپ کے قدموں کی برکت اور فیضان سے وہ مکان اس قدر متبرک ہو گیا کہ لکڑی پر آگ کا اثر نہ ہوا۔ یہ تو بے جان تھی تو جاندار صاحب عقیدت پر اس دیوار متبرک

سے گذرنے یا آپ کی تربت منور کی زیارت سے کہ مدت دراز سے مخزن اسرار و انوار ہے۔ آپ کے جسم اطہر و روح مقدس کا بنا ہوا ہے۔ یقین ہے کہ دوزخ کی آگ اثر نہیں کرے گی۔

اسی عقیدت کی بنا پر خلد آباد میں قدیم دستور ہے کہ لوگ اپنے جنازوں کو آپ کے مکان کی دیوار سے گذارتے ہوئے درگاہ مولانا برہان الدین غریب میں لے جاتے ہیں"

حضرت زین الدین داؤد شیرازی کی اور بھی بہت سی کرامتیں آپ کے سوانح حیات میں منقول ہیں۔ مثال کے طور پر خواجہ شمس الدین کردیؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ دولت آباد کی طرف آرہا تھا لیکن راستہ بھٹک کر کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ یہاں تک کہ سورج ڈھلا شام ہوئی اور رات کی تاریکی بڑھنے لگی اور میں پورا دن اور پوری رات جنگل بیابان مارا مارا پھرتا رہا جب رات کٹنے اور راہ ملنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آئی تو میں نے حضرت زین الدین شیرازی کو یاد کیا اور عرض کی کہ اے گم گشتگان بیابانِ ذلالت کے رہنما آپ کہاں ہیں۔ میں کب سے بھٹک رہا ہوں۔ دل کی صدا زبان پر آئی عقیدت کے آنسو آنکھوں میں آئے۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو آپ سامنے کھڑے ہیں۔ اشارے سے مجھ گنہگار کو اپنے پاس بلایا۔ خود آگے آگے چلے اور مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ چند لمحوں بعد میں شارع عام پر پہنچ گیا۔ اور مولانا نظروں سے غائب ہو گیے۔

اسی طرح آپ کے پیر بھائی نے بتایا کہ جب مسلمانوں نے گلبرگہ کے قلعہ کا محاصرہ کیا تو میں بھی اس لشکر میں موجود تھا۔ اتفاق سے دشمنوں کے ہاتھ لگا۔ انھوں نے میری مشکیں کس لیں اور موت کی سزا تجویز کر دی۔ شاید اس لیے کہ وہ جو راز مجھ سے اگلوانا چاہتے تھے وہ میں جانتا تک نہیں تھا۔ مجھے موت سامنے نظر آرہی تھی۔ میں قلعہ کے اندر مقید تھا میری موت کا پروانہ میرے ہاتھ میں تھا۔ مثل مشہور ہے کہ مرتا کیا نہ کرتا۔ اس وقت میں نے حضرت زین الدین کو صدق دل سے یاد کیا۔ اپنے سامنے پایا اور انھوں نے پلک جھپکتے ہی مجھ سے فرمایا کہ " فکر نہ کریں تازہ وضو کر کے تیرے ہی کام کیلئے نماز میں مصروف ہوتا ہوں۔ اس کے بعد وہ تو میری نظر سے اوجھل ہو گیے اور میرے دشمن پھر میرے پاس

آئے لیکن خدا ہی بہتر جانے کہ انھوں نے کیا سوچا کیا سمجھا کہ میری رسیاں کھول دیں اور مجھے ڈھکیل کر قلعے سے باہر نکال دیا۔

حضرت زین الدین شیرازی کی حیات پاک میں دو چیزیں بڑی تفصیل سے ملتی ہیں۔ ایک آپکی کرامات جن کا سلسلہ طویل ہے اور دوسرے آپ کے بیش بہا ملفوظات اور قرآن پاک کی آیات کی تفسیر جو آپ نے وقتاً فوقتاً اپنے ارباب اور شاگردوں کو بتائی ہیں۔ ان کے ملفوظات بھی آپ کے ایک مرید سید میر حسن نے مرتب کیے ہیں۔ اس کتاب کا نام ہدایت القلوب ہے۔

حضرت زین الدین شیرازی نے طویل عمر پائی۔ ۱۳ ربیع الاول ۷۷۱ھ سے آپکی علالت کا آغاز ہوا۔ زکام کھانسی اور بخار کی تکلیف اس حد تک بڑھی کہ آپ پانی کے علاوہ کوئی اور چیز کھانے کے قابل نہیں رہے۔ جس سے دن بدن ضعف میں اضافہ ہوتا گیا لیکن اس کمزوری کے باوجود آپکی نماز کے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا۔ فرض اور سنت نمازوں کے علاوہ وظائف اور مستحبات کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اس عرصے میں آپ کا قیام مستقل طور پر خلد آباد ہی میں رہا چونکہ خلد آباد پہاڑ کی بلندیوں پر ہے اور وہاں کی آب وہوا سرد ہے اس لیے آپ کے خادموں نے عرض کیا کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہم آپ کو دولت آباد لے چلیں جہاں آپ کا پرانا مکان ہے۔ تجویز نہایت مناسب تھی کیونکہ دولت آباد کی بستی مقابلتاً قدرے نشیب میں ہے لیکن اللہ رے اپنے پیر ومرشد کی محبت آپ نے فرمایا۔

" مجھے یہیں رہنے دو کہ اپنے شیخ کے آستانے پر جان دوں کیونکہ آخر میں تم لوگ مجھے یہیں لاؤ گے۔

جس روز آپ کو اپنے خالق حقیقی سے ملنا تھا اس روز آپ نے بطور خاص ہاتھ اٹھا کر تین بار نہایت خشوع وخضوع سے سورہ فاتحہ کی تلاوت کی۔ ایک مرتبہ اپنے پیر ومرشد کی روح کے ایصال ثواب کے لیے دوسری بار سلامتی ایمان کے لیے اور تیسری بار دفع آفات وبلیات کے لیے کیونکہ یہی آپ کا روزمرہ کا معمول تھا۔

ظہر کے بعد سے آپکی حالت اور بگڑی اس وقت آپ کے پاس حضرت خواجہ شہاب الدین اور حضرت برہان الدین غریب کے بعض خدام مثلاً شمس الدین فضل اللہ مولانا تاج الدین، خواجہ رجیب علی اور مولانا نصیر الدین، امام موجود تھے۔ ان میں سے خواجہ شہاب الدین نے دست بستہ عرض کی کہ آپ کے خادم آپ کی خدمت میں معروضہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ حکم ہو تو عرض کریں!

فرمایا۔ میں جانتا ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو! اس کے بعد آپ نے طویل سکوت اختیار کیا اور تھوڑی دیر بعد خود بخود پوچھا کیا اذان ہو گئی؟

جواب میں خواجہ شہاب الدین نے کہا۔ "جی نہیں لیکن نماز کا وقت آگیا ہے۔" اس کے بعد آپ نے اپنے تمام خادموں کو نماز کی تاکید کی اور خود بھی اٹھ کر مصلے پر آگئے۔ نماز کے بعد آپ کے خادم ارادت مند اور مرید پھر آپ کے گرد حلقہ بنا کر کھڑے ہو گئے کہ شاید آپ کو وصیت یا نصیحت فرمائیں یا اپنے بعد کسی کو خلیفہ بنانے کا اعلان کریں لیکن اس وقت بھی آپ خاموش رہے۔

دلیل السالکین دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت آپکی ملکیت میں پانچ چھ گز لمبا سوتی کپڑا پھلوں میں تین کیلے اور کھانے میں تھوڑی سی گل چوری تھی جو ایک دن قبل کسی نے آپ کی نذر کی تھی۔ البتہ آپ کا اصل اثاثہ وہ بہت بڑا کتب خانہ تھا جو سینکڑوں نادر اور علمی کتابوں پر مشتمل تھا۔ آپ نے اپنے خادم خاص خواجہ شہاب الدین سے فرمایا کہ یہ کپڑا فلاں غریب کو دیدو۔ کیلے جا کر فلاں درویش کو کھلا دو اور یہ گل چوری میری طرف سے فلاں محتاج کے نذر کر دو اور میرا کتب خانہ طالب علموں کے لیے وقف کر دو اللہ کا شکر ہے کہ میں اب اسباب دنیاوی سے بالکل آزاد ہو چکا ہوں۔ اس کے بعد آپ نے پلنگ یا چارپائی پر کچھ دیر آرام فرمایا لیکن اپنے خرقہ خاص کے بارے میں نہ کوئی وصیت کی اور نہ اس کو کسی کو عطا کیا۔

تھوڑی دیر بعد خواجہ شہاب الدین نے اس سلسلے میں پھر استفسار کیا لیکن آپ نے بدستور خاموشی اختیار کی اور دوسری بار کے سوال پر کہا۔ مجھے اس وقت تنگ نہ کرو۔

شمس الدین فضل اللہ نے اس حالت کو دیکھ کر خاموش کر دیا۔ غرض کہ آخری وقت تک آپ نے خواجگان چشت کا یہ خرقہ کسی کو عطا نہیں کیا۔ اور نہ اس خرقے کی مناسبت سے اپنے کسی خاص خلیفہ کو نامزد کیا۔ اپنی زندگی میں اپنے کسی مقرب مرید یا پیرو کار کو کسی اور سے بیعت لینے کی اجازت نہیں دی۔

آخر وقت میں جب آپ سے واضح طور پر خرقے کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔ خلافت ایک بارگراں ہے اور میں اب اس کی لیاقت یا اہلیت کسی میں نہیں پاتا۔ اس کے بعد آپ پر غشی طاری ہوگئی لیکن نماز کے وقت پھر آپ کو ہوش آیا۔ آپ اس فرض کی ادائیگی کے لیے اٹھے اور سجدے کی حالت میں اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی انا للہ وانا الیہ راجعون۔

۲۵ ربیع الاول ۷۷۱ھ کو آپ کا وصال ہوا اور آپ کو دوسرے روز جو یعنی ۲۶ ربیع الاول کو ان کے حجرہ مبارک میں دفن کر دیا گیا۔ جہاں آپ پہلے ہی سے اپنے پیرو مرشد حضرت برہان الدین غریب کے مزار کے سامنے رہا کرتے تھے۔

روضۃ الاقطاب کے مطابق آپ کے دس مقرب مرید تھے جن کا درجہ خلافت کا تھا اور ان میں سے چند کو آپ نے اپنے تبرکات مثلاً عصا، عمامہ اور اپنا ذاتی خرقہ بھی دیا تھا۔ ان دس اصحاب کے نام یہ ہیں۔

۱۔ حضرت خواجہ مولانا یعقوب ۲۔ خواجہ سید یوسف
۳۔ کوچک شاہ ولی ۴۔ سید سادات
۵۔ سید بلال ۶۔ بابا حمید
۷۔ سید میر حسن ۸۔ سید میران سمنان
۹۔ مولانا معز علی شاہ ۱۰۔ خواجہ محمد لشکری

ان میں سے میران سمنان صاحب کا مزار مبارک "میرج" مرتضےٰ آباد میں ہے اور مولانا معز دریائے گوداوری کے کنارے تعلقہ پٹن ضلع اورنگ آباد میں دفن ہیں۔ ان دس ناموں کے علاوہ چند روایتوں کے مطابق ایک گیارہواں نام بھی ملتا ہے۔

وہ "ملک راجہ" کا ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آپ نے اس کو اپنا خلیفہ بھی بنایا تھا۔ اور اپنے جسم کا خرقہ بھی عنایت کیا تھا۔

ملک راجہ کی خلافت مشکوک سہی لیکن اس کی شخصیت مشکوک نہیں ہے۔ وہ حضرت زین الدین شیرازی کا خلیفہ ہو یا نہ ہو اس سے اس کے کارناموں اور خواجگان چشت سے بے پناہ عقیدت سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔

ملک راجہ دراصل "خان جہان فاروقی" کا بیٹا تھا جو سلطان علاؤالدین خلجی کے دور میں امرائے سلطنت میں شامل تھا اور اس کے بعد تغلق کے دور حکومت میں بھی اس کا شمار عمائدین اور درباریوں میں رہا۔ وہ اپنی زندگی کے بہترین دن گذار کر اس دنیا سے رخصت ہوگیا لیکن اس کا بیٹا ملک راجہ سلطنتوں کے انتشار اور جوڑ توڑ کی سیاست کی بنا پر اپنے باپ کے عہدے تک نہ پہنچ سکا۔ اس میں دارالخلافہ کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اس کی تقدیر کی گردش بھی شامل تھی چنانچہ چند برسوں بعد باپ کی جمع پونجی ختم ہوگئی اور وہ فیروز شاہ تغلق کے خاص سواروں میں بھرتی ہوگیا۔ منصب جاگیر اور جائیداد تو کجا اب تو اس کے لیے "سواروں" کی طرح تنخواہ مقرر تھی۔ جس سے وہ بمشکل اپنے اور اپنے بیٹے نصیر خان کا گذر کر رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ اچھے دن دیکھنے کے بعد برے دن دیکھنا بڑا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے بیچارا ملک راجہ اپنا غم غلط کرنے کے لیے شکار کھیلنے جانے لگا۔

اتفاق سے ایک مرتبہ وہ گجرات کے علاقے میں شکار کھیل رہا تھا اور اس زمانے میں وہاں یعنی گجرات میں فیروز شاہ بھی آیا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ لاؤ لشکر تھا۔ اس کا شکار شاہباز تھا لیکن کھیل پھر کھیل ہی ہے۔ وہ ایک شکار کے پیچھے دوڑتے دوڑتے شاہی شکارگاہ سے چودہ پندرہ کوس دور نکل گیا اور جب شکار ہاتھ نہ آیا تو ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا تھکان کے علاوہ وہ اس وقت بھوک پیاس سے بھی نڈھال ہو رہا تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے اور کہاں جائے۔ اس جنگل میں نہ کوئی آدمی تھا نہ آدم زاد۔ یکایک سامنے نظر پڑی دیکھا تو ایک سوار آتا ہے جو اپنے شکاری کتوں کے ساتھ شکار میں مصروف ہے۔ واقعی بھوک بری بلا ہے۔ شکاری نے شکار کو پہچانا اور فیروز شاہ خود آگے بڑھا اور پوچھا تیرے

پاس کوئی کھانے کی چیز ہے۔ میں بھوکا ہوں۔

جواب میں اجنبی شکاری یعنی ملک راجہ نے بڑے شستہ اور شائستہ لہجے میں بات کی اور بڑے ادب اور سلیقہ سے جو کچھ حاضر تھا اپنے شکاری دوست کے سامنے رکھ دیا اور مودب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ فیروز شاہ تغلق سمجھ گیا کہ یہ عام آدمی نہیں ہے بلکہ اچھے گھرانے کا مہذب اور متمدن آدمی ہے۔ غور سے اس کا چہرہ دیکھا جس پر وجاہت اور تمکنت تھی پھر سوال کیا۔

بھائی! تم کون ہو؟ اور کہاں رہتے ہو!

میں خان جہاں فاروقی کا بیٹا ہوں۔ میرا نام ملک راجہ ہے۔ ویسے میں آپ کے خاص سواروں میں ملازم ہوں۔

فیروز شاہ اس جواب سے چونک پڑا کیونکہ وہ خان جہاں فاروقی کے نام اور رتبے سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ اور اس وقت پیٹ کی آگ بجھانے کے بعد تو وہ اپنے آپ کو اس کا احسان مند سمجھ رہا تھا۔ اس لیے اس نے حکم دیا کہ آئندہ دربار کے موقع پر ملک راجہ کو پیش کیا جائے۔

فیروز شاہ نے اس کو پہلے دو ہزاری منصب پر فائز کیا اور بعد کو خاندیش اور اس کے مضافات کی حکومت اس کو عطا کر دی۔ ملک راجہ نے ۷۷۲ھ میں قرب وجوار کے علاقوں کو اپنے زیر نگیں کیا۔ اپنی سلطنت کی حدود کو وسعت دی اور برسوں تغلق حکومت کا نمک خوار رہنے کے بعد بالآخر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

ملک راجہ حضرت زین الدین شیرازی کا مرید تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس کو خواجگان چشت سے بے پناہ عقیدت تھی۔ اس نے مرتے وقت اپنے بیٹے نصیر خان کو ولی عہد مقرر کیا اور خاندیس میں فاروقی سلطنت کی بنیاد ڈالی جنہوں نے دو سو برس تک بڑی تمکنت سے حکومت کی اور ہر مرنے والا بادشاہ اپنے جانشین کو اپنی سلطنت کے ساتھ ساتھ خلافت بھی دیتا گیا۔ (وہی خلافت جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ فاروقی سلاطین کو زین الدین شیرازی سے ملی تھی)

نصیر الدین فاروقی نے تخت نشینی کے بعد تاپتی کے کنارے زین آباد اور برہان پور نامی شہر آباد کیے۔ برہان پور کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ یہ وہی مقامات ہیں جہاں حضرت برہان الدین غریب نے نماز کے بعد دعا کی تھی کہ اللہ کرے یہاں ایک شہر آباد ہو اور اسکی آبادی اور خوشحالی میں روز افزوں ترقی ہو۔ آپ کی دعا قبول ہوئی۔ تاپتی ایک کنارے برہان پور اور دوسرے کنارے زین آباد اب بھی خواجگان چشت کی دعاؤں سے آباد ہیں اور فاروقی سلاطین کے حسن انتظام اور عقیدت و احترام کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دولت آباد اور خلد آباد کے بعد برہان پور خواجگان چشت کا دوسرا بڑا مرکز بن گیا۔ حضرت یوسف چشتی (وفات ۹۵۰ھ) شیخ احمد چشتی (وفات ۹۶۵ھ) شیخ بہاء الدین باجن (وفات ۹۱۲ھ) نظام الدین بھکاری چشتی سب خاص برہان پور میں مدفون ہیں اور انکی درگاہیں مرجع خاص و عام ہیں۔

فاروقی سلطنت میں اس وقت گجرات اور احمد نگر تک کے علاقے شامل تھے۔ اگر ان کو بھی شامل کر لیا جائے تو کم سے کم چالیس پچاس اولیاء اللہ کے نام ملتے ہیں جو وہاں کی خاک کو پرنور کیے ہوئے ہیں۔ ان کے اسمائے گرامی اور دیگر کوائف ہم آخر میں درج کریں گے۔ یہاں پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ خاندیس کے فاروقی سلاطین نے نہ صرف زر کثیر خرچ کر کے یہ درگاہیں اور وسیع و عریض خانقاہیں تعمیر کی تھیں بلکہ ان کی دور اندیشی ملاحظہ کیجیے کہ انہوں نے لق و دق صحن سیاہ پتھروں کی سلوں سے اس طرح پاٹ دیئے ہیں کہ اب ان میں نہ کھدائی ہو سکتی ہے اور نہ وہاں کوئی مزار بن سکتا ہے اور یہی حالت خانقاہوں کی ہے۔ اگر وہ یہ بندش نہ کرتے تو درگاہ کا اصل صحن اور خانقاہیں عقیدتمندوں اور مریدوں کے مزارات سے بھر چکی ہوتیں اور زائرین اصل مزار تک نہ پہنچ سکتے جیسا کہ اکثر ملتان کی درگاہوں میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں زائرین بے کھٹکے عقیدت کے پھول لیے ہوئے دندناتے ہوئے حجرۂ مبارک تک پہنچ جاتے ہیں اور راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ملتی۔

فاروقی سلاطین نے یہ درگاہیں دوہرے چبوتروں یا دوہری کرسی کے علاوہ

دوہرے احاطوں پر بنائی ہیں۔ ایک حد کلاں کہلاتا ہے ایک حد خورد۔ اسی لیے درگاہ کے باہر قبرستان کے لیے بہت بڑی جگہ موجود ہے جہاں لوگوں نے مزار بنوائے ہیں۔

یہی نہیں بلکہ سلاطین فاروقی نے ان درگاہوں کے لیے بڑے بڑے گاؤں اور زرعی زمینیں ان درگاہوں کی دیکھ بھال اور سجادوں کے گزر اوقات کے لیے وقف کی تھیں۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ بہمنی سلطنت کے خاتمے کے بعد جب نظام شاہی حکومت قائم ہوئی تو خاندیس کی حکومت بھی اسی میں ضم ہو گئی لیکن انھوں نے اس وقف کو جوں کا توں برقرار رکھا۔ درگاہوں کی حرمت اور خواجگان چشت کی عقیدت میں فرق نہ آیا۔ اس کے بعد مغلوں نے یہ علاقہ فتح کیا تو جہانگیر سے لے کر عالم گیر تک ان اوقات کی نہ صرف توثیق کرتے رہے بلکہ ان میں اضافہ کرتے رہے اور آخر میں نظام الملک آصف جاہ اول نے ان میں اور اضافہ کیا اور ۱۹۴۸ء تک یہ وقف برقرار رہا اور اس کے موجودہ حکومت بھی اس کو ختم نہ کر سکی جو علاقے ان درگاہوں کے لیے وقف تھے وہ اب بھی وقف ہیں۔ ان کی دستاویزات کی نقل میرے پاس ہے جو میں خواجگان چشت کی طویل فہرست کے ساتھ منسلک کر دی گئی۔

"ہجوم عقیدت منداں"

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکی ہوں کہ حضرت برہان غریب اور ان کے خلیفہ حضرت زین الدین شیرازی (بائیس خواجہ) کی درگاہیں بالکل آمنے سامنے ہیں۔ ایک میں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک ہیں اور دوسرے میں وہ خرقہ ہے جس کا میں ذکر کر چکی ہوں چونکہ حضرت زین الدین شیرازی کے یہاں کا خرقہ بھی حضور اقدس سے منسوب ہے لہذا ان دونوں تبرکات کی زیارت مشترکہ طور پر ۱۲ ربیع الاوّل کو ہوتی ہے۔ اسی دن خلد آباد کی پوری بستی دلہن کی طرح سجی رہتی ہے۔ پھولوں اور عطر کی خوشبو سے وہ چوڑی سڑک جو ان دونوں درگاہوں کے درمیان سے گذرتی ہے۔ دور دور تک مہکتی ہے۔ خانقاہوں میں سر شام چراغ روشن ہو جاتے ہیں۔ ایک ایک دوکان سجائی جاتی ہے۔ مسجدیں آراستہ ہوتی ہیں۔ جگہ جگہ فقرا اور مساکین کے لیے پانی کی سبیلیں،

کھانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ پھول شیرینی اور اگر بتی جگہ جگہ ملتی ہے۔ کھانے پینے کا اہتمام باحیثیت لوگوں کے علاوہ خادمان درگاہ کی طرف سے بھی کیا جاتا ہے کیونکہ اس موقع پر لوگ دور دور سے آتے ہیں اور ان کے جتھے کے جتھے خانقاہوں میں مقیم ہوتے ہیں۔ گیارہ (دربارہ ربیع الاوّل کی رات قرآن خوانی مولود شریف اور درود وسلام میں گذرتی ہے اور محبان رسول ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔

۱۲ ربیع الاول کی صبح ۸ بجے فاتحہ کی شیرینی، پھول، عطر، لوبان، اگر بتی بڑے منظم جلوس کے ساتھ حضرت خواجہ منتجب الدین زر زری زر بخش کی درگاہ پر یہاں سے لے جایا جاتا ہے۔ ایک کلومیٹر کے فاصلے پر یہ دونوں بارگاہیں ہیں۔ راستے بھر سر ہی سر نظر آتے ہیں۔ جلوس کے ساتھ ہر قسم کے باجے، ڈفلیاں اور سلامی دینے والے بندوقچی چلتے رہتے ہیں۔ یہ جلوس واقعی دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی بڑے شہنشاہ کی سواری آ رہی ہے۔ وہاں پہونچ کر یہ جلوس حضرت منتجب الدین کے مزار مبارک پر فاتحہ پڑھتا ہے اور اس کے بعد حضرت زین الدین شیرازی کے مزار پر حاضری دیتا ہوا واپس حضرت برہان الدین غریب کی خانقاہ میں آتا ہے یہاں کچھ لوگ شامل مجلس ہو جاتے ہیں۔ ظہر کے وقت تک لنگر اور کھانے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس کے بعد ان میں وسیع خانقاہوں اور صحن میں قرآن خوانی ہوتی ہے جس میں آدھے سے زیادہ اورنگ آباد واپس آ جاتا ہے۔ بمبئی خاندیس اور برہان پور کے حفاظ بصد عقیدت آتے ہیں۔ اس وقت یہاں کا مجمع اور رونق اتنی ہوتی ہے کہ اس کا تصور ناممکن ہے۔

تلاوت قرآن خوانی کے بعد میلاد پڑھا جاتا ہے اور ساری محفل درود وسلام کی آوازوں سے گونجتی ہے۔ اسی اثنا میں خانقاہ کے صحن میں نصب شدہ شامیانے کے درمیان ایک بڑا سا منبر رکھا جاتا ہے اور لوگوں کا اضطراب اور بے قراری ہوتی ہے۔ سب کی آنکھیں حجرے کی طرف لگی رہتی ہیں کہ کب دروازہ کھلے اور موئے مبارک کی زیارت نصیب ہو۔ وقت مقررہ پر خادمان خاص موئے مبارک کا صندوقچہ ہاتھوں ہاتھ

لیے درود و سلام پڑھتے ہوئے بارش انوار میں منبر کی طرف آتے ہیں اور لوگ پروانہ وار اس کی زیارت سے مشرف ہوتے ہیں یہاں تک کہ مغرب کا وقت آتا ہے اور یہی ہجوم خرقہ مبارک کی زیارت کے لیے درگاہِ حضرت زین الدین شیرازی روانہ ہوتا ہے۔ یہاں خرقہ مقدس رکھا ہوا ہوتا ہے۔ وہاں بھی ایک منبر آراستہ ہوتا ہے اور سارا اژدہام خرقہ مبارک کو ایک نظر دیکھنے کے لیے بے قرار رہتا ہے اور رات گئے تک یہ نورانی محفل جاری رہتی ہے۔

حضرت زین الدین داؤد شیرازی کے مزار مبارک پر ایک مرتبہ ۱۲ ربیع الاول کو عقیدت مندوں کا ہجوم ہوتا ہے اور دوسری بار ۲۵ اور ۲۶ ربیع الاول کو ان کے عرس مبارک کے موقع پر اس مرتبہ پھر اسی دالان کے سامنے بہت بڑا شامیانہ نصب کیا جاتا ہے اور اس میں بہت وسیع فرش ہوتا ہے اور بستی کے لوگوں کے ساتھ ساتھ دور دور سے عقیدت مند مالیدے (ملیدے) کی تھالیاں ہاتھوں میں لیے بصد عقیدت یہاں آتے ہیں۔ ہر ہر تھالی پھولوں اور خوشبو سے آراستہ ہوتی ہے۔ اور ان پر آٹے کے چراغ گھی سے روشن کیے جاتے ہیں۔ یہ زائرین ملیدے کی تھالیاں لیے فرش پر باادب بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کے گلوں میں سبز سرخ اور سنہرے دھاگوں کی خوبصورت بدھیاں ہوتی ہیں۔ یہ لوگ جب تک محفل ختم نہ ہو ان چراغوں کو بجھنے نہیں دیتے کیونکہ یہ بائیس خواجہ کی بارگاہ ہے یہاں ہر چراغ زبان حالی سے کہتا ہے کہ ؎

الٰہی تا بود خورشید و ماہی   چراغ چشتیاں را روشنائی

عشا کے بعد محفل سماع شروع ہوتی ہے جو آدھی رات کو رنگ پر آتی ہے۔ اور تین بجے شب کے قریب ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے خاتمے پر شامیانے کے درمیان ایک اور منبر یا تخت رکھا جاتا ہے اور درگاہ کے متولی اس پر کھڑے ہو کر ختم خواجگان پڑھتے ہیں۔ اس میں کلام نہیں ہے کہ یہ ختم اقلیم ہند کے تمام ختموں سے القاب و آداب طرز ادا اور لب و لہجے کے لحاظ سے یا کسی شہر اور سب میں بہترین ہوتا ہے جو صبح کے وقت تک جاری رہتا ہے جب یہ ختم شریف خاتمے کے قریب ہوتا ہے تو سارے عقیدت مند 'اجوائن' کی پوٹلیاں، پڑیاں لیے آگے بڑھتے ہیں تاکہ

پڑھنے والا ان پر دم کر دے اور سال بھر تک یہ اجوائن درد شکم کے لیے بطور اکسیر استعمال ہوتی رہتی ہے۔

بیچارا سجادہ نشین ختم خواجگان پڑھتے پڑھتے دعائیں مانگتے مانگتے پہلے ہی تھک چکا ہوتا ہے۔ ادھر سے ہر آدمی دم کروانے کے لیے کھڑا ہوتا ہے۔ بیچارا صبح تک نڈھال ہو جاتا ہے۔

ختم خواجگان کو پوری عقیدت مندی کے ساتھ پڑھتے ہوئے سننے اور درد بھری دعاؤں پر آمین کہنے کے لیے بمبئی اور برہان پور تک سے لوگ کھنچ کھنچ کر یہاں آجاتے ہیں اور خلد آباد کی یہ رونق اور چہل پہل زائرین کو زندگی بھر یاد رہتی ہے۔

حضرت زین الدین شیرازی کے چند خلفاء کا میں نے ذکر کیا ہے جن کے مزارات ان ہی کے احاطہ خورد یا احاطہ کلاں میں ہیں۔ ان میں سے جن جن کے حالات، تاریخ، تذکروں میں ملتے ہیں ان کو قلمبند کرنے کی سعادت حاصل کر رہی ہوں۔

خواجہ شمس الدین فضل اللہ

مولانا شمس الدین فضل اللہ حضرت زین الدین شیرازی کے سوتیلے بھائی تھے اور دونوں میں بڑی محبت تھی۔ دوشنبہ ۵ ربیع الاول سنہ ۷۳۳ھ کو آپ اپنے برادر محترم حضرت زین الدین اور خواجہ مبارک کے ہمراہ حضرت برہان الدین غریب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے حضرت زین الدین سے پوچھا کہ تمہارے بھائی کیا کرتے ہیں جواب دیا قرآن پڑھتے ہیں اور تعلیم پاتے ہیں۔

یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ آپ نے کم سنی میں بیعت کی اور آپ کی تربیت آپ کے پیرومرشد نے کی۔

ارادت اور بیعت سے قبل حضرت شمس الدین فضل اللہ صاحب کو کسی صاحب عرفان درویش نے خبر دی تھی کہ تم اپنی زندگی میں کسی قطب سے ملاقات کرو گے۔ وہ بات ان کے دل پر نقش تھی چنانچہ بیعت کے بعد آپ نے حضرت برہان الدین غریب سے دریافت کیا کہ قطب اور قطب العالم کے معنی کیا ہیں اور باتوں باتوں میں یہ بھی بتا دیا کہ تم نے فلاں درویش سے یہ بات سنی تھی اور اشارتاً یہ بھی واضح کر دیا کہ اس نے تم کو مجھ ہی سے ملاقات کی خبر دی تھی۔

درویش اور خدارسیدہ لوگوں کے لیے سب سے ضروری بات اکل حلال اور اس کے بعد صدق مقال ہے۔ اگر کسی معاوضے یا تنخواہ یا اجرت میں ان کو ذرا سا بھی اشتباہ ہو جاتا تو یہ لوگ اس سے گریز کر جاتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ شمس الدین فضل اللہ بھی اپنے پیرومرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دریافت فرمایا۔

ایک شخص نے مجھے اپنے بچوں کی تعلیم دینے کے لیے مقرر کیا ہے اور وہ اس

کے معاوضے میں مجھے کچھ دے دیتا ہے۔ معلوم نہیں یہ اجرت جائز ہے یا نہیں۔

آپ نے جواب دیا۔ یہ اجرت جائز ہے بشرطیکہ حدود سے تجاوز نہ کرے۔

ایک مرتبہ آپ نے حضرت برہان الدین غریب یعنی اپنے پیرومرشد سے دریافت فرمایا کہ محبت الٰہی کس چیز سے حاصل ہوتی ہے؟

جواب ملا عنایت اور محبت سے۔ "یعنی اللہ کی نظر عنایت کے بعد خود تمہارے دل میں اللہ کی محبت ہونی چاہیے۔

پھر پوچھا کسی اور چیز سے؟ جواب ملا۔ اللہ کے احسان سے۔"

حضرت شمس الدین کو سماع کا بہت شوق تھا۔ ایک مرتبہ محفل میں آپ اسی شعر پر بالکل بے خود ہو گئے اور قوال اس کی تکرار کیے گئے۔

ما این وطن از بہر بتاں ساختہ بودیم
ایشاں چوں فسا زند بسوزیم وطن را

دوسرے روز جب آپ اپنے پیرومرشد کے حضور میں گئے تو انھوں نے آپ کے سلام کے جواب کے بعد فوراً یہ بیت پڑھی۔ جس پر فضل اللہ صاحب نے تبسم فرمایا۔ اور کہا۔

جہاں اور بتاں سے مخلوق مراد ہے۔ یہ سارا جہان انسان کے لیے پیدا کیا گیا ہے لیکن اصل مقصود ان کی ذات ہے جب مخلوق فنا ہو جائے گی تو یہ جہان بھی فنا ہو جائے گا۔ حضرت شیخ تبسم فرمایا اور کہا تم شعروں کا مطلب اچھا نکالتے ہو یعنی مجاز کو حقیقت کی طرف لے جاتے ہو۔

حضرت برہان الدین غریب کی وفات کے بعد آپ نے سلوک کی منزلیں اپنے برادر حضرت زین الدین کی رہبری میں طے کیں اور انتقال کے بعد انھیں کے پائنتی دفن ہوئے اور تادم مرگ آپ کی مصاحبت ترک نہ کی۔

حضرت تاج الدین محمد لشکری

آپ حضرت برہان الدین غریب کے مریدوں میں سے محبوب ترین مرید تھے لیکن مزار مبارک حضرت زین الدین شیرازی کے حجرے کے قریب بہت نمایاں مقام پر ہے۔ ان کی ذات اور مرتبے کے متعلق مولانا غلام علی آزاد بلگرامی رقم طراز ہیں۔ وہ چابک سوار میدان جفا۔ سردار لشکر والا جو پرہیزگاری کا گھوڑا زیر ران اور ہاتھ میں تقوے کی عنان رکھتے تھے۔ سرپرتاج سروری تاج الدین محمد لشکری قدس سرہٗ آپ کا اصلی نام تاج محمد ہے۔ لشکر سلطانی میں ملازم تھے لیکن اپنا وقت شیخ کی خدمت میں بسر کرتے تھے۔ اور اپنے شیخ کے ایسے گرویدہ تھے کہ اپنے تمام امور میں شیخ کی حمایت کا پکا یقین اور اعتقاد رکھتے تھے۔

ان الفاظ کے بعد ان کے زہد و تقویٰ اور مراتب کے متعلق مزید کچھ لکھنا لاحاصل ہے۔ آپ اپنے وقت کے بہت بڑے سالک گذرے ہیں اور کبھی بھی انہوں نے اپنے آپ کو کامل نہیں سمجھا بلکہ ہر منزل پر پہنچ کر یہی سوچتے رہے کہ ابھی منزل دور ہے۔

آپ کثیر العیال آدمی تھے اور شاہی سواروں کی تنخواہیں اتنی نہ تھیں کہ آپ اپنے اتنے بڑے کنبے کی کفالت کر سکتے۔ اسی لیے اکثر تنگ دستی کا شکار رہتے چنانچہ ایک مرتبہ اپنے شیخ حضرت برہان الدین غریب کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا اب مجھ میں اپنے اہل و عیال کے لیے تنگی ترشی برداشت کرنے کی سکت نہیں ہے۔ میرا حال زار آپ پر روشن ہے۔

شیخ نے جواب دیا فکر نہ کرو تم کو اللہ کی بہت سی نعمتیں ملیں گی لیکن اس وقت یہ فقیر (میں) اس دنیا میں نہیں ہوں گا۔ چنانچہ اپنے شیخ پیر و مرشد کے وصال کے

بعد حضرت تاج الدین لشکری کو ان کی خدمات کے صلے میں 'بدر کوٹ' کی جاگیر ملی اور اس کے علاوہ واقعی خداوند قدوس نے ان کو نعمتوں سے نواز دیا۔

(احسن الاقوال کے حوالے سے)

آپ کو اپنے پیر و مرشد سے بے پناہ عقیدت تھی۔ اس حد تک کہ ان کے وصال کے بعد بھی ان کی ذات کو اپنے لیے منبع فیض و برکت سمجھتے تھے۔ چنانچہ قتلغ خان نے کوٹ گیر کا محاصرہ کیا تو اس لڑائی میں سلطان کے لشکری ہونے کی حیثیت سے تاج الدین لشکری بھی میدان کارزار میں تھے۔ گھمسان کا رن پڑا اور اسی دوران ایک تیر حضرت تاج الدین لشکری کے سینے میں پیوست ہو گیا جس کا زخم اتنا گہرا تھا کہ آپ کے ساتھی اس کے اندمال کی طرف سے مایوس ہو گئے تھے۔ آپ نے خواب میں اپنے شیخ برہان الدین غریب کو دیکھا کہ اپنا ہاتھ ان کے زخم پر پھیر رہے ہیں۔ صبح تک واقعی زخم مندمل ہو گیا۔

حضرت برہان الدین غریب کے بعد آپ نے سلوک کی منزلیں حضرت زین الدین شیرازی کی رہبری میں طے کیں اور اسی عقیدت و مروت کی بنا پر ان کے پیروں کے پاس مدفون ہیں۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکی ہوں کہ حضرت تاج الدین لشکری کثیر العیال ہے چنانچہ اب تک آپکی اولاد کا سلسلہ خدا مان درگاہ میں باقی ہے۔

گنبد مبارک کے جنوب مشرق میں جیسا کہ میں پہلے بتا چکی ہوں کہ محترمہ خوان بی بی صاحبہ کا مزار ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آپ حضرت زین الدین شیرازی کی متبنیٰ بیٹی تھیں۔ جس گود میں پرورش پائی تھی اور جس ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں اس کی پاکیزگی اور تقدس ظاہر ہے۔ اسی لیے بچپن ہی سے بڑی عابدہ اور زاہدہ تھیں۔ عورت ہونے کے باوجود انھوں نے سلوک اور عرفان کی اعلیٰ منزلیں طے کیں۔ چنانچہ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک مرتبہ آپ اپنے حجرے مبارک میں "استغراق" کی حالت میں بیٹھی تھیں۔ اتنے میں کھانے کا وقت آیا دستر خوان بچھا اور آپ کو حضرت زین الدین نے طلب فرمایا اور آپ نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ دستر خوان پر تشریف لائیں

اور کھانا شروع کیا لیکن چند لقموں بعد دستر خوان سے روٹیاں اٹھائیں اور فرمایا۔

او! شاہ صاحب تم بھی کھالو! یہ سنکر آپ سے دریافت فرمایا گیا کہ روٹیاں کس کو دے رہی ہو؟

فرمایا! ایک سائل مکہ معظمہ میں مانگ رہا ہے۔ اس کو دے رہی ہوں۔ اللہ اللہ یہ درجہ تھا آپ کا کہ چشم زدن میں دور دور تک کے حالات اور واقعات آپ پر منکشف ہوجاتے اور غالباً اسی واقعہ کی بنا پر آپ کا نام خوان بی بی پڑ گیا۔

جہاں تک خواتین کا تعلق ہے خلد آباد میں دو مزارات عورتوں کی توجہ کا مرکز ہیں۔ ایک حضرت بی بی ہاجرہ کا جو حضرت برہان غریب اور خواجہ منتجب الدین زرزری زربخش کی والدہ ماجدہ ہیں اور دوسرا مزار خوان بی بی صاحبہ کا ہے۔

اس کو عورتوں کی والہانہ محبت کہتے ہیں یا ضعیف الاعتقادی کہ جب ان کی کوئی مراد پوری ہوتی ہے تو وہ ان دونوں کے مزارات پر بے شمار سبز رنگ کی چوڑیاں چڑھاتی ہیں۔ چنانچہ اجنبی لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ ان کے مزارات کے حجروں کی بالائی چوکھٹ یا کٹھرے کی جالیوں سے بیسوں چوڑیوں کے گچھے بندھے ہوئے ملیں گے۔

خلد آباد دولت آباد اور کاغذی پورے کے مزارات اور وہاں کے اولیائے کرام کا میں اپنی معلومات کے مطابق سیر حاصل جائزہ لے چکی ہوں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں شاہان بے تاج کا سلسلہ ختم ہوچکا ہے۔ ابھی اورنگ آباد خجستہ بنیاد کے شاہان بے تاج اور ان کے قلمرو کے حدود اربعہ باقی ہیں۔ بہتر ہے کہ آپ ان کاغذات اور دستاویزات کا جائزہ لے لیں جو ان درگاہوں کے وقف کی ہیں جن کا ذکر میں پہلے کر چکی ہوں۔

دہلی کے متعلق یہ بات سو فیصد درست ہے کہ وہ بائیس خواجہ کی چوکھٹ ہے کیونکہ وہاں بائیس خواجگان وقف آسودۂ خواب ہیں۔ اس اعتبار سے آپ خلد آباد کی مقدس سرزمین کو کیا کہیں جہاں سینکڑوں خواجگان چشت کے مزارات ہیں!

ان میں سے کم سے کم ایک سو بائیس کی فہرست میں اس کتاب کے ساتھ منسلک کر رہی ہوں جن کے مزارات ہمارے علم میں ہیں اور جائے وقوع پر لوگ فاتحہ خوانی کرتے ہیں اور جن کے مزارات کے نشان مٹ چکے ہیں انکی تعداد کا کوئی شمار نہیں ہے۔ واللہ عالم بالصواب۔

ان کے علاوہ دوسری فہرست ان خواجگان چشت کی ہے جو حضرت منتجب الدین زرزری زربخش یا حضرت برہان الدین غریب کے ساتھ دکن تشریف لائے اور اپنے پیر و مرشد کے حکم پر خلد آباد کے علاوہ جنوبی ہند کے دوسرے مقامات پر مثلاً گجرات، برہان پور، حیدرآباد وغیرہ میں بکھر گئے۔

(یہ فہرست میں نے اولیائے دکن مؤلف مولوی ابو تراب محمد عبدالجبار خان مطبوعہ ۱۳۳۲ھ حیدرآباد دکن سے حاصل کی ہے۔ اس کا ایک نایاب نسخہ اب بھی بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کے کتب خانہ خاص میں محفوظ ہے)

Summaries of Documents[26]

A. Dargahs of Shaykh Burhan al-Din Gharib, Shaykh Muntajab al-Din, and Shaykh Zayn al-Din

A1. Date: 27 Tir, 50 ilahi/[2 Safar, 1014 hijri]/[11 July, 1605].[27]

Reign: Akbar

Endowment: Bhadgaon village in Burhanpur district,[28] and two villages in the districts of Busawal and Adilabad.

Recipient: Shaykh Zayn al-Din Muhammad, son of Shaykh Khan Muhammad, heir of Sultan Burhan al-Din and Shah Muntajab.

Stipulations: Half the income is designated for living expenses of the custodians, and half for the annual festival (`urs), the open kitchen, shawls and lamps. Exemption from various taxes is guaranteed. The chief custodian of the shrine (sahib-i sijjadah) has exclusive control over these revenues, from which the trustees (mutawalliyan) are excluded.

Endorsements: Miran Sadr-i Jahan, sadr; Muhammad Tahir, reporter (waqi`ah-niwis); Ram Das.[29]

A2. Date: 28 Tir,[30] 21 ilahi regnal/26 Shawwal, 1035 hijri/[21 July, 1626].

Reign: Jahangir.

Endowment: Longaon and Karab villages in Bhadgaon district, with an estimated total revenue (jam` raqmi) of 122,400 dams, from the beginning of the autumn (kharif) crop[31] of Pars-il (third year of the Turkish duodecenary cycle).

---

[26] The following summaries are based on my microfilm printout copies of the original Persian documents from the collection of Farid al-Din Salim of Khuldabad. Lack of space as well as defects in some of the microfilms precludes a complete transcription and translation here. These summaries are not exhaustive, but include the principal data while omitting administrative formulas and the more technical financial notations. Established dates are in the Gregorian calendar only, while dates of documents are given in the Mughuls' solar ilahi calendar, the lunar Islamic hijri calendar, and the Gregorian calendar, separated by a slash, with calculated equivalents in brackets. Conversions are based on V. S. Bendrey's Tarikh-i-Ilahi (Aligarh: Centre of Advanced Study, Department of History, Aligarh Muslim University, 1972) [this book's Old Style dates are corrected into New Style], and G. S. P. Freeman-Grenville's The Muslim and Christian Calendars (2nd ed., London: Rex Collings Ltd, 1977).

[27] This is evidently identical with a farman preserved in the Andhra Pradesh State Archives in Hyderabad, identified as Museum 7993, and briefly described in the Proceedings of the Indian Historical Records Commission 46 (1979), p. 289. None of the other farmans in this collection seems to survive in an administrative copy.

[28] Bhadgaon is a town on the Girna river, fifty miles north of Khuldabad, Bhusawal is a junction town on the Tapti river, and Adilabad is a major town on the Purna river.

TABULAR SURVEY OF DOCUMENTS

no. reign	date	endowment	value
A1 Akbar	1014/1605	Bhadgaon, Burhanpur	1,250,000 dams (actual)=Rs.31,250
A2 Jahangir	1035/1626	Bhadgaon	122,400 dams (est.)=Rs.3060
A3 Shahjahan	1045/1635	Dawlatabad	6645.5 + 3500 huns=Rs.36,209.25
A4 Shahjahan	1047/1637	Sara, Dawlatabad	Confirmation of trustees
A5 Shahjahan	1047/1638	Dawlatabad	3500 huns (actual)=Rs.12,250
A6 Awrangzib	1080/1669	Sara, Dawlatabad	Rs.741
A7 Awrangzib	1101/1691	Payan	Confirmation of recipient
A8 Bahadur Shah	1121/1709	Sara, Dawlatabad	74,106 dams=Rs.1175 (actual)
A9 Bahadur Shah	1122/1710	Dawlatabad	110,300 dams=Rs.1378 (actual)
B1 Shahjahan	1045/1635	Sultanpur, Dawlatabad	3 (from 7) chawars=514 bighas
B2 Sikandar Jah	1238/1823	Dawlatabad	Rs.1095 (actual)
B3 Sikandar Jah	1242/1827		Confirmation of recipient
C1 Awrangzib	1094/1683	Sultanpur, Dawlatabad	30 bighahs
C2 Bahadur Shah	1122/1710	Sultanpur, Dawlatabad	282,067 dams=Rs.3249 (actual)
C3 Birbhun Das	1250/1834		Rs.60

arrest (Ma'athir al-Umara I, 289).

[35] The year is obliterated on the front, but is supplied on the endorsement. This was the first day of the ninth regnal year, which Shahjahan reckoned according to the hijri calendar (in spite of the fact that the documents call it ilahi by habit). This anniversary was celebrated in Agra, and the bestowal of gifts and stipends was a normal part of the ritual.

[36] Khan-i Zaman was the governor of the northern Deccan (or Balaghat) from 1627 to 1637; see Ma'athir al-Umara I, 217. It is notable that the endowment has now been regularized into the Mughul administrative system in the Deccan. Not only has the old Faruqi endowment from Khandesh been replaced with a local grant from the Dawlatabad area, but also the currency valuation has been made in terms of the gold-based Deccan hun (usually translated "pagoda") in place of the silver-based dam (cf. Wilson, p. 211b).

Recipient: Sultan Burhan al-Din, etc.

Stipulations: Local revenues are to be used for expenses. Recipients are to pray for the welfare of the ruling dynasty.

Endorsement: Though practically illegible, cites the date 20 Shahriwar, 9 ilahi (sc. hijri) regnal/[8 September, 1635].

A4. Date: 6 Muharram, 11 regnal/1047 hijri/[31 May, 1637].[37]

Reign: Shahjahan.

Endowment: Sara village in Dawlatabad district, from beginning of autumn crop of Pars-il.[38]

Recipient: Shaykh Burhan al-Din, Shaykh Muntajab al-Din, Shaykh Zayn al-Din, and in particular the prior trustees of the shrines.[39]

Stipulations: Revenues to be used for the annual festival, open kitchen, etc. Exemptions from various taxes are guaranteed.

Endorsements: Mir Muhammad Hashim, sadr; 'Abd al-Rahim, reporter.

A5. Date: 9 Ramadan, 11 regnal/1047 hijri/[4 February, 1638].

Reign: Shahjahan.

Endowment: Villages in the Dawlatabad district, with a yield (mablagh) of 3500 huns.[40]

----

[37] This document was issued in Agra, just three weeks after Awrangzib's marriage to Dilras Banu; cf. Saksena, History of Shahjahan, p. 315.

[38] This is evidently the village today called Sarai, two miles from Khuldabad (Awrangabad District, Maharashtra State Gazetteers [2nd ed., Bombay: Gazetteers Department, Government of Maharashtra, 1977], p. 1176.)

[39] This represents a change in the fortunes of the shrines, since in Akbar's farman the trustees (mutawalliyan) were excluded from the shrine's revenues in favor of the hereditary custodian.

[40] Again the income of the shrine has been reduced, by the loss of the 6845 1/2 huns of document A3, above.

Recipient: Shrine of Sultan Burhan al-Din and Shah Zayn al-Din and the attendants thereof.

----

[29] Miran Sadr-i Jahan Pihani (d. 1020/1611) was the officer in charge of religious endowments (sadr) under Akbar from 997/1599 (according to H. Blochmann, trans., The A'in-i Akbari by Abu 'l-Fazl 'Allami, I, 282), and subsequently served in the same capacity under Jahangir. Shahnawaz Khan reported of him, that "during his tenure of office as the Sadr of Jahangir he gave away so many maintenance-lands that Asaf Khan Ja'far reported to the King, that Miran had given away in five years what Akbar had granted in fifty years" (Samsam ul-Daula Shahnawaz Khan and his son 'Abd ul-Hayy, The Ma'athir al-Umara, trans. H. Beveridge, revised by Baini Prashad (Patna: Janaki Prakashan, 1979), II, 79-80).

[30] This grant was made when Jahangir was in Kabul, where Mahabat Khan had put him under virtual house arrest in an attempt to take over the administration. During this time Jahangir visited many local saints while plotting his eventual return to power, and so granting this endowment presumably fit in with his conspicuously religious behavior during this time. See further Beni Prasad, History of Jahangir (Allahabad: The Indian Press (Publications) Private Ltd., 1962), p. 384.

[31] Estimated total revenue (jam' raqmi) was a customary evaluation not necessarily identical with actual revenue (hasil); cf. H. H. Wilson, A Glossary of Judicial and Revenue Terms (London: Wm. H. Allen & Co., 1855; reprint ed., Delhi: Munshiram Manoharlal, 1968), pp. 229b, 202a. The dam is a copper coin equivalent to one fortieth of a silver Hindustani rupee (Wilson, p. 121b).

Stipulations: Revenue to be used for expenses. Recipients are to pray for the welfare of the ruling dynasty.

Endorsements: Khan-i Jahan,[32] Fadil Khan.[33] Records the actual revenue (hasil) of the old endowment as 1,250,000 dams, which has been reduced on the advice of Asaf Khan.[34]

A3. Date: 20 Azar, [9 hijri regnal]/[11 Jumada II, 1045]/[22 November, 1635].[35]

Reign: Shahjahan.

Endowment: 6845 1/2 huns from villages in Dawlatabad district, plus twenty-one shawls; also, on the recommendation of Khan-i Zaman, 3500 huns from the town of Rawdah (i.e., Khuldabad).[36]

----

[32] Khan-i Jahan Lodi (d. 1040/1631) was a courtier and great favorite of Jahangir; from the year of this farman, he had been given charge of the entire Deccan (Ma'athir al-Umara I, 798). [illegible] sympathy for Sufism is evident also in his later attraction to [illegible] eminent Shaykh Fadl Allah of Burhanpur (ibid., I, 804).

[33] Aqa Afdal Fadil Khan (d. 1058/1648) was a close associate [illegible] Khan-i Jahan and served under him in the Deccan at this time (Ma'athir al-Umara I, 549).

[34] This Asaf Khan is better known as Asaf Jah [illegible], brother of Nur Jahan and close counsellor [illegible] to reduce the grant must have come after [illegible] custody of Mahabat Khan, during the time [illegible]

Stipulations: From second third of the spring (rabi`) crop of Ud-il (second year in cycle), for the annual festival, open kitchen, etc.

Endorsement: Amjad Khan, sadr; Ghulam `Isa, reporter. Murshid Quli Khan's seal confirms that according to a decree of Awrangzib , and a memorandum of the Amir al-Umara', this grant was confirmed from crown lands (khalisah) for the shrines' expenses in the name of one Mubarak Khan. Contains lengthy eulogies of the Nizam al-Mulk Asaf al-Dawlah.[44] Cites two of Awrangzib's decrees (including no. A6 above, of the twelfth regnal year).

A9. Date: 7 Rajab, 4 regnal/[1122]/[1 September, 1710].

Reign: Bahadur Shah.

Endowment: Bursar Khurd, in Kanhar district, Dawlatabad region, with total revenue of 110,300 dams, and actual revenue of 1378 rupees, from the spring crop of Fars-il,[45] instead of the villages formerly held (cf. A8, above).

Recipient: Attendants of the shrines of Shaykh Burhan al-Din, Muntajab al-Din, and Zayn al-Din.

----

[43] For this monarch's reverence for saints, and his reckless generosity, see William Irvine, Later Mughals, ed. Jadunath Sarkar (New Delhi: Oriental Books Reprint Corporation, 1971), pp. 136-8.

[44] It is likely that this noble, who became the first Nizam of Hyderabad, assisted in securing this endowment; his devotion to the saint is evident from the fact that he was buried in the precincts of Burhan al-Din's shrine.

[45] For Bursar Khurd, see Gazetteer, p. 1070.

Stipulations: To be used only for living expenses. Recipients are to pray for the welfare of the ruling dynasty.

Endorsement: Cites memorandum of 17 Shawwal, 3 regnal/1121/28 Azar ilahi. Sayyid Amjad Khan, sadr; Ghulam `Isa, reporter. Specifies actual revenue of endowment as 1378 rupees and 10 anas. Signatures of Nizam al-Mulk Asaf al-Dawlah, Mu`azzam Khan, Ikhlas Khan, and Mirza Shahnawaz Khan (as deputy to Asaf al-Dawlah) are recorded. Specifies revocation of the previous endowment of Sara village by Awrangzeb in regnal years 11 and 12 (cf. A6, above). Refers to gift of the villages of Sankuli (?) and Tajnapur, with total revenue of 1000 rupees, for the upkeep of the attendants of the shrines; the latter, however, preferred the present grant of 1378 rupees 10 anas.

Dargah of Sayyid Yusuf Raju Qattal

B1. Date: 25 Tir, 81 ilahi/9 regnal/[2 Sha`ban, 1046]/[5 July, 1636] ("copy in agreement with the original").

Reign: Shahjahan.

Endowment: 3 chawars by shar`i guz, equivalent to 514 bighahs by ilahi guz, from previously[46] held land, to replace chawars from Sultanpur village.

Recipient: Sultan Burhan al-Din, etc. (obliterated on front, but supplied in endorsement).

Endorsement: Cites previous decree of 9th regnal year (cf. A3 above) conferring four villages from Dawlatabad district, with a yield of 3500 huns.

A6. Date: 4 Rajab, 12 regnal/1080 hijri/[28 November, 1669].

Reign: Awrangzib.

Endowment: Sara village in Dawlatabad district.

Recipient: Shaykh Burhan al-Din, Muntajab al-Din, Zayn al-Din.

Stipulations: Revenues to be used for annual festival, open kitchen, etc. As hoped by the trustees and residents, the previous endowment is renewed. Exemptions from various taxes are guaranteed.

Endorsement: Cites memorandum (yad dasht) of Friday, 24 Rabi` I, 12 regnal/1080/1669, and a decree of Muharram, 11 regnal, stating the actual revenue (hasil) of the village to be 741 rupees in 1077/1666. Hajji Yasin, sadr.

A7. Date: 24 Sha`ban, 34 regnal/[1101 hijri][41]/[23 May, 1691] (a copy, with some errors corrected).

Reign: Awrangzib.

Recipient: Shaykh Ni`mat Allah and the attendants of the shrines of Shah Burhan al-Din and Shah Muntajab al-Din.

Stipulations: Confirms recipients' rights against the claims of Shaykh Darwish Muhammad and attendants of the shrine of Shaykh Zayn al-Din, concerning the village of Payan (?) endowed to the shrine of Khwajah Husayn (father of Zayn al-Din), which was normally under the control of Zayn al-Din's shrine.[42] Endorsement in English, "Compared and

----

[41] At this time Awrangzib was probably at Bijapur; see Saqi Must`ad Khan, Maasir-i `Alamgiri (sic), trans. Sir Jadu-nath Sarkar (Calcutta: Royal Asiatic Society of Bengal, 1947), p. 204.

[42] This document evidently reflects a split within the organization that jointly administered the three shrines of Burhan al-Din, Muntajab al-Din, and Zayn al-Din. On the shrine of Khwajah Husayn, see no. C2, below.

found correct," with illegible date and signature.

A8. Date: 4 Jumadi II, 3 regnal/1121 hijri/[16 August, 1709].

Reign: Bahadur Shah.[43]

Endowment: Sara, in Dawlatabad district, with a total revenue of 74,106 dams, and an actual revenue of 1175 rupees.

Recipient: Shaykh Burhan al-Din, Zayn al-Din, Muntajab al-Din.

Other Grants

C1. Date: 14 Ramadan, 27 regnal/1094 hijri/[6 September, 1683].

Reign: Awrangzib.

Endowment: Thirty bighahs as measured by ilahi guz, from Sultanpur district in the region of Dawlatabad.

Recipient: Unspecified on front, but see endorsement.

Stipulations: Revenues to be used for necessities. Recipients are to pray for the welfare of the ruling dynasty. Exemptions from various taxes are guaranteed.

Endorsement: Muhammad Sa'id, reporter, on the basis of a memorandum from the late treasurer Sharif Khan, dated 29 Jumadi II, 27 regnal/1094, signed also by Fada'il Khan and Bahrmand Khan, citing date 21 Jumadi II, 25 regnal. The grant is to be divided among four people, with half going to a son (name illegible) of Hajji Shaykh Saghir, and the other half to be shared by three sisters, Bibi Rabi`ah, Bibi `A'ishah, and Bibi Banu Begum.[48]

C2. Date: Rabi' II, 4 regnal/[1122]/[June, 1710].

Reign: Bahadur Shah.

Endowment: Bhandegaon village and Ja`farabad village in Sultanpur district of Dawlatabad region, with total revenue of 282,067 dams, and actual revenue of 3249 rupees.[49]

Recipient: Shrine of Khwajah Husayn, father of the Shaykh al-Islam (Zayn al-Din), and shrine of Khwajah `Umar, uncle of the Shaykh al-Islam, in the care of Shaykh Abu al-Khayr.[50]

Stipulations: From the spring crop of Qawi-il, for annual

----

[48] This document is a stipend for the support of living individuals rather than a shrine grant.

[49] For these villages, see Gazetteer, pp. 1064, 1110.

[50] For Khwajah Husayn (d. 27 Sha`ban, 752/) and his brother Khwajah `Umar or `Amr, see Muhammad Rawnaq `Ali, Rawdat al-Aqtab al-Ma`ruf bi-Mazhar-i Asafi (Lucknow: Dilgudaz Pres , 1349/1931), pp. 141-3; Ghulam `Ali Azad, Rawdat al-Awliya p. 90.

festival, adornments for the shrine, sustenance of attendants.

Endorsement: Cites memorandum of 14 Ramadan, 5 regnal/1122/5 Abah ilahi. Amjad Khan, sadr. Endorsement in English, partially obscured by repairs, reading, " . . . and compared", with illegible date and signature, apparently identical to the English notation on A7 above.

C3. Date: 21 Rajab, 1256/[8 September, 1834].

Reign: Raja Birbhun (?) Das.

Endowment: 5 rupees monthly for sandalwood, roses, etc., from Sha`ban, 1256.

Recipient: Shrine of Sayyid Raju, for sandalwood, roses, and lamps, and for the sustenance of Mulla Wahid ibn Ahmad, the attendant.

Stipulations: Recipient is to use the products of the land for his sustenance, and to pray for the welfare of the ruling dynasty. Exemptions from various taxes are guaranteed.

Endorsement: Cites memorandum of 31 Urdibihisht, 9 ilahi regnal/14 Dhu al-Hijjah, 1045 hijri. Mawlawi Khan, sadr. Cites memoranda of `Abd al-Rahman, of 16 Tir, 9 ilahi regnal,

----

[46] The chawar is a Maratha land measure, usually the equivalent of 120 square bighahs. The bighah is about five eighths of an acre. Measurement is made by a yardstick measure, here the ilahi guz instituted by Akbar (33 inches), or the shar`i guz. For these terms, see Wilson, pp. 85b, 107b, 171b.

and of Afdal Khan.

B2. Date: 15 Jumadi I, 1238/[28 January, 1823].

Reign: Sikandar Jah, Nizam of Hyderabad.

Endowment: Bumiyah (?) village in Dawlatabad region, with an actual revenue of 3 rupees (i.e., per day), half of which is to be paid monthly from the beginning of 1237.

Recipient: Hafiz `Abd al-Shakur, son of Hafiz Muhammad `Ali, attendant of the shrine of Sayyid Raju Qattal and Sayyid Zayn al-Haqq.

Endorsement: Seal of Farrukhsiyar. Cites previous grant of village (name illegible) yielding 8 anas per day, and a memorandum of 17 Rabi` I, 4 regnal, in the names of Fayd Allah, Rahmat Allah, and Muhammad (illegible), for sandalwood, roses, and lamps for the shrine, from 1 Sha`ban, 4 regnal. Endorsement in Marathi.[47]

B3. Date: 5 Dhu al-Qi`dah, 1242/[31 May, 1827] ("copy in agreement with the original").

Reign: (Sikandar Jah).

Recipient: Muhammad `Abd al-Shakur, son of Hafiz Muhammad `Ali, of the sons of Mulla Wahid al-Din-i Ahmad, attendant of the shrine of Shah Raju Qattal.

Stipulations: Recipient is confirmed as sole legitimate attendant of the shrine.

Endorsement: Rather than being a government document, this has been issued under the seals of Sayyid Shah Asad Allah Muhammad Akbar al-Husayni, chief custodian of the Greater Shrine (i.e., the shrine of Burhan al-Din Gharib), and Sayyid Shah Habib Allah Muhammad Asghar al-Husayni, chief custodian of the shrine of Gisu Daraz at Gulbarga.

----

[47] One ana equals one-sixteenth of a rupee (Wilson, p. 24a), so this document raises the income from one-half rupee to three rupees.

فہرست اُن حضرات کی جو حضرت برہان الدین اولیاء صاحب کی صحبت میں رہا کرتے تھے

سلسلہ نمبر	نام	کس سے بیعت تھی	کیفیت
۱-	خواجہ عبدالکریم	برہان الدین اولیاء صاحب	دونوں برادر حقیقی برہان الدین اولیاء صاحب کے حقیقی بھانجے تھے ماموں صاحب کے گنبد کے پچھم متصل مسجد دونوں مزار ہے۔
۲-	خواجہ عبداللطیف		
۳-	کاکا شاد بخت یا (سفید بخت)		جو خدمت کہ اقبال خادم کو حضرت نظام الدین اولیاء صاحب کی بارگاہ میں تھی وہ کاکا صاحب کو اپنے شیخ کی درگاہ میں حاصل تھی۔ برہان الدین اولیاء صاحب جس وقت دہلی سے دولت آباد آئے پہلے کاکا صاحب کے مکان پر قیام فرمایا اور اسی وقت سے کاکا صاحب حضرت کے ساتھ رہے۔ کچھ دنوں تک کاکا صاحب کو باورچی خانہ کی خدمت سپرد رہی۔ ولیت کے کام کو چندے انصرام دیا۔

Recipient: Attendants of the shrine of Shah Jalal Ganj-i Rawan.[51]

----

[51] This saint, whose original name was Jalal al-Din Kharaqani, is said to have been the disciple of a student of Shaykh Shihab al-Din Suhrawardi of Baghdad (d. 1234). See Ghulam `Ali Azad, Rawdat al-Awliya', p. 130.

نمبر شمار	نام	کس سے بیعت تھی	کیفیت
			قبر شیخ کے گنبد کے پائیں جانب مشرق ہے ۔
۴ ۔	خواجہ خیر الدین	برہان الدین	شیخ برہان الدین اولیاء صاحب نے
۵ ۔	خواجہ قبول	اولیاء	انکی نسبت
۶ ۔	خواجہ عبدالرحمٰن	صاحب	فرمایا ہے ۔ خواجہ جلوک لاولد فوت ہوئے
۷ ۔	خواجہ جلوک	״	خدا مان درگاہ حور کلاں ان چاروں کی اولاد سے ہیں ۔ ہر چہار مزار کا کا صاحب کی قبر کے پورب ہیں ۔
۹ ۔	خواجہ تاج الدین محمد شکری		حضرت سید زین الدین کے پائیں میں قبر ہے ۔ آپ کے حالات علیحدہ لکھے گیے ہیں ۔
۱۰ ۔	سید زین الدین		
	رکن الدین کاشانی		
	حماد الدین کاشانی		
۱۱ ۔			مزار سگر مقام گلبرگہ میں ہے ۔
۱۲ ۔	مجید الدین کاشانی		سید زین الدین صاحب کے ارشد
	برہان الدین کاشانی		اور برہان الدین اولیاء کے امور خلفاء میں تھے ۔ پہلے تینوں صاحب تصنیف اور پچھلے دونوں یکشنبہ ۷ محرم ۳۲ھ میں ہوئے ۔
۱۳	شمس الدین فضل اللہ	برہان الدین	ہر سہ حضرات سید زین الدین صاحب
۱۴	مولانا احمد و مولانا تاج الدین محمد شکری	اولیاء صاحب	کے شاگرد ہیں ۔ ان کے مزارات سید زین الدین صاحب کے گنبد کے پائین

نمبر شمار	نام	کس سے بیعت تھی	کیفیت
			پورب کی طرف ہوں ۔
۱۵ ۔	سید کبیر صاحب		ارادت کا حال معلوم نہیں بڑ کے عالی میں لب سڑک مزار ہے ۔
۱۶ ۔	سید کمال الدین عرف کھڑک پور		ارادت کا حال معلوم نہیں عربوں کی مسجد کے متصل بڑ کے درخت کے نیچے مزار ہے ۔
۱۷ ۔	سید نصر اللہ		ارادت کا حال معلوم نہیں چھوٹی مارلی پر املی کے درخت کے نیچے مزار ہے ۔
۱۸ ۔	سید احمد		سید نصر اللہ کے مزار سے تھوڑا ہٹ کر مزار ہے ۔
۱۹ ۔	پیر کالے صاحب		کنبیالی دروازے کے قریب مزار ہے ۔
۲۰ ۔	عبداللہ فلیح صاحب	سید زین الدین	قبر کچہری کے قریب ہے حجانی صاحب کے مسجد کے صحن میں ۔
۲۱ ۔	شا میر صاحب		عمالوں کے محلہ میں مسجد میں قبر ہے ۔
۲۲ ۔	سید برہنہ صاحب		ارادت کا حال معلوم نہیں کنبی آلی کلاں پورب قبر ہے اور دو چار سیدوں کے مزار ہیں ۔
۲۳	اخوند میر سادات		ارادت کا حال معلوم نہیں ۔ موضع سرا میں مدفون ہیں ۔
۲۴ ۔	خواجہ حسین	نظام الدین اولیاء صاحب	ان کے واقعات علیحدہ لکھے گیے ہیں

نمبر شمار	نام	کس سے بیعت تھی	کیفیت
۲۵	خواجہ عمر	نظام الدین	ان کے واقعات علیحدہ لکھے گیے ہیں
۲۶	فریدالدین ادیب	برہان الدین	فریدالدین ادیب فخرالدین شمس الملک
		اولیاء صاحب	فریدالدین یگانہ پیر مبارک غوری یہ
۲۷	فخرالدین شمس الملک		چاروں مزار منتخب الدین صاحب
۲۸	فریدالدین یگانہ		کی درگاہ کے بازو احاطے میں ایک
۲۹	پیر مبارک غوری		ہی چبوترے پر ہے۔
۳۰	نصیرالدین صاحب پون پیک		شاہ راجو قتال حسینی کی مسجد کے گوشۂ شمال و غرب احاطے سے باہر قبر ہے۔
۳۱	امیر حسن اعلائے سنجری	نظام الدین	ان کے حالات علیحدہ قلمبند ہوئے ہیں۔
۳۲	مولانا مسعود عرف میر چھجو صاحب	اولیاؔ صاحب	ان کو امیر حسن اعلائے سنجری کے بھائی کہتے ہیں۔ ان کا مزار بی بی موٹی کا امیر حسن صاحب کے بازو احاطہ میں ہے۔
۳۳	اخوند میر خلف		امیر حسن صاحب اعلائے سنجری کی درگاہ سے پچھم ٹیکری پر مزار ہے۔
۳۴	پیر مبارک کاروان	برہان الدین	موضع کاغذی پورے سے پچھم نصف
۳۵	لاڈلے صاحب قنبر انصاری	اولیاء صاحب	میل کے قریب ایک ٹیکری پر پیر مبارک صاحب کی قبر اور دوسری اس سے جنوب بلند ٹیکری پر لاڈلے صاحب قنبر انصاری آسودہ ہیں۔ یہ
		نظام الدین اولیاء صاحب	دوسرا مقام حدود خلدآباد میں آب و

نمبر شمار	نام	کس سے بیعت تھی	کیفیت
			ہوا کے لحاظ سے اچھا ہے۔
۳۶	شیخ جام		
۳۷	حاجی نظام پیش امام		کاغذی پورا
۳۸	شیخ کمال خجندی		
۳۹	شیخ فخرالدین		
۴۰	خواجہ رشید الدین	برہان الدین اولیاء صاحب	حوض خاص پر مزار ہے۔
۴۱	خواجہ عزیز الدین بن خواجہ یعقوب بن حضرت فرید شکر گنج	نظام الدین اولیاء صاحب	شہید ہوئے۔ دولت آباد میں مزار ہے۔ قبر دولت آباد
۴۲	کمال الدین سامانہ		سید زین الدین صاحب کے استاد تھے
۴۳	قاضی شرف الدین		مولانا حسام الدین کے دوستوں میں سے تھے۔
۴۴	سید سادات		دولت آباد میں قبر ہے۔
۴۵	مولانا عزیز	برہان الدین	دونوں مزار بلغور کچہری کے مشرق قبر میں
۴۶	خواجہ سالار	اولیاء صاحب	ہیں رکن الدین مولف نفائس الانفاس کے بیٹے تھے۔
۴۷	خواجہ شہاب الدین		حضرت سید زین الدین صاحب کا گنبد ان ہی کا بنوایا ہوا ہے۔ استاد دوم سید کبیر کے چبوترے پر قبر ہے۔
۴۸	قتلغ خان دبیر		دولت آباد کے صوبیدار تھے۔ حوض قتلغ ان کی تعمیر ہے۔ قبر دہلی میں ہے۔

نمبر شمار	نام	کس سے بیعت تھی	کیفیت
۴۹	رفیع الدین صاحب		دولت آباد کے صوبیدار تھے۔ مزار مقبرہ چار دیواری مسجد رشیم باوڑی پیرزادہ میں ہیں۔
۵۰	خواجہ محمد رستم		سلطان پور میں کسی خدمت پر مقرر تھے مزار قاضی کے حوض پر ہے۔
۵۱	نصر الدین محمد		قصبہ لاجورہ میں ملازم تھے ہودڑی
۵۲	کریم الدین لاجوریؒ		دروازے کے مشرق میں ایک ہی چبوترے پر دونوں مزار ہیں۔
۵۳	ملک الملوک عرف محمود		یہ دونوں مزار دولہ میاں کے صدر دروازے
۵۴	قاضی عارف کاشانی		نیم کے درخت کے نیچے ہیں۔
۵۵	خواجہ عبداللہ مطنجی	برہان الدین	یہ دونوں صاحب ۷۳۶ھ میں مرید ہوئے
۵۶	خواجہ ندیم	اولیاء صاحب	آخر تک شیخ کے ساتھ رہے۔ قبریں سید کبیر استاد اول کے چبوترے پر ہیں
۵۷	قاضی حسین صاحب		دولت آباد میں ملازم تھے۔ کمال الدین صاحب الخیرات صاحب کے پائیں الگ چبوترے پر ہے اور دوسرے چبوترے پر قاضی حسین کا مزار ہے۔
۵۸	سید ابراہیم عرف برہانی		نقارخانہ دروازے کے مغرب بڑے چبوترے پر مزار ہے۔
۵۹	خواجہ سدید الدین		کالوسے میں منڈی ٹیکری کے نیچے گار کے پتھروں کا مزار ہے اور ٹیکری

نمبر شمار	نام	کس سے بیعت تھی	کیفیت
			نیم کے درخت کے نیچے حافظ مینا کا مزار ہے۔ حافظ محمد حسین کے جد امجد ہیں۔ آپ نے مینا کی مسجد تعمیر کی۔
۶۰	فخر الدین صدر جہاں		آبخورخانہ امین الدین دادا کے پاس چبوترے پر مزار ہے۔
۶۱	نصر الدین امیر		چھوٹی باؤلی کے
۶۲	خواجہ سراج الدین		گھر کے پاس چبوترے پر دونوں مزار ہیں
۶۳	خواجہ علی شاہ		کمان محلہ قمر علی شاہ کے مکان سے لگا ہوا
۶۴	خواجہ شجاع		مزار ہے بسم اللہ خان باورچی کے مکان کے قریب۔
۶۵	عزیز الدین امام	برہان الدین اولیاء صاحب	حضرت سید کبیر استاد دوم کے پائیں قبر ہے۔
۶۶	خواجہ جلال صاحب		قصاب واڑے کی مسجد کے سامنے مزار ہے۔
۶۷	خواجہ رمضان		خواجہ جلال کے بیٹے تھے۔ سید کبیر استاد دوم کے پائیں چبوترے پر قبر ہے۔
۶۸	قاضی فرید الدین		عہدہ قضا پر مامور تھے۔ مزار لب حوض خاص تھا۔ لوسے کے اوپر چھوٹی مسجد ہے۔
۶۹	قاضی صدر الدین		یکشنبہ غرہ محرم ۷۳۳ھ میں مرید ہوئے۔ خواجہ رشید الدین کے بازو چبوترے حوض خاص مزار ہے۔
۷۰	خواجہ حافظ نور الدین محجوب		۲۹ رمضان ۷۳۱ھ میں مرید ہوئے۔ سید کبیر الدین استاد دوم کے بازو مزار ہے۔

نمبر شمار	نام	کس سے بیعت تھی	کیفیت
۷۱	سعید الدین دبیر	برہان الدین اولیاء صاحب	دوشنبہ ۱۵ صفر سنہ ۷۳۳ھ میں مرید ہوئے مزار کالے پیر پتھر کے دروازے کے پاس ہے گاروں کا۔
۷۲	قوام الدین		شمس الدین صاحب کے پوتے تھے مزار امیر حسن اعلائے سنجری کے پائین میں ہے۔
۷۳	شمس الدین		امیر حسن اعلائے سنجری کے بھتیجے تھے ہر وقت مستغرق رہتے تھے۔ مزار امیر حسن کے پائین ہے۔
۷۴	مولانا خیر الدین		امیر حسن اعلائے سنجری کے پائین مزار ہے۔
۷۵	سید رکن الدین	سید زین الدین	مخدوم یاڑی کے گنبد کے سامنے احاطے میں دونوں قبر گار کے پتھر ہے۔
۷۶	سید لطیف الدین		
۷۷	خواجہ مقبول	برہان الدین اولیاؔ صاحب	کمان کی مسجد کے صحن مسجد سے لگا ہوا مزار ہے
۷۸	عین الدین		پیر مبارک کاروان کے پائین مزار ہے۔
۷۹	احسام الدین		پیر مبارک کاروان صاحب کے پائین دوسرا مزار ہے۔
۸۰	مولانا امیر صاحب		سید زینو یوسف صاحب کے مشرق مزار ہے۔

نمبر شمار	نام	کس سے بیعت تھی	کیفیت
۸۱	مولانا فخرالدین		لب سڑک بنگلہ جات دونوں مزارات ایک چبوترے پر ہیں۔
۸۲	صدرالدین بھکری		
۸۳	شاہ گل حسنی	سرگروہ اہل طبقات	مزار بدر باؤلی کے قریب بڑے چبوترے پر ہے۔
۸۴	سید علاؤالدین بغدادی		اندرون مسجد پانگرا دروازہ
۸۵	سید علی شاہ بغدادی		بیرونِ مسجد پانگرا دروازہ
۸۶	سید شہاب الدین بغدادی		باغ منعم کے سامنے ایک ہی چبوترے پر دونوں مزار ہیں۔
۸۷	سید نظام الدین بغدادی		
۸۸	پہلوان صاحب		کمان مسجد کے سامنے مزار ہے۔
۸۹	حافظ خلیل صاحب		ارادت کا حال معلوم نہیں۔ خواجہ حسین کی درگاہ کے سامنے لب سڑک احاطے میں مزار ہے۔
۹۰	سید دریا صاحب		برہان الدین اولیاء کی درگاہ کے باہر
۹۱	سید نصرالدین صاحب		نیچے کھڈے میں دونوں مزار ہیں۔
۹۲	سید رکن الدین چلتے سادات		ارادت کا حال معلوم نہیں۔ مشرق لب سڑک پانگرے تالاب کے ٹیکری پر مزار ہے۔
۹۳	حمید شاہ		پانگرے تالاب کے اوپر دونوں مزار ہیں۔
۹۴	نظر علی شاہ		
۹۵	رحیم خان		لب پانگرہ گنبد

نمبر شمار	نام	کس سے بیعت تھی	کیفیت
۹۶	چلہ پیر بدیع الدین زندہ شاہ مدار		ہودڑی دروازہ
۹۷	سید عثمان صاحب		ارادت کا حال معلوم نہیں امام باڑے پر مکان سے لگا ہوا مزار ہے۔
۹۸	سید یوسف صاحب		ارادت کا حال معلوم نہیں چھوٹی باؤلی سید نصر اللہ صاحب کے مزار سے قریب مکان میں مزار ہے۔
۹۹	سید ابوبکر		چھوٹی باؤلی مکان میں مزار ہے
۱۰۰	سیدانی بی بی رابعہ		بیرون مخدوم باڑی گنبد کے باہر
۱۰۱	سیدانی بی بی حمیدہ		چبوترے پر دونوں مزار ہیں
۱۰۲	پیر دیدار صاحب عرس ۱۵ شعبان		بانگڑے دروازے سے لگا ہوا چبوترے پر مزار ہے۔
۱۰۳	سید کبیر صاحب		ارادت کا حال معلوم نہیں
۱۰۴	سید عبدالرحیم		زیبھن حجانی کی مسجد سے لگے ہوئے چبوترے پر دونوں مزار ہیں۔
۱۰۵	شمس الدین صاحب		بڑکے عالی لب سڑک مکان میں دیوار میں مزار ہے۔
۱۰۶	سید بہاؤ الدین صاحب		ارادت کا حال معلوم نہیں مزار پٹہ خانہ کے پاس چار دیواری میں مزار ہے۔ عرس ۲۶ ذی الحجہ کو ہوتا ہے۔

نمبر شمار	نام	کس سے بیعت تھی	کیفیت
۱۰۷	سید تفلحہ صاحب	سید زین الدین صاحب	مزار عبداللہ افلح صاحب کے بازو چبوترے پر ہے۔ مسجد حجانی صاحب
۱۰۸	بی بی آسیہ	نانی برہان الدین اولیاء صاحب	اندرون باغ ایک ہی چبوترے پر دونوں مزار ہیں۔
۱۰۹	بی بی کلثوم	ممانی برہان الدین	۱۳ صفر کو عرس ہوتا ہے
۱۱۰	سید شاہ صاحب	اولیاء صاحب	ارادت کا حال معلوم نہیں دونوں
۱۱۱	سید عاشق مولا صاحب		ایک ہی چبوترے نور شامیان کے پائیں مزار ہے۔
۱۱۲	سید احمد کبیر رفاعی	عرس ۱۲ ربیع الاول	نگینہ مسجد میں مزار ہے
۱۱۳	سید رکن الدین		ارادت کا حال معلوم نہیں اکھڑے کے
۱۱۴	سید عثمان		ناکہ پر عثمان بانگی صاحب کے مکان میں دونوں مزار ہیں۔
۱۱۵	سید امین الدین نصیر صاحب		مکان حاجی حمید الدین کے دیوار سے لگا ہوا مزار ہے۔
۱۱۶	سید عبدالرحمن عبداللہ صاحب		محبوب ڈرائیور و عبدالرحیم کے مکان کے درمیان میں ہے۔

نقارخانہ دروازے کے قریب مشرق میں قاضیوں کا قبرستان ہے بمغرب میں دو مقبرے ہیں اور مسجد ان مقبروں میں میر تقی میر دلاور کے مزارات ہیں اور مشرق میں گنبد طاہر خان خاں جہاں عمدۃ الملک کے لڑکے کا ہے۔

نمبر شمار	نام	کس سے بیعت تھی	کیفیت
۱۱۷	سید بدرالدین		ارادت کا حال معلوم نہیں نودھو
۱۱۸	سید میراں صاحب		پٹیل کے مکان کے سامنے مزار ہے
۱۱۹	سید نعیم صاحب		یہ سب مودھو پٹیل چندو پٹیل کے
۱۲۰	سید مستقیم صاحب		ضمن احاطے میں مزار ہے۔
۱۲۱	سید جہتاب صاحب		
۱۲۲	سید امان اللہ		بیرون نیم کے درخت کے نیچے مزار ہے۔
۱۲۳	باکوت خان		خاص کی کھڑکی کے باہر مقبرہ ہے۔
	تختۃ بلفوز بارہ سو چوالیس	(سنہ ۱۲۴۴ھ)	سے یہ نام لکھے گئے ہیں۔

حضرات مذکورہ بالا کے علاوہ ملک دکن میں اکثر مقامات پر بہت بزرگ ہیں جو حضرت برہان الدین اولیاء صاحب کی صحبت سے فیض یاب ہوا کرتے تھے۔

فہرست اسماء بزرگان کاغذی پورا

۱	حاجی نظام الدین پیش امام	صاحب عرس ۲۹ ربیع الآخر	لب سڑک گنبد خورد
۲	حاجی چندو صاحب عرس	۳ ربیع الآخر	درخت بڑ
۳	سید امام صاحب عرس	۲۴ ربیع الآخر	درخت بڑ
۴	سید جلال بخاری صاحب عرس	۳ ربیع الآخر	لب سڑک

۵	حافظ جمال صاحب		متصل گنبد حاجی چندو صاحب
۶	شاہ نور محرابی صاحب		چبوترہ سنگ بستہ تالاب سلطان گڈھ
	علی ولی صاحب		زیر درخت بڑ
۷	دولت شاہ درباری صاحب		سلامی گھاٹ احاطہ میں مزار ہے
۸	سید کامل صاحب تاریخ وصال		تاریخ وصال ۲۵ ربیع الآخر ۱۱۱۱ھ ولی یکشنبہ
۹	سید کالے صاحب		متصل حوض رنبور عرس ۱۳ ربیع الآخر لب سڑک
۱۰	استاد وزیر صاحب		عرس ۱۲ شعبان قصاب واڑہ
۱۱	پیر مالک صاحب		عرس ۲۳ ربیع الآخر بازار
۱۲	موسی اسیلانی صاحب		عرس ۱۴ محرم زیر درخت املی
۱۳	پیر عزق		یہ دونوں بزرگ حضرت برہان الدین اولیاء صاحب رفقاء میں ہیں۔ مزار دولت آباد کی گھاٹی کے نیچے دہلی دروازے سے لگے ہوئے مشرق چبوترے پر دونوں مزار ہیں۔
۱۴	شاہ کھرلک صاحب		
	میرا ملا داللہ		بیچ راستہ گھاٹ کے نیچے دروازے کے سامنے

اسمائے گرامی مشائخ چشت جو اورنگ آباد، خلد آباد اور کاغذی پورہ کے علاوہ جنوبی ہند کے دیگر علاقوں میں چلے گئے تھے اور وہیں ان کے مزارات مرجع خلائق ہیں۔

۱۔ انجاؒ۔ انجی اولیاء	وفات ۹۵۵ھ	مزار خاندیس
۲۔ شیخ احمد چشتی	وفات ۹۶۵ھ	مزار برہان پور
۳۔ شاہ ابوالحسن چشتی	وفات ۱۱۶۶ھ	مزار حیدر آباد دکن

حضرت نظام الدین مقبول الٰہی اورنگ آبادی کے مریدوں میں سے تھے۔

۴۔ میر امداد علی علوی	وفات ۱۲۱۹ھ	مزار حیدرآباد
۵۔ شیخ اسد چشتی	وفات ۹۶۵ھ	مزار برہان پور
۶۔ بارک اللہ چشتی	وفات ۸۲۵ھ	مزار احمدآباد گجرات
۷۔ برہان الدین چشتی گجراتی	وفات ۹۸۶ھ	مزار اجمیر
۸۔ بادشاہ صاحب بن ابوالحسن چشتی	وفات ۱۱۷۳ھ	مزار حیدرآباد دکن
۹۔ شاہ بہاء الدین عرف باجن	وفات ۹۱۲ھ	مزار برہان پور
۱۰۔ بدرالدین چشتی شہید	وفات ۷۴۱ھ	جسم کو پرینڈہ کے مقام

پر دفن کیا گیا اور سراقدس "کوکن" پٹن (اورنگ آباد) میں ہے۔

۱۱۔ شاہ بہکاری چشتی اصلی نام نظام الدین ہے۔ مزار مبارک "تاپتی" ندی کے ساتھ جلنے والی نہر کے کنارے ہے۔ تاریخ وفات نامعلوم

۱۲۔ شیخ جمال الدین چشتی گجراتی	وفات ۹۴۰ھ	مزار گجرات
۱۳۔ شیخ جمال الدین چشتی گجراتی	وفات ۹۳۰ھ	مزار گجرات
۱۴۔ شاہ جمال الدین جمن چشتی	وفات ۹۸۲ھ	مزار گجرات
۱۵۔ شاہ حسام الدین خوب میاں	وفات ۱۲۵۷ھ	شاہ پور گجرات

۱۶۔ شیخ حسن محمد چشتی گجراتی (اول)	وفات ۹۸۳ھ	شاہ پور گجرات
۱۷۔ شیخ حسن محمد چشتی گجراتی (دوم)	وفات ۱۰۴۰ھ	شاہ پور گجرات
۱۸۔ شیخ حسام الدین فرخ چشتی گجراتی	ولادت ۱۰۹۵ھ	مزار شاہ پور گجرات
۱۹۔ خواجہ رکن الدین چشتی کان شکر	وفات ۸۲۲ھ	بیرون پٹن گجرات
۲۰۔ شاہ خرم قتال	وفات ۷۴۳ھ	اونڈول خاندیس
۲۱۔ شاہ احمد بن ودس	وفات ۸۸۵ھ	شاہ پور گیٹ احمدآباد
۲۲۔ خواجہ محمد علی خیرآبادی	وفات ۱۲۶۶ھ	خیرآباد (گجرات)
۲۳۔ خواجہ وفا	وفات ۱۱۱۸ھ	اورنگ آباد
۲۴۔ شاہ خاموش چشتی	وفات ۱۲۸۲ھ	مکہ مسجد حیدرآباد
۲۵۔ شیخ رحمت اللہ	۹۶۵ھ	شیخوپورہ
۲۶۔ شیخ رکن الدین چشتی (ثانی)	۱۱۹۸ھ	شاہ پور احمدآباد گجرات
۲۷۔ رشید الدین چشتی	۱۱۰۰ھ	" " "
۲۸۔ رکن الدین بزرگ چشتی	۱۱۱۵ھ	" " "
۲۹۔ رشید الدین چشتی گجراتی	۱۲۴۲	" " "
۳۰۔ شیخ الاسلام سراج الدین چشتی	۸۱۷ھ	برکت پورہ پٹن (گجرات)
۳۱۔ شیخ سراج الدین چشتی ثانی	وفات ۱۰۵۰ھ	مزار شاہ پور احمدآباد گجرات
۳۲۔ خواجہ شمس الدین (سمنان میراں)	وفات ۹۹۶ھ	میرج مرتضے آباد۔ دکن
۳۳۔ حضرت شاہ شریف الدین چشتی	وفات ۱۱۶۸ھ	اورنگ آباد

۳۴۔ شیخ صلاح الدین سیلانی۔ آپ حضرت زرزری زربخش صاحب کے قافلے کے ساتھ دکن آئے تھے اور مرشد کے حکم کے مطابق "پونا" میں قیام کیا۔ وہیں مزار مبارک ہے۔

۳۵۔ شاہ صدرالدین ۔ آپ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کے مریدوں میں سے تھے۔ ۷۵۹ھ میں دکن آئے۔ پیپرہ میں اگت پوری گھاٹ کے قریب بمبئی میں

آپ کا مزار ہے۔

۳۶۔ شیخ صلاح الدین چشتی گجراتی ۱۱۰۰ھ مزار شاہ پور احمد آباد

۳۷۔ شیخ عبدالرشید فاروقی وفات ۱۰۶۷ھ شاہ پورا احمد آباد گجرات

۳۸۔ سید علاؤالدین ضیاءالحسن چشتی وفات ۸۰۱ھ مزار روناپڑاڑاجا (اورنگ آباد)

۳۹۔ شیخ علم الدین فاروقی چشتی وفات ۸۰۹ھ مزار برکت پورہ پٹن گجرات

۴۰۔ عزیزاللہ چشتی فاروقی وفات ۹۰۰ھ مزار شاہ پور گجرات۔

۴۱۔ عبدالقادر چشتی وفات ۱۱۹۱ھ مزار رہبر پورہ حیدر آباد

۴۲۔ شاہ غزنی چشتی وفات ۹۲۰ھ مزار احمد آباد گجرات

۴۳۔ شیخ فریدالدین بن محمود چشتی وفات ۱۰۹۰ھ مزار شاہ پور احمد آباد گجرات۔

۴۴۔ مولوی فخرالدین بن نظام الدین مقبول الٰہی اورنگ آبادی۔ ان کی ساری زندگی اورنگ آباد میں گذری۔ دہلی میں وفات پائی ۱۱۹۱ھ سنہ مزار مبارک حضرت بختیار کاکی صاحب کے احاطے میں ہے۔

۴۵۔ قادرالدین شاہ قادن چشتی وفات ۹۲۰۰ھ مزار پٹن گجرات

۴۶۔ شاہ محمود فاروقی چشتی گجراتی وفات ۱۰۳۰ھ مزار پٹن گجرات

۴۷۔ شاہ میاں جی چشتی وفات ۸۸۹ھ مزار مانڈوہ

۴۸۔ شیخ میاں پیارے چشتی، حضرت سلیم چشتی کے مریدوں میں سے ہیں۔ آپ کی وفات ۸۶۵ھ سنہ میں ہوئی مزار مبارک "گلبرگہ" کرناٹک میں ہے۔

۴۹۔ شیخ محمود عرف شاہ راجن چشتی فاروقی وفات ۹۰۰ھ مزار گجرات

۵۰۔ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز وفات ۸۲۵ھ مزار گلبرگہ

۵۱۔ حضرت میاں چشتی وفات ۹۹۵ھ مزار احمد آباد گجرات

۵۲۔ سید محی الدین بن شاہ بن برہان بن سعید میراں مزار حیدر آباد

۵۳۔ حضرت شیخ محمود میاں چشتی وفات ۱۳۰۵ھ مزار شاہ پور گجرات

۵۴۔ حضرت شیخ محمد چشتی فاروقی گجراتی وفات ۱۰۴۰ھ " " "

۵۵۔ حضرت معین الدین چشتی گجراتی وفات ۱۱۶۲ھ " " "

۵۶۔ شمس العشاق شاہ میراں جی چشتی وفات ۹۱۰ھ مزار حصار بیجاپور

۵۷۔ شیخ موسیٰ چشتی وفات ۹۸۶ھ اجین مالوہ

۵۸۔ شیخ نصیرالدین چشتی گجراتی وفات ۹۱۰ھ پٹن گجرات

۵۹۔ سید نظام الدین ادریس حسینی آپ حضرت محبوب الٰہی کے مریدوں میں سے ہیں۔ انھیں کے قافلے کے ساتھ دکن آئے۔ ۸۳۶ھ میں وفات پائی۔ مزار پٹن اورنگ آباد میں ہے۔

۶۰۔ شاہ نظام الدین چشتی مقبول الٰہی مزار اورنگ آباد

۶۱۔ حضرت شاہ نور حمدی مزار اورنگ آباد میں ہے

۶۲۔ حضرت شاہ شہاب الدین چشتی وفات سنہ ھ مطابق ۱۹۱۱ء سنہ مزار اورنگ آباد

۶۳۔ مولانا یعقوب چشتی۔ حضرت برہان الدین غریب کے مرید تھے اور حضرت زین الدین شیرازی کے ارادت مندوں میں سے تھے۔ پیرو مرشد کے حکم سے گجرات چلے گئے۔ ۸۰۰ھ سنہ میں وصال ہوا۔ اور مزار بھی وہیں ہے۔

۶۴۔ حضرت یعقوب چشتی ثانی وفات ۹۲۷ھ مزار بی بی پورہ احمد آباد

۶۵۔ شاہ ابوالحسن فخر آبادی وفات ۱۰۱۰ھ فخر آباد زہرہ پور۔ سی پی۔

جیسا کہ میں عرض کر چکی ہوں کہ میں نے یہ فہرست اولیائے دکن سے مرتب کی ہے اس میں اور بزرگان دین کے حالات بھی ہیں جن کا تعلق نقش بندیہ، سہروردیہ یا قادریہ سلسلے سے ہے لیکن یہاں صرف خواجگان چشت کا تذکرہ ہے اور خصوصاً ان کا جو حضرت منتخب الدین زرزری زر بخش کے ساتھ آئے یا بعد کو حضرت برہان الدین غریب کے کاروان شوق میں شامل ہوئے۔

اولیائے دکن میں ان کے حالات نامکمل اور انتہائی مختصر ہیں۔ تاہم ان کی اولاد اور مزارات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اب یہ کام ان حضرات کا ہے جو موجودہ دور میں اس علاقے کے رہنے والے ہیں یا ان کے سلسلوں سے وابستہ ہیں کہ وہ ان کے مزارات، درگاہوں کے طرز تعمیر اور حالات زندگی پر سیر حاصل معلومات فراہم کریں تاکہ عرفان اور تصوف کا یہ ذخیرہ جو ہمارے علاقوں کی زمین میں مدفون ہے کہیں ہمیشہ کے لیے ضائع نہ ہو جائے۔

"حضرت شاہ نور حموی رح"

حضرت شاہ نور حموی رح کا مزار مبارک اورنگ آباد کی قدیم بستی کے جنوب میں بالکل غیر آباد مقام پر تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اب آبادی کے اضافے کے ساتھ وہاں بھی مکانات کی تعمیر ہو رہی ہے۔ یہ درگاہ ایک بہت بڑے احاطے پر مشتمل ہے جو احاطہ کلاں کہلاتا ہے۔ اس کے اندر ایک چبوترے پر ایک خانقاہ ہے اور شہر سے آتے وقت ایک کمان کے اندر داخل ہونا پڑتا ہے جہاں سے درگاہ کا احاطہ کلاں کی حد شروع ہوتی ہے۔ اس کے اندر درگاہ کا اصلی احاطہ ہے جس میں داخل ہونے کے لیے ایک رعب آفریں دروازہ اور چھتا ہے۔ طرز تعمیر خالصتاً مغلیہ دور کی ہے۔ اس پھاٹک سے جوں ہی اندر داخل ہوں تو داہنی طرف کچھ کمرے، خانقاہیں اور مجاوروں کے رہائشی مکانات ہیں چونکہ صدر دروازہ مشرق کے رخ ہے۔ اس لیے اس کے بالمقابل ایک خوبصورت حوض ہے جس میں وضو کرنے کے لیے پتھر کی چوکیاں ہیں اور موتی برساتے ہوئے فوارے ملک عنبر کے حسن کی تعمیر کی داد دیتے رہتے ہیں۔ اس حوض کے ساتھ ہی مغرب کے رخ ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ پھاٹک اور حوض کے درمیان داہنے ہاتھ کی طرف جو قابل دید چیز ہے وہ ایک بہت بڑا تناور مولسری کا درخت ہے جس کی بلندی اور تنے کی موٹائی غیر معمولی ہے جس کے گرد ایک سیمنٹ کا پکا چبوترہ بنا دیا گیا جس پر لوگ پھول اور شیرینی کی دکانیں لگائے بیٹھے رہتے ہیں اور پشت کی طرف اکثر زائرین سستانے کے لیے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ حصہ اتنا فرحت بخش اور ٹھنڈا ہے کہ انتہائی گرم موسم میں بھی یہاں ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں اور یہاں پر بیٹھنے والے کا دل اٹھنے کے لیے نہیں چاہتا۔

جنوب کی طرف دیوار سے متصل درگاہ کا اصل دروازہ ہے۔ اوپر جانے کے لیے پانچ چھ سیڑھیاں چڑھنا پڑتی ہیں۔ اندرونی احاطے داہنی طرف جنوب کے رخ ایک اور مسجد ہے جس کے محراب دور سب مغلیہ طرز کے ہیں۔ مشرق اور مغرب میں صرف مضبوط چہار دیواری ہے جس کے کنارے کنگورے دار ہیں اور ان میں چراغاں کرنے کے لیے طاقوں کی ایک قطار بنی ہوئی ہے۔ مغرب میں اصل حجرے کے پائنتی ایک اور دروازہ ہے جو باہر کے قبرستان میں کھلتا ہے۔ اب اس کو خواتین کے لیے بند کر دیا گیا ہے کیونکہ اس کی گذرگاہ قبرستان میں سے ہے۔ اسی دروازے کے متصل جنوبی دیوار میں ایک اور احاطہ ہے جہاں دو ایک گھنے پیڑ لگے ہیں۔ ان پر ایک گھنہ پیڑ لگا ہے۔ اور ایک کتبے پر لکھا ہے۔ امانت علی دیانت علی اور تاریخ وفات ۱۰۹۴ھ ہے یہ اورنگ زیب عالمگیر کے بڑے معتبر اور معتمد وزیر تھے۔ ان کا حال آگے آئے گا۔

مغربی دیوار سے متصل جو مسجد ہے اس کے داہنی طرف ایک مستطیل اور خوبصورت حوض ہے اور مسجد کا شمالی حصہ جو اس سے متصل ہے۔ وہاں کی دیوار میں ایک بڑا سا محراب کاٹ کر اس میں جالیاں لگا دی گئی ہیں۔ یہ طرز تعمیر عالمگیری اور آصف جاہی دور کا ہے تاکہ شمال سے آنے والی ہوائیں گرمیوں کے موسم میں حوض کے پانی پر سے گذرتی اور فواروں کو چھیڑتی ہوئی اندر پہونچتی اور پانی کی خنکی اور برودت مسجد کے نمازیوں کے لیے فرحت اور سکون کا باعث بنے۔ اورنگ زیب نے اپنی ملکہ "دل رس" بانو کا جو مقبرہ اورنگ آباد میں تاج محل کے نمونے پر بنایا ہے اس کی مسجد میں بھی یہی اہتمام رکھا گیا ہے کہ شمالی دیوار کے ساتھ باہر پانی کا ایک چھوٹا سا ذخیرہ بنا دیا گیا ہے تاکہ ہوائیں پانی کو چھوتی ہوئی سنگ مرمر کی جالیوں سے گذر کر اندر آئیں۔

اندرونی چہار دیواری کے پکے فرش پر درمیان میں حضرت شاہ نور حموی صاحب کا شاندار مزار اور حجرہ ہے۔ گنبد مغلیہ دور کا ہے۔ اس کے بائیں جانب ذرا سا جنوب میں ہٹ کر ایک اور حجرہ ہے اس پر بھی ایک گنبد ہے۔ یہ مزار حضرت شاہ نور حموی صاحب کے خاص مرید اور مصاحب حضرت شہاب الدین کا ہے (تذکرہ

اولیائے دکن میں ان کا نام یہی ہے اور مزار بھی یہیں بتایا گیا ہے لیکن عوام الناس میں ان کا نام شمس الدین مشہور ہے۔ جن کا تذکرہ کہیں نہیں ملتا۔ اس لیے ہم کتاب ہی کی سند کو درست مانتے ہیں اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ مزار واقعی شمس الدین کا ہے تو شہاب الدین مزار کا پتہ چلانا پڑے گا۔)

آپ کے گنبد کے دائیں طرف بائیں جانب والے گنبد والے گنبد اور حجرے کی ہو بہو نقل میں ایک اور حجرہ اور گنبد اب یعنی ۱۹۸۵ء میں دو سال قبل زیر تعمیر تھا۔ میں نے جب استفسار کیا تو پتہ چلا کہ یہ حضرت شاہ نور حموی صاحب کے مجاور کا مزار ہے۔ جن کا انتقال حال ہی میں ہوا ہے اور ان کی اولاد اور احباب ان کو حضرت شہاب الدین کے برابر درجہ دے رہے ہیں۔

حضرت شاہ نوری حمدی صاحب کے مزار کے سامنے اور گنبد کے حجرے کے باہر کا فرش نہایت قیمتی اور خوشنما چینی کی اینٹوں سے بنا ہے جس پر بہت حسین بیل بوٹے ہیں۔ پہلے یہ چھوٹا سا چبوترہ یا پلیٹ فارم کھلا ہوا تھا لیکن موجودہ حکومت نے اس کے گرد لوہے کی جالیوں کا کٹھرا لگا دیا ہے تاکہ ایک ہی راستے سے زائرین اندر آئیں۔ اس کے سامنے لوہے کے مستون بنا کر ایک اور شامیانہ سا بنایا گیا ہے تاکہ عرس کے موقع پر یہ عارضی سماع خانہ بن جائے۔ یہ انتظامات موجودہ حکومت نے اس لیے کیے ہیں کہ یہاں دن بدن زائرین کی تعداد بڑھ رہی ہے اور اب شاہ گنج سے آپ کے مزار یعنی عثمان پورے تک اسپیشل بسیں صرف زائرین کے لیے چلتی ہیں۔

حضرت شاہ نور حموی کے حالات زندگی

حضرت شاہ نور حموی صاحب کے والد ماجد کا نام سید عبداللہ بن سید ابوالعلی تھا جو آپ کو بچپن ہی میں یتیم کر گئے۔ آپ نے گیارہ برس کی عمر میں اپنی والدہ ماجدہ سے علوم ظاہری و باطنی حاصل کیے اور پھر حضرت شرف الدین قطب حموی سے سلسلہ چشتیہ میں بیعت کی۔ بارہ برس تک حضرت پیر و مرشد کی خدمت میں رہے اور چوبیس برس کی عمر میں حصول علم اور دین کی خاطر سیر و سیاحت کے لیے نکل گئے۔

آپ اورنگ آباد کی بستی یعنی (فتح نگر) آباد ہونے سے پہلے کئی مرتبہ اورنگ آباد آ چکے تھے۔ اور آخر کار آپ نے بستی سے ایک کوس (دو میل) دور ایک پر سکون مکان پر مستقل طور پر سکونت اختیار فرمائی۔

جب آپ سے آپکی عمر مبارک کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا میں اورنگ آباد کی بستی بسنے سے بہت پہلے یہاں آتا رہا ہوں۔

دوسری مرتبہ جب آپ سے یہ سوال پوچھا گیا تو آپ نے تبسم کے ساتھ فرمایا کہ اکبر اعظم نے جب آگرے کے قلعے کی بنیاد رکھی ہے میں اس وقت "سکر" کی حالت میں تھا۔ اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے بڑی طویل عمر پائی۔ اگر اکبر اعظم کی تخت نشینی کو ہی آپ کا سنہ پیدائش مان لیا جائے یعنی سنہ ۱۵۵۶ء مطابق سنہ ۹۶۴ھ تو اس حساب سے آپ نے ۵۰ برس اکبر اعظم، ۲۲ برس جہانگیر اور ۳۰ برس شاہجہان کا دور دیکھا۔

اور اورنگ زیب کی تخت نشینی کے سترہ برس بعد سنہ ۱۱۰۳ھ میں وفات پائی۔ یعنی آپ کی وفات کے وقت آپکی عمر (۵۰ + ۲۲ + ۳۰ + ۱۷ = ۱۱۹) سوا سو سال کے قریب تھی۔ اتنی طویل عمر آپ نے صرف اللہ کی رضا جوئی اور عبادت میں گذار دی۔

آپ کی حیات طیبہ کا ایک واقعہ بطور خاص مشہور ہے۔ جیسا کہ میں بتا چکی ہوں کہ آپ اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں زندہ تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب اورنگ زیب نے اپنا پایہ تخت فتح نگر کو بنایا تھا اور اس کو اورنگ آباد کا نام تھا۔ حضرت شاہ نور حموی صاحب اپنی پیرانی سالی کے باوجود اپنے حجرے میں دن رات ریاضت میں مصروف رہتے اور اکثر و بیشتر کئی روز باہر تشریف نہ لاتے۔

ادھر مرہٹوں کا زور بڑھ رہا تھا۔ آئے دن وہ چھاپے مار کر سلطنت مغلیہ کو کمزور کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔ اس نازک موقع پر اورنگ زیب عالم گیر نے ایک دن اپنے معتبر، معتمد اور مخلص وزیر امانت علی بن دیانت علی کو طلب کیا اور حکم دیا کہ وہ تیز رفتار گھوڑے پر دہلی جائے اور شاہی محل میں ایک مخصوص جگہ پر رکھی ہوئی شاہی دستاویزات لے کر وہاں قیام کیے بغیر فوراً اورنگ آباد لوٹ آئے۔

حکم شاہی کی تعمیل لازمی تھی۔ امانت علی نے فوراً برق رفتار گھوڑا لیا اور اپنی شہ سواری کے کمالات دکھاتا ہوا جلد از جلد دہلی پہنچا۔ ظاہر ہے کہ اس نے دہلی جانے کے لیے وہی راستہ اختیار کیا جو علاؤالدین خلجی کے نقش قدم بنا گئے تھے اور جن کو سلطان محمد تغلق نے مستحکم کیا تھا۔ یہ راستہ اورنگ آباد کے شمال سے مرہٹوں کے شورش زدہ علاقوں سے گذرتا ہوا دہلی جاتا تھا۔

امانت علی خان اپنے وقت مقررہ پر دہلی پہنچا وہاں سے دستاویزات اور دیگر کاغذات اٹھائے ان کو پرکھا اور مطلوبہ دستاویزات لے کر وہاں سے واپس اورنگ آباد آیا۔ اورنگ زیب عالم گیر نے جب ان مطلوبہ کاغذات کو دیکھا تو پتہ چلا کہ ان میں ایک اہم دستاویز کم ہے۔

تم نے یہ دستاویز کہاں گم کر دی! اس نے گرج کر امانت علی سے سوال کیا۔

جی! عالی جاہ! یہ میں دہلی میں وہیں بھول آیا ہوں جہاں یہ سب کاغذات تھے۔ اس نے لرزہ اندام ہو کر کہا۔

اچھا... تم... اور یہ بھول.... کیسے ممکن ہے۔ عالمگیر کی جبیں شاہانہ پر شکن پڑی اور شکوک و شبہات کے اندھیرے گہرے ہونے لگے اور بیچارے امانت علی کو موت اپنی آنکھوں کے سامنے منڈلاتی نظر آنے لگی۔

میں آپ سے سچ کہہ رہا ہوں عالی جاہ۔ میں وہ دستاویز وہیں بھول آیا ہوں۔ اس نے پھر ہاتھ جوڑ کر عرض کیا لیکن عالم گیر جیسے مدبر اور منتظم کو یقین دلانا مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ وہ بڑی دیر تک غصہ میں ٹہلتا رہا اور پھر سوچ کر کہا۔

میں کچھ نہیں جانتا اگر میرا کوئی کاغذ مرہٹوں کے ہاتھ لگ گیا تو غضب ہو جائے گا۔ تم ہر قیمت پر "تین" دن کے اندر میری دستاویز مجھ کو واپس کر دو۔ ورنہ پرسوں صبح تک اپنے سر کو اپنے جسم پر نہیں پاؤ گے۔ میں کسی غدار کو نہیں بخشوں گا۔

امانت علی پر جو گذر رہی تھی اس کا صرف اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ سر پر تلوار لٹک رہی تھی۔ ملک الموت تیار کھڑے تھے اور دنیا اندھیر تھی۔ اسی مایوسی اور پریشانی میں اس کو فوراً حضرت شاہ نور حموی صاحب یاد آئے۔ امید کی ایک کرن مل گئی۔ فوراً بستی سے باہر دو میل یا ایک کوس جنوب کی طرف آپ کے حجرے پر پہونچا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ باہر خادموں سے پوچھا۔ جواب ملا کہ حضرت اندر مصروف عبادت ہیں۔ نہ جانے کب برآمد ہوں۔

بیچارے امانت علی نے ایک سرد آہ بھری اور مایوسی کے عالم میں وہیں پر آپکی چوکھٹ پکڑ کر بیٹھ گیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ وہ موت کے قدموں کی آہٹ کو اپنے سے قریب سے قریب تر محسوس کر رہا تھا۔ شام کا سورج ڈھل گیا۔ رات آئی صبح ہوئی دن چڑھا دوپہر ڈھلی اور دوسری رات بھی آنکھوں میں کٹ گئی۔ امانت علی کو اب اپنی موت

یقین ہو گیا۔ کل صبح دربار میں وہ ہوگا اور جلاد کا تیغہ۔ تین دن کی مدت ختم ہونے والی ہے۔ صرف دو ایک گھنٹہ کی بات ہے۔

تیسرے دن کا سورج طلوع ہونے والا تھا۔ رات کی تاریکی تھی۔ اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا۔ روح عالم تھرآئی۔ حجرے کا دروازہ کھلا اور حضرت شاہ نور حمدی صاحب فجر کی نماز کے لیے برآمد ہوئے۔

امانت علی کو جیسے نئی زندگی مل گئی۔ لپک کر آپ کے قدموں پر گر پڑا اور رو رو کر سارا ماجرا سنایا۔ آپ نے اس کو اٹھا کر دلاسا دیا۔ صبح کی نماز پڑھائی اور بڑے باوقار اور شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

تم کو یاد ہے کہ دستاویز کہاں ہے؟

جی ہاں۔

اگر میں تم کو دہلی بھیج دوں تو تم اس کو لا سکتے ہو!

جی حضور مگر..... اس کے بعد وہ خاموش ہو گیا کیونکہ وہ یہ الفاظ زبان سے ادا نہ کر سکا کہ میرا اس وقت دہلی جانا ناممکن ہے۔ اس کے لیے جس قدر عرصہ درکار ہوگا اتنے دن اورنگ زیب جو نہیں کر سکتا۔ جو مہلت اس کو ملی ہے وہ اب صرف گھنٹہ بھر کی ہے۔

"تم قبلے کی طرف منہ کر کے بیٹھو"۔ شاہ نور حمدی صاحب نے حکم دیا اور اس کے بعد امانت علی کے سر پر اپنا رومال ڈال کر اس کی آنکھیں بند کیں اور فرمایا۔

اپنی دستاویز جہاں رکھی وہاں سے اٹھا لو

اور جب امانت علی نے آنکھیں کھولیں تو مطلوبہ دستاویز اس کے ہاتھ میں تھی۔ پہلے تو اس کا چہرہ دفور مسرت سے دمکنے لگا لیکن بعد کو اس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

"اب کیا بات ہے" آپ نے دریافت فرمایا۔

میں کیا عرض کروں! آپ کا کرم ہے۔ احسان ہے لیکن اندیشہ ہے کہ کہیں

جہاں پناہ عالم گیر یہ نہ سمجھیں کہ یہ کاغذ میرے ہی پاس تھے اور میں موت کے ڈر سے اب اس کو واپس کر رہا ہوں اور ان کا یہ خیال غلط بھی نہ ہو گا کیونکہ تین دن کے اندر دہلی جانا اور آنا ناممکن ہے۔

تم فکر نہیں کرو۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ نے کمال شفقت سے فرمایا اور بیچارا امانت علی جان پر کھیل کر اورنگ زیب کے حضور پہونچا۔ کاغذ پیش کیا اور وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ یعنی اورنگ زیب کو اور زیادہ پکا یقین ہو گیا کہ کاغذ خود اس نے اپنے پاس چھپا کر رکھا تھا۔

یہ سب کیا ہے امانت علی۔ اب تم اپنی صفائی میں کیا کہنا چاہتے ہو! اور جواب میں امانت علی نے اس کو اپنی ساری داستان لفظ بلفظ سنا دی۔ عالم گیر خود عالم اور درویشوں کی عزت کرنے والا تھا۔ تصدیق کے لیے فوراً امانت علی کے ساتھ حضرت شاہ نور حمدی صاحب کے حجرے پر پہنچا جو اس وقت پھر اندر سے بند تھا۔ عالم گیر نے عالم اضطراب میں دو تین بار دستک دی یہاں تک کہ آپ حجرے سے برآمد ہوئے اور بلا کسی تمہید کے کہا۔

یہ کیا بیقراری ہے۔ محی الدین عالم گیر!

حضور میرے لیے سکون کی دعا کریں۔ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

" سرمد شہید کا خیال تمہیں کہیں چین نہیں لینے دیتا۔" آپ کی یہ نرم اور دھیمی آواز اس وقت شہنشاہِ ہند کا دل چیر گئی۔ فوراً اس مردِ باخدا کے قدم پکڑ لیے۔

اس کے بعد شاہ نور حموی صاحب نے اس کو اپنے پیروں تلے کی خاک چٹا کر یہ کہا کہ اب تمہیں اس بستی میں قرار آجائے گا۔

اور اس کے بعد دنیا نے دیکھ لیا کہ اورنگ زیب کو اس بستی میں ایسا قرار آیا کہ اپنی ساری زندگی وہیں گذار دی اور وہیں کی خاک کا پیوند ہو گیا اور اس کی موت کے بعد حضرت کی دعا کے مطابق یہ تاثیر اس کی قبر کی مٹی میں باقی رہی کہ جو بیقرار اس کو کھا لے اس کو قرار آجائے (اورنگ زیب کا مزار حضرت زین الدین شیرازی کے

قدموں میں ہے۔ اس کی قبر کا چبوترہ سنگ مرمر کا ہے۔ جالیاں بھی سنگ مرمر کی ہیں۔ لیکن قبر کا تعویذ کچا ہے اور وہاں کی مٹی کو لوگ اختلاج قلب اور ہَول دِل کے لیے اکسیر سمجھ کر اب بھی چاٹتے ہیں۔

اس کے بعد امانت علی کی سزائے موت کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہا اور خود اورنگ زیب پابندی کے ساتھ آپ کے آستانے پر حاضری دیتا رہا۔

اس واقعہ کے بعد سنہ ۱۰۹۴ھ میں امانت علی کا انتقال ہو گیا اور وہ آپ کے حجرے کے پائنتی دفن کر دیا گیا۔ اس احاطے میں جہاں امانت علی کا مزار ہے وفات کی تاریخ ۱۰۹۴ھ درج ہے (اورنگ زیب کا دور ۱۰۶۹ھ سے ۱۱۱۹ھ تک ہے) تاریخوں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ امانت علی اورنگ زیب کی زندگی ہی میں وفات پا گیا اور اس کی وفات کے بعد ۱۲۰۲ھ میں حضرت شاہ نور حموی صاحب کا وصال ہوا اور یہ عالی شان درگاہ خود اورنگ زیب نے تعمیر کروائی۔

امانت علی کو حضرت شاہ نور حموی صاحب سے اتنی عقیدت تھی کہ اس نے کسی مجاور سے خواب میں فرمائش کی کہ حضرت شاہ نور حموی صاحب کے مزار مبارک پر پھول باہر پھینکنے کے بجائے میری قبر پر ڈال دیئے جائیں چنانچہ اس پر صدیوں عمل ہوتا رہا یہاں تک کہ احاطہ پھولوں سے بھر گیا۔ اور کسی کو یاد بھی نہ رہا کہ یہاں کوئی مزار ہے۔ اس کے بعد اس کی صفائی ہوئی۔ مزار برآمد کیا گیا لیکن حضرت شاہ نور حموی کے مزار کے اترے ہوئے پھول اب تک وہیں ڈالے جاتے ہیں۔

میں یہ باتیں کسی کتابی حوالے کے بغیر اس قدر وثوق اور تفصیل سے لکھنے کی جرأت یوں کر رہی ہوں کہ یہ دونوں واقعے سینہ بسینہ لوگ بیان کرتے چلے آرہے تھے اور میری عادت بچپن ہی سے ہر بات کو ذہن میں محفوظ کرنے کی تھی۔ اس لیے یہ سب داستانیں میرے حافظے میں محفوظ ہیں۔ اس کے بعد ۱۹۴۵ء کے قریب میرے سگے خالو حافظ نصیر احمد علوی کو اورنگ آباد کے اوقاف کا مہتمم بنا دیا گیا۔ وہ ۶۵ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ اس وقت حیدرآباد یعنی مملکت آصفیہ اپنے عروج پر تھی پرسکون

زندگیوں کے ساتھ ساتھ علم وادب، مذہب اور عرفان کے چرچے بھی عام تھے۔ حضرت مسافر شاہ کا کتب خانہ پن چکی کی حسین عمارت میں موجود تھا۔ (اس کا ذکر آگے آئے گا) اور اس کتب خانے میں تاریخ ادب اور شعر وسخن کی بیش قیمت کتابوں کے ساتھ ساتھ اولیائے کرام کے حالات زندگی اورنگ آباد خلد آباد اور دولت آباد کی قدیم تاریخ کے دُرِ بیش بہا بھی موجود تھے۔ نہ جانے کتنی نادر کتابیں تھیں اور کتنے انوکھے نسخے۔ یہ سب سرکاری طور پر حافظ نصیر احمد علوی کی تحویل میں تھے۔ وہ خود شریعت کے پابند تھے اور بزرگان دین کے خلاف کسی غلط بیانی کو برداشت ہی نہ کر سکتے تھے۔

انہیں نے کتابوں کے مطالعہ کے بعد بتایا کہ حضرت امیر حسن سنجری کے متعلق یہ روایت غلط ہے کہ انھوں نے کتب خانہ اپنے ساتھ دفن کر دیا تھا یا حضرت گنج رواں صاحب کے یہاں جو پریوں کا تالاب ہے وہاں کوئی حور پری نہیں ہے بلکہ وہاں پریوں کے سائے سے عورتوں کو صرف اس لیے ڈرایا گیا ہے کہ وہ وہاں جا کر غسل نہ کریں کیونکہ اہل خانقاہ وہاں وضو کرتے ہیں اور خانقاہ کے حجروں کے اس رخ کھلتے ہیں۔

اس طرح انہوں نے عالمگیر کے متعلق ان دونوں روایتوں کی توثیق دین کے کتب خانے کے قلمی اور نایاب نسخوں کی مدد سے کی تھی۔ انھوں نے پہلی بار پھولوں کا ڈھیر صاف کروا کے امانت علی کا مزار برآمد کیا تھا۔ اس پر ان کا نام اور سنہ وفات کی تختی بھی انہی نے تحقیق کے بعد لگوائی حضرت زر زری زر بخش صاحب کے بیرونی احاطے میں عرس کے موقع پر دوکانداروں کے حدود مقرر کرنے کے لیے بڑی سی کمان کی دوبارہ تعمیر اور پن چکی میں سڑک کی سمت پردے کی دیوار انہی نے بنوائی تھی۔

اس وقت میں کیا کسی کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ سلطنت آصفیہ کی یہ بہار اس طرح خزاں میں بدل جائیگی کہ ان کتب خانوں میں ردی کے ڈھیر کے علاوہ کچھ بھی نہ ملے گا ورنہ ہم ان روایتوں کے ساتھ ساتھ ان کتابوں کو بھی سرمہ چشم ونظر بنا کر رکھ لیتے۔

حضرت شاہ نور حموی رح جیسے بلند پایہ عارف اور انسان کامل صدیوں بعد جنم لیتے ہیں۔ آپ کی اورنگ آباد تشریف آوری اور مستقل سکونت بستی والوں کے لیے بڑی نعمت بنی۔ جب آپ نے یہاں مستقل قیام کا ارادہ فرمایا تو سب سے پہلے اپنے حجرے مبارک کے جنوبی گوشے میں بیٹھ کر پورے بارہ برس تک حبس دم کا عمل کیا (حوالے کے لیے دیکھئے اولیائے دکن) جس سے ان کی ضبط نفس، صبر وتحمل اور کردار دریافت کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ جس جگہ آپ نے یہ عمل کیا تھا وہاں اب تک ایک محراب بنی ہوئی ہے جو اس مقام کی نشاندہی کرتی ہے۔ چنانچہ مرد زائرین اسی محراب میں حجرے کے اندر دو رکعت نماز نفل ضرور ادا کرتے ہیں اور اس کے بعد جو دعا مانگی جاتی ہے اللہ تعالے قبول فرماتا ہے۔

آپ کے جن مرید سید شہاب الدین کا میں نے ذکر کیا ہے ان کے متعلق تذکرۂ اولیائے دکن میں لکھا ہے کہ آپ سید بدر الدین کے صاحبزادے تھے۔ یوپی (غالباً بدایون) میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے نیک صالح اور اطاعت گذار تھے۔ سلسلہ نسب سعد وسادات سے تھا۔ عرصہ تک مولانا عبد الباقی صاحب کی خدمت میں رہے اور جلد ہی ولی کامل بن گئے۔ لیکن اپنے سچے اور مخلص رہبر کی تلاش برابر جاری رہی۔ جو راہ سلوک میں انکی رہبری کرے جوان کے دل کو نور عرفان سے بھر دے۔ اسی تلاش میں آپ اجمیر شریف پہنچے سلطان ہند کے دربار میں حاضری دی اور وہیں چلّہ کھینچ کر بیٹھ گیے۔ ذوق مجاہدہ اور حقیقی تلاش رنگ لائی۔ ابھی چالیس دن ختم ہونے میں تین روز کا وقفہ تھا کہ آپ نے خواب میں دیکھا کہ ایک عالی شان محل میں ایک دربار لگا ہوا ہے اور اس میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی سلطان ہند مسند آرا ہیں۔ اتنے میں ایک اور بزرگ دائیں طرف سے اندر آئے اور سلطان ہند نے ان کو بڑی محبت کے ساتھ اپنے بازو بٹھا لیا اور جب یہ عرفانی اور نورانی محفل اختتام پر پہنچی تو خواجہ صاحب غریب نواز نے سید شہاب الدین کا ہاتھ ان کے آنے والے بزرگ کے ہاتھ میں دیدیا اور فرمایا۔ ہم اس سید کو آپ کے سپرد کرتے ہیں۔ انہوں نے تعمیل میں ارشاد میں سید شہاب الدین کا ہاتھ

اپنے ہاتھ میں لے لیا اور جب شہاب الدین نیند سے بیدار ہوئے تو ان کا عجب حال تھا جوں توں کر کے تین دن پورے کیے اور اجمیر سے نکل کر اپنے اس پیر و مرشد کی تلاش میں چل نکلے جن کے ہاتھ میں حضرت غریب نواز نے آپ کا ہاتھ دیا تھا۔ نہ جانے ان کو اپنے مرشد کی تلاش کہاں کہاں بھٹکاتی رہی۔ آخر کار دور دراز کا سفر طے کر کے اورنگ آباد آئے اور اس کے جنوب میں غیر آباد علاقے میں ایک چھوٹی سی مسجد میں پہنچے جہاں حضرت شاہ نور حموی صاحب موجود تھے۔ جوں ہی حضرت نے ان کو دیکھا تو بے اختیار فرمایا۔

آجاؤ شہاب الدین تمہاری سفارش بڑے خواجہ نے کی ہے۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی جب حضرت شہاب الدین نے ان کے چہرۂ مبارک کو غور سے دیکھا تو فوراً پہچان لیا کہ یہ وہی حضرت ہیں جن کو انھوں نے خواب میں دیکھا تھا اور جن کی تلاش انہیں یہاں تک لائی ہے۔ فوراً قدم بوس ہوئے اور بیعت سے سرفراز ہونے کے بعد دس برس تک اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں رہے اور آخر وقت تک اپنی عقیدت اور ارادت کا حق ادا کرتے رہے۔ یہی نہیں بلکہ اورنگ آباد میں بہت سی خانقاہیں، مساجد اور کنویں انہوں نے ذاتی خرچ سے خلق خدا کی خدمت کے لیے بنوائے۔

حضرت شاہ نور حموی کے وصال کے وقت ان کے پاس حضرت خواجہ شہاب الدین موجود تھے۔ اور دوسرے ارادت مند بھی آپ کے ارد گرد جمع تھے۔ اتنے میں حضرت شاہ نور حموی صاحب نے شہاب الدین کو کچھ اشارہ کیا اور فرمایا۔

"آپ اول بھی سید ہیں اور آخر بھی سید ہیں۔"

اس شہاب الدین نے کہا۔ "ہاں"

اور اس کے بعد کلمہ پڑھ کر جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

بعد کو جب دیگر مریدوں نے حضرت شہاب الدین سے دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ حضرت شاہ نور حموی صاحب کو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کا انتظار تھا۔ انھیں کے لیے آپ نے یہ فقرہ کہا تھا اور اس کے بعد ان کوئی تمنا نہ

رہی اور آپکی روح اطہر پرواز کر گئی۔

بعد کو آپ کے کسی ارادت مند نے "نور محض" سے آپکی تاریخ وفات نکالی آپ اپنے حجرے میں مدفون ہوئے۔

خواجہ شہاب الدین عرصہ تک حیات رہے لیکن ان کا مزار کہاں ہے۔ اس کی توثیق یوں مشکل ہے کہ اگر اولیائے دکن کے مصنف کا لکھا درست نہ مانا جائے تو وہ مزار خواجہ شمس الدین کا ہے جن کا وصال ۱۱۹۱ھ میں ہوا ہے اور اورنگ آباد کے پرانے لوگ ان کے دفن میں شریک تھے اور خواجہ شہاب الدین کا مزار کہیں اور تلاش کرنا پڑے گا۔ اور اگر مصنف اولیائے دکن کا لکھا درست ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ یہی شہاب الدین ہوں جن کی میت کو بعد کو کہیں سے لا کر دفن کیا گیا ہو کیونکہ پرانے لوگ یہی بتاتے ہیں کہ شمس الدین کا جنازہ اجمیر سے یہاں لایا گیا تھا۔ واللہ عالم بالصواب۔

حضرت شاہ نور حموی صاحب کے مزار کے باہر ایک اور احاطہ ہے جس میں ایک مزار حضرت "بوریا" صاحب کا ہے جس کا اصلی نام "بے ریا" تھا۔ ان کے مزار پر بھی زائرین خصوصاً خواتین کثرت سے جاتی ہیں اور منت پوری ہونے کے بعد ان کے مزار پر رکھے ہوئے ایک گول پتھر کے برابر "گڑ" تول کر اس پر فاتحہ کرتی ہیں اور بچوں میں یہ گڑ تقسیم ہو جاتا ہے۔

حضرتِ نظام الدین مقبول الٰہی اورنگ آبادی

حضرت نظام الدین مقبول الٰہی اورنگ آبادی کا درجہ اورنگ آباد کی بستی میں وہی ہے جو دہلی میں حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کا ہے۔ دونوں کا سلسلہ ارادت چشتیہ ہے۔ اورنگ آباد میں آپ اس وقت تشریف لائے جب یہ بستی تعمیر ہو چکی تھی چنانچہ ان کا مزار اور خانقاہ قلب شہر میں شاہ بازار کے محلے میں ہے۔ مزار نہایت سادہ ہے لیکن احاطہ بڑا ہے۔ سڑک پر سے جو راستہ اندر جاتا ہے وہ احاطے کا شمال ہے۔ جنوب میں مکان اور خانقاہ میں مغرب کی سمت ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد ہے جو عالم گیری عہد یا آصف جاہی دور کی تعمیر ہے کیونکہ دونوں کے طرز تعمیر میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ جنوب میں سجادہ نشینوں کے مکانات ہیں اور مشرق میں ایک عالی شان پھاٹک کے اوپر نوبت خانہ ہے اور وہیں ایک دینی مدرسہ ہے۔

حضرت نظام الدین مقبول الٰہی نہ صرف حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کے سلسلے سے تھے بلکہ ان کے پرستاروں میں اور انکی تعلیمات کو عام کرنے والوں میں سے ایک تھے۔ آپ اکثر فرمایا کرتے کہ حضرت محبوب الٰہی نے مجھے اپنا جھنڈا دے کر اورنگ آباد میں بھیجا ہے۔ ان کا جھنڈا وہاں اور میرا جھنڈا یہاں لہراتا رہے گا۔ اس کا مطلب اکثر لوگوں نے یہ لیا کہ جس کی حکومت دہلی پر ہو گی اس کا جھنڈا دکن پر ہو گا۔ اس بات کا وہاں پر خاص وعام میں چرچا رہا کرتا تھا کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ

دکن کی طرف جتنے فاتح آئے سب اورنگ آباد ہی پر قبضہ کرنے کے بعد آگے بڑھے۔

تاریخ شاہد ہے کہ جب مغلوں کا زوال شروع ہوا اور دہلی پر ان کا جھنڈا نہ رہا تو دکن میں بھی مغلیہ سلطنت ختم ہو گئی۔ اس کے بعد جب انگریزوں نے اپنا یونین جیک دہلی پر لہرایا تو ٹیپو سلطان کی ساری حریت پسندی اور شہادت کے باوجود دکن نہ بچ سکا اور نظام الملک آصف جاہ اول اپنی اسلامی سلطنت کے باوجود دفاع اور خارجہ پالیسی میں دہلی ہی کے تابع رہے۔

یہ حوالے تو خیر تاریخ کے ہیں لیکن جب تقسیم ہند کا وقت آیا اس وقت مسلمان پنجاب کی تقسیم کے لیے تیار نہ تھے۔ اور جب دہلی بھارت میں رہ گئی تو عام طور پر بڑی مایوسی ہوئی۔ یہ وہ دور تھا جب میں بی ایس سی کی تعلیم ختم کر چکی تھی۔ آزاد حیدر آباد کا چرچا تھا۔ یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں "وفد" آتے رہے جاتے رہے۔ نوجوانوں میں دکن کی آزادی اور اسلامی ریاست کے تحفظ کا بڑا جذبہ تھا۔ لیکن بوڑھے سر جھکائے خاموش تھے۔ جس سے پوچھو وہ یہی کہتا تھا کہ جب حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کی دہلی میں لال قلعہ پر ترنگا جھنڈا لہرا رہا ہے تو حضرت نظام الدین مقبول الٰہی کی قلم رو میں بھی ترنگا لہرائے گا۔ حیدر آباد دکن کو اب کوئی نہیں بچا سکتا اور اگر پنجاب تقسیم نہ ہوتا تو دہلی مسلمانوں کے پاس ہوتی تو دکن کو کوئی بھارت کا غلام نہیں بنا سکتا تھا۔ اس وقت بزرگوں کی یہ باتیں سن کر ہم نوجوان طبقے کے لوگ خاموش ہو جاتے لیکن وہی ہو کے رہا جس کی انھوں نے پیش گوئی کی تھی۔ شاہان بے تاج کے قلم رو سے جاری ہونے والے فرمان جو مشیت الٰہی کے تابع ہوتے ہیں کوئی بھی رد کر سکا۔

حضرت نظام الدین مقبول الٰہی کا سلسلہ بیعت حضرت محبوب الٰہی کے کسی واسطے سے تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی	مزار مبارک دہلی
۲۔ حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی	مزار مبارک دہلی
۳۔ حضرت خواجہ کمال الدین	مزار مبارک دہلی

۴۔	خواجہ سراج الدین احمد	مزار مبارک پاک پٹن
۵۔	حضرت خواجہ علم الحق	مزار مبارک پاک پٹن
۶۔	حضرت خواجہ محمود راجن	مزار مبارک پاک پٹن
۷۔	حضرت جمال الدین جمن	مزار مبارک گجرات
۸۔	حضرت خواجہ شیخ حسن	مزار مبارک شاہ پور گجرات
۹۔	حضرت خواجہ شیخ محمد	مزار مبارک احمد آباد گجرات
۱۰۔	حضرت یحیٰی مدنی	مزار مبارک مدینہ منورہ
۱۱۔	حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی	مزار مبارک دہلی
۱۲۔	حضرت نظام الدین مقبول الٰہی	مزار مبارک اورنگ آباد

حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کا وصال ۷۲۵ھ میں ہوا اور حضرت نظام الدین مقبول الٰہی نے ۱۱۴۲ھ میں وفات پائی۔ دونوں کے عہد میں چار صدیوں کا فرق ہے۔ اس وقت ہندوستان کی سیاست کہیں سے کہیں پہنچ چکی تھی لیکن صدیوں بعد بھی روحانی فیض جاری تھا اور اب بھی جاری ہے۔

جیسا کہ میں گذشتہ ابواب میں عرض کر چکی ہوں کہ حضرت محبوب الٰہی نے دو مرتبہ دکن کی سمت اپنے مریدوں کے قافلے روانہ کیے تھے۔ ایک حضرت زر زری زر بخش صاحب کے ساتھ اور دوسرا سترہ برس بعد حضرت برہان الدین غریب کے ساتھ دونوں نے اپنے پیر و مرشد کے حکم پر خلد آباد میں ویسا ہی خانقاہی نظام قائم کیا تھا جیسے دہلی میں تھا۔ اور ان کو فاروقی سلاطین کی سرپرستی نے اور زیادہ مستحکم بنا دیا تھا۔ مگر زمانہ کے ساتھ ساتھ اس علمی، روحانی اور اخلاقی نظام میں انحطاط آتا چلا گیا۔ جس وقت حضرت کلیم اللہؒ نے اپنے نوعمر خلیفہ کو اورنگ آباد بھیجا ہے اس وقت دکن بھی انتشار کا شکار تھا۔ عالمگیر کا دور آخر تھا۔ مرہٹوں کی یورش بڑھ رہی تھی اور نظام الملک آصف جاہ اوّل جن کا اصلی نام قمر الدین تھا اپنے صوبے یعنی دکن کی خود مختاری کے لیے جوڑ توڑ کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ سیاسی اور معاشی انتشار اور افراتفری کے ساتھ ساتھ دینی نظام بھی معرضِ قطر میں تھا۔ اس وقت

حضرت نظام الدین مقبول الٰہی نے اس کو دوبارہ مستحکم کیا اور یہی مقصد ان کے دکن آنے کا تھا۔

اس خلفشار اور بدحالی کے دور میں اورنگ آباد کی سرزمین پر ہم کو چار بزرگ ہستیاں ملتی ہیں جن کو تاریخ وفات کے لحاظ سے ترتیب دیا جائے تو یہ سلسلہ بنتا ہے کہ

حضرت شاہ نور حموی	وفات	۱۱۰۳ھ ۱۷۰۹ء	
حضرت پلنگ پوش صاحب	وفات	۱۱۱۰ھ ۱۷۱۷ء	مزار پن چکی اورنگ آباد
حضرت بابا مسافر شاہ	وفات	۱۱۲۶ھ ۱۷۱۴ء	مزار پن چکی اورنگ آباد
حضرت نظام الدین مقبول الٰہی	وفات	۱۱۴۳ھ ۱۷۲۷ء	

دکن کی سیاست اور تاریخ میں ان کا کیا کردار رہا اور ان درویشوں اور بوریا نشینوں نے کتنے تاجدار بنائے اس کا ذکر اسی تسلسل میں آگے آئے گا۔ صرف یہ یاد رہے کہ نظام الملک آصف جاہ اول بانی سلطنت آصفیہ (نظام) کا دور اقتدار ۱۱۳۲ھ سے ۱۱۶۱ھ تک ہے اور ان کے والد غازی الدین بھی اپنے دور کے صوبیدار اور سپہ سالار تھے اور قمر الدین آصف جاہ اول نے انھیں کی آغوش میں تربیت پائی تھی۔

حضرت شاہ نظام الدین کا سلسلہ نسب حضرت شہاب الدین سہروردی کے توسط سے حضرت ابوبکر صدیق پر ختم ہوتا ہے۔ آپ کا وطن کاکوری " نواح لکھنؤ ہے۔ اکثر تذکرہ نویس اس بات پر متفق ہیں کہ آپ کی پیدائش کاکوری کی ہے۔

میں نے اپنے بزرگوں سے یہاں تک سنا ہے کہ حضرت نظام الدین صاحب حضرت حسام الدین کے بھائی ہیں۔ ایک دکن چلے گیے دوسرے وہیں رہ گیے اور ان کی اولاد مخدوم زادے کہلائی۔ چونکہ مخدوم زادگان کی تاریخ ایک علیحدہ چیز ہے اور وہ لوگ لکھنو کاکوری (فتح پور بارہ بنکی) رسولی، ردولی بانسہ اور نہ جانے کہاں کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لیے میں نے اس بات کی تصدیق کرنا چاہی۔ کاکوری میں سب سے بڑا کتب خانہ محسن کاکوری مرحوم کا ہے لیکن اب اس کی قدر دانی تو کجا کتابوں پر سے گرد جھاڑنے کی بھی کسی کو فرصت نہیں ہے اگر میرا قیام وہاں کچھ دن اور ہوتا تو شاید

میں کتابوں کے حوالے سے اس کی تصدیق یا تردید کر سکتی کہ آیا یہ دونوں سگے بھائی تھے یا نہیں۔ سردست جو سنا ہے وہی لکھ رہی ہوں۔

حضرت نظام الدین نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے وطن ہی میں مکمل کی اور اس کے بعد تلاش علم میں دہلی آئے۔ جہاں شاہ کلیم اللہ صاحب کا طوطی بول رہا تھا اور ان کا سلسلہ بیعت بھی چشتیہ نظامیہ تھا۔ آپ نے ان سے ملاقات کا ارادہ کیا نوعمری کا زمانہ تھا۔ علم کی طلب میں سیدھے ان کی حویلی میں پہنچے جہاں اس وقت محفل سماع زوروں پر تھی۔ حضرت شاہ کلیم اللہ صاحب کا دستور تھا کہ جس وقت وہ اور ان کے مریدین اس محفل میں ہوتے تو کسی سے ملاقات نہ کرتے اور نہ کسی غیر کو اندر آنے کی اجازت ہوتی آپ نے دستک دی اور اس آواز پر چونک کر حضرت کلیم اللہ صاحب نے ایک مرید کو باہر بھیجا کر دیکھیں کون ناوقت آگیا ہے کیونکہ دہلی کے لوگ جانتے تھے کہ اس وقت محفل سماع ہے اور حضرت صاحب کسی سے بھی نہیں ملیں گے۔

مرید نے واپس آکر کہا کہ ایک نوجوان ملاقات کا طالب ہے اور اپنا نام نظام الدین بتاتا ہے۔ حضرت نے جوں ہی یہ نام سنا تو فوراً حکم دیا کہ اجنبی کو اندر لے آؤ۔

حضرت کلیم اللہ کا یہ عمل غیر معمولی بھی تھا اور مریدوں کے لیے تعجب خیز بھی کہ آپ نے ایک بیگانے انجانے آدمی کو یوں بے دھڑک کیسے بلا لیا اور وہ بھی محفل سماع میں؟ آپ نے جب ان سے سوالیہ انداز میں اٹھتی ہوئی نگاہیں دیکھیں تو بڑی سنجیدگی سے فرمایا۔

"اس شخص کے نام سے دوستی اور آشنائی کی بو آتی ہے۔ یہ غیر نہیں ہے۔"

ان کا یہ فرمانا نظام الدین کا دل بڑھانے کے لیے کافی تھا۔ آپ انکی صحبت میں رہے اور علوم ظاہری حاصل کرتے رہے لیکن استاد کی نظر نوعمر شاگرد کے باطن پر بھی تھی اور وہ ان کی ذہنی تربیت اور دل کی صیقل گری میں بھی مصروف تھے۔

حضرت نظام الدین بچپن ہی سے ہونہار اور سعادت آثار تھے۔ استاد کے مرتبے کو خوب جانتے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ با ادب بانصیب بے ادب بے نصیب۔ اس لیے

انہوں نے اپنے استاد کا اس طرح ادب کیا جیسے پیر و مرشد کا ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک دن حضرت شاہ کلیم اللہ محفل سے اٹھے اور فرش کے کنارے تک پہنچ گئے۔ باہر جانے کا قصد کیا۔ نظام الدین فوراً آگے بڑھے اور استاد کے جوتے صاف کر کے بصد ادب پاؤں کے سامنے رکھ دیئے۔

حضرت کلیم اللہ کو آپکی یہ ادا بہت پسند آئی۔ نظر عنایت سے آپکو دیکھا اور پوچھا نظام الدین تم ہمارے پاس علوم ظاہری حاصل کرنے آئے ہو یا فوائد باطنی بھی جو زیادہ بہتر اور اچھے ہیں۔

شیخ نظام الدین نے انتہائی عقیدت اور سپردگی کے عالم میں بصد ادب یہ شعر پڑھا۔

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حسابِ کم و بیش را

حضرت کلیم اللہ مسکرائے اور بے اختیار فرمایا۔

آمد آں یارے کہ ما می خواستیم

(یعنی وہ شخص آگیا جس کو میں چاہتا تھا) اور نوعمر نظام الدین کو گلے لگا کر اپنا مرید بنایا۔

واقعہ یہ تھا کہ حضرت کلیم اللہ کے پیر و مرشد مشہور بزرگ حضرت شیخ یحییٰ مدنی تھے جو چشتیہ نظامیہ سلسلے کی ترقی و اشاعت کے لیے رات دن کوشاں تھے لیکن دہلی کے حالات کی وجہ سے بات نہیں بن رہی تھی۔ ایک دن انہوں نے بڑا لمبا مراقبہ کیا اور حضرت کلیم اللہ سے فرمایا کہ تمہارے پاس ایک نوعمر شخص آئے گا اور یہ شعر پڑھے گا کہ "سپردم بتو مایۂ خویش را" یعنی مرید ہونے سے پہلے ہی وہ اپنے نفس اور اپنی ذات کو تمہارے حوالے کر دے گا اور تم کو اپنی کوتاہیوں اور خوبیوں یعنی کمی زیادتی کا رازدار بنائے گا اور چشتیہ سلسلے کو اس سے بڑی تقویت اور ترقی ملے گی۔

حضرت یحییٰ مدنی کی پیش گوئی پوری ہو چکی تھی۔ اب آپ نے نظام الدین کا ہاتھ

پکڑا اور روحانی تربیت دے کر ان کے روشن قلب کو اور زیادہ جلا دینے لگے۔

جب روحانی تربیت پوری طرح مکمل ہو گئی تو آپ نے حضرت نظام الدین سے فرمایا کہ اب تم تبلیغ کرو اور اپنے سلسلے کی اشاعت کے لیے دکن جاؤ۔ ان کے لیے پیر و مرشد کا پیام حرف آخر تھا۔ فوراً شاہی لشکر میں بھرتی ہو کر دکن کی طرف چل دیئے۔

شیخ کلیم اللہ بھی اپنے مرید کی ایک ایک بات سے واقف تھے۔ وہ لشکر میں حضرت نظام الدین کی ہر دلعزیزی، خوش مزاجی سے اتنے خوش تھے کہ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ میں خوش ہوں کہ میرا نوعمر مرید اپنے ہمعصروں میں مقبول ہے۔ لوگ اس کی وضع قطع اور عادات اطوار کو نہ صرف پسند کرتے ہیں بلکہ ان کی تقلید بھی کرتے ہیں۔

اس کے بعد دوسرے خط میں حضرت کلیم اللہ صاحب نے لکھا کہ

"اللہ تعالیٰ نے تم کو دکن کی ولایت عطا کی ہے۔ تم یہ کام پورے طور پر انجام دو میں نے پہلے تم کو لشکر میں رہنے کو کہا تھا اب یہ حکم ہے کہ جہاں کہیں ہو اعلائے کلمۃ اللہ میں مصروف رہو اور اپنے جان و مال کو اسی میں صرف کر دو۔"

آپ پہلے برہان پور گئے جہاں چشتیہ سلسلے سے بیسیوں عقیدت مند موجود تھے اس کے بعد دنوں شولاپور اور بیجا پور میں رکے اور آخر کار اورنگ آباد میں سکونت اختیار کی۔ اورنگ آباد کی سرزمین آپ اور آپ کے سلسلے کے لیے نئی نہ تھی یہاں حضرت زرزری زربخش تند آندھیوں میں اپنا چراغ جلا چکے تھے۔ جہاں حضرت برہان الدین غریب نے تصوف کی نئی روح پھونکی تھی جہاں حضرت زین الدین شیرازی نے علم و عمل کے خزانے لٹائے تھے۔ یہاں حضرت امیر حسن علائے سنجر حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کے ملفوظات فوائد الفواد لکھ کر سکون کی نیند سو رہے تھے۔ اس لیے آپ نے اس بستی کو احیائے دین اور سلسلہ چشتیہ کے نشاۃ ثانیہ کے لیے منتخب فرمایا اور وہاں آپ نے رشد و ہدایت، درس تدریس کا ایسا نادر نمونہ پیش کیا اور اس قدر خلوص دل اور دیانت داری کے ساتھ خانقاہی نظام کا احیا کیا کہ سارا دکن ان کا گرویدہ ہو گیا۔

• پھونک دی گرمیٔ گفتار سے محفل کس نے"

ہزاروں لوگ آپ کی شمع معرفت کے گرد پروانہ وار فدا ہونے لگے۔ آپ کے اخلاق اور خلوص کا چرچا سن کر نہ جانے لوگ کہاں کہاں سے کھنچ کر اورنگ آباد پہنچنے لگے یعنی دکن میں آپ کے مریدوں کی تعداد ایک لاکھ تھی (حوالے کے لیے دیکھئے تاریخ مشائخ چشت صفحہ ۳۲۸) ظاہر ہے کہ آپ نے انکی ذہنی تربیت اور تعلیم میں کتنی دماغ سوزی کی ہو گی۔ آپ کو اپنے سلسلے کے سب سے بڑے بزرگ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی دہلی کا یہ قول یاد تھا کہ۔

تکثیر مرید کے بجائے تکمیل مریدین کوشاں رہو

لیکن اللہ تعالے بڑا مہربان اور عظیم ہے۔ حضرت نظام الدین اورنگ آبادی کے ہاتھوں تکثیر مرید اور تکمیل مرید دونوں یکساں طور پر انجام پاتے رہے۔ ان کی ساری زندگی خلوص، دیانت داری، نیکی اور پارسائی کی سچی تصویر تھی۔ ان کو اس بلند مرتبے پر پہنچانے والی صفت ان کی اپنی زندگی میں ضبط و نظم اور "لگن" تھی۔ ان کی باتوں میں شیرینی اور حلاوت، گفتگو میں شفقت اور بردباری تھی۔ ان کی علمی قابلیت میں کوئی شبہ نہ تھا۔

باتوں میں ادبیت کے ساتھ ساتھ شعریت بذلہ سنجی اور مزاح لطیف شامل ہوتا کہ جو لوگ آپ کی صحبت میں بیٹھتے اٹھتے کا نام نہ لیتے ہر اجنبی پہلی ملاقات میں گرویدہ ہو جاتا۔ آپکی خانقاہ واقع شاہ بازار اورنگ آباد کے متعلق حضرت شاہ محمد تونسوی نے اپنے ملفوظات میں لکھا ہے کہ اس کے دس دروازے تھے اور ہر دروازے پر ایک کاتب یا عرضی نویس مقرر تھا (درگاہ کا موجودہ احاطہ اور اس میں خدام کے بنے ہوئے مکانات اب تک ان دس دروازوں کا ثبوت دے رہے ہیں) ہر ایک عرضی نویس حاجت مندوں کی درد بھری داستان نہ صرف سنتا بلکہ اس کو قلمبند کر کے اس پر اپنی مہر لگا دیتا۔ حاجت مند اس عرض کو جس امیر یا رئیس کے پاس لے جاتا وہ مقبول الٰہی حضرت نظام الدین کی مہر دیکھ کر اس کی حاجت روائی کو اپنے

لئے باعث فخر کہتے۔

آپ کا دل آپ کی خانقاہ اور آپ کی نظر کی طرح وسیع تھا۔ اسی لئے ہندو مسلمان سب آپ سے یکساں طور پر فیض پاتے۔ عالم اور پڑھے لکھے لوگ جب آپکی صحبت میں آتے تو آپ بات بات میں فارسی شعر یوں چسپاں کرتے کہ سننے والا عش عش کرنے لگتا اور جب جاہلوں یا کم علموں سے بات ہوتی تو آپ کا انداز گفتگو سادہ اور عام فہم ہوتا۔ یہی آپ کی ہر دلعزیزی اور محبوب خلائق ہونے کا راز تھا۔ آپ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ آپ ہر بڑے اور چھوٹے کا ادب کرتے۔ بڑوں کا ادب اس لیے کہ ان کو بزرگ خیال فرماتے اور چھوٹوں کا ادب اس لیے کہ وہ آپ سے ادب سیکھیں۔ انھیں طور طریق کی وجہ سے آپ اپنے پیر و مرشد حضرت شاہ کلیم الدین کی آنکھوں کا نور تھے۔ اورنگ آباد سے دہلی آنے والے عقیدت مندوں سے جب آپ اپنے ہونہار خلیفہ کی مقبولیت کا حال سنتے تو پھولے نہ سماتے۔ فرمانبرداری کا یہ عالم تھا کہ اپنے شیخ کی اجازت کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھاتے چنانچہ پیر و مرشد نے ایک خط میں آپ کو مخاطب کر کے لکھا ہے کہ۔

نظام الدین تم پر اللہ کی رحمت ہو کہ تم میری اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتے جس کو بھی عرفان کی دولت اور سلوک کی منزل ملی ہے وہ اس نعمت کی وجہ سے ملی ہے جس کو ادب اور فرمانبرداری کہتے ہیں۔

چنانچہ اس فرمانبرداری کی حد یہ ہے کہ آپ نے جب اپنی شادی کی اجازت چاہی تو پیر و مرشد نے آپ کو لکھا کہ "جب تک ہو سکے شادی سے گریز کرو تاکہ یاد الٰہی اور ذکر کے معمولات میں خلل نہ پڑے۔ دوسری مرتبہ کے استفسار پر حضرت شاہ کلیم اللہ نے فرمایا کہ "اگر ضرورت نہ ہو تو ہرگز شادی نہ کرو۔"

چنانچہ آپ عرصے تک اسی حکم پر کاربند رہے لیکن جب آپکی صحت جواب دینے لگی تو اطبا نے آپ کو شادی کا مشورہ دیا۔ آپ نے پھر اپنے مرشد سے رجوع کیا اور اب کی بار نہ صرف یہ کہ آپ کو اجازت ملی بلکہ خود حضرت کلیم اللہ شاہ صاحب نے نیک

اور شریف گھرانوں کی صالح اور نیک سیرت لڑکیوں کی نشاندہی بھی کی۔ اس کے بعد حضرت نظام الدین کی شادی کہاں ہوئی حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ اکثر تذکرہ نویس اس بات پر متفق ہیں کہ آپ کی بیوی حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے خاندان کی صاحبزادی تھیں لیکن کتابوں میں لکھا ہے کہ آپ نے دو شادیاں کیں اور آپ کی اولادیں ہوئیں۔

پہلی بیوی سے ایک لڑکی اور دو لڑکے۔ لڑکوں کے نام محمد اسمٰعیل اور فخر الدین دوسری بیوی سے تین لڑکے پیدا ہوئے جن کا نام غلام معین الدین، غلام بہاء الدین اور غلام کلیم اللہ رکھا۔ ان میں سے صرف محمد اسمٰعیل نے خواجہ کامگار سے بیعت کی اور باقی تینوں چھوٹے بھائیوں نے اپنے بڑے بھائی اور باپ کے خلیفہ حضرت فخر الدین سے بیعت کی۔

آپ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ آپ اپنے اوقات کار کو انتہائی منضبط کر رکھا تھا۔ ہر کام کا ایک وقت مقرر تھا۔ دن بھر کے معمولات میں عبادات، مطالعہ کتب، ذکر الٰہی، عوام کی فریاد رسی، باجماعت نمازوں کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ اپنے اہل خاندان پر شفقت اور بچوں کی تربیت کا بھی مخصوص وقت تھا۔

آپ کا دربار ہر کس و ناکس کے لیے کھلا ہوا تھا کوئی سائل خالی ہاتھ لوٹ کر نہ جاتا۔ دستر خوان وسیع تھا۔ ہر ایک کی خاطر ضرور ہوتی۔ گفتگو اور مسائل میں بحث و تکرار اور الجھنے سے پرہیز کرتے اگر کوئی متنازعہ مسئلہ آ جاتا تو دوسرے آدمی کو نرمی کے ساتھ کسی مخصوص کتاب کا حوالہ دے کر اس کو مطالعہ کرنے کے لیے بھیج دیتے۔

آپ کی پاک و صاف طبیعت کے ساتھ ساتھ آپ تعلیم اور تدریس میں منافقت سے پاک تھی۔ آپ کے جتنے مرید تھے سب آپکی عقیدت کے ساتھ ساتھ نظم و ضبط اور آداب درویشی و فقیری کی ڈور میں بندھے ہوئے تھے۔ آپ اس بات کی کڑی نگرانی کیا کرتے کہ کہیں کوئی مرید خرقہ درویشی میں دنیا داری کا مرتکب تو نہیں ہو رہا ہے؟ یا کسی نے دنیا کی خاطر دین کی دوکان تو نہیں کھولی ہے۔

ظاہر ہے کہ جو شخص خود کامل ہو وہی دوسروں کی تکمیل کر سکتا ہے اکثر و بیشتر اپنے مریدوں اور شاگردوں سے فرماتے کہ انسان کی تخلیق کا مقصد عبادت اور ذات خداوندی کا عرفان ہے جو اپنے اللہ کو نہیں پہچانتا کسی نہیں پہچان سکتا۔ چنانچہ اپنے مریدوں کو بھی ذکر اور عبادت کا پابند بنانے میں دن رات کوشش کیا کرتے۔

آپ کی خانقاہ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ آدھی رات کو اٹھ کر اپنے مریدوں اور شاگردوں کی دیکھ بھال کے لیے گشت کیا کرتے جو غافل سو رہا ہوتا اس کو جگا کر بٹھا دیتے گویا عبادت اور نماز کی تلقین صرف زبانی نہ تھی بلکہ ہر شخص کو اس پر عمل کرنا پڑتا تھا۔

آپ کی تعلیمات میں پاس انفاس (سانس کی آمد و رفت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالٰی کے نام کا ورد جیسے حق اللہ یا لا الہ الا اللہ) اور ذکر بالجہر (یعنی بلند آواز سے اللہ تعالٰی کے نام کا ذکر جس کی ضرب قلب انسانی پر پڑتی ہے اور نور ایمانی بڑھتا جاتا ہے) دونوں کو بڑی اہمیت تھی کہ کیونکہ یہی عبادت باطنی اور پاکیزگی نفس کے لیے ضروری ہے۔

چنانچہ آپ نے خود اپنے پیر و مرشد کے حکم پر دہلی میں جمنا کے کنارے اس شان سے ذکر بالجہر کی مشق کی تھی کہ لوگ اس کی مثال دیتے ہیں۔ اس خانقاہ میں بھی آپ حلقہ باندھ کر سو سو یا تین تین سو مریدوں کے ساتھ ذکر میں مشغول دیکھے گیے ہیں تاکہ آپ کے سارے مرید ہم آہنگ ہم رشتہ اور ہم زبان رہیں۔

ایک مرتبہ آپ کو کسی عقیدت مند نے ایک تسبیح پیش کی اور کہا کہ اس تسبیح میں کچھ دانے اس تسبیح کے بھی شامل ہیں جو حضرت بابا فرید گنج شکر کی تھی۔ آپ نے فرمایا۔ یہ دانے میرے سر آنکھوں پر مگر میں تسبیح ہاتھ میں لینا اور اللہ تعالٰی کا نام گن گن کر لینا بدعت سمجھتا ہوں جس کا دل رات دن تسبیح میں مصروف ہو اس کو اس ظاہری شمار والوں سے کیا کام؟ یہ ایک اتنی بڑی حقیقت ہے کہ جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

جو شخص آپ کے پاس آتا اس کو اس کی حیثیت اور توفیق کے مطابق تعلیم دیتے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے عورتوں اور لڑکیوں کو ذکر سے منع کر دیا تھا کہ اگر اس کی ضرب دل پر پڑے تو جان کا خطرہ ہے۔ آپ کی ساری زندگی اور کھانے پینے رہنے سہنے کی طرح سے آپ کا لباس بھی سادہ تھا۔ زرد زعفرانی اور جوگیا (نارنجی) رنگ بہت پسند تھا یہی زرد رنگ حضرت نظام الدین محبوب الہٰی کا پسندیدہ تھا۔ اور اسی رنگ میں حضرت نظام الدین مقبول الہٰی نے خود کو رنگ لیا چنانچہ اب تک آپ کے روضہ کا رنگ زرد ہے۔

ایک مرتبہ آپکے ملازم خواجہ کامگار خان ایک بیش قیمت لبادہ اور کچھ شالیں لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ سردیوں میں آپ زیب تن فرمائیں۔ آپ نے یہ کہہ کر اس لباس کو لوٹا دیا کہ ہمیں ایسے لباس سے کوئی رغبت نہیں ہے۔ جو ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند نہ تھا۔ البتہ جمعہ کی نماز کا آپ بہت اہتمام کرتے اور سر پر دستار یا کلاہ پر دستارچہ باندھ کر نکلتے۔

آپ کی خانقاہ طالب علموں اور مریدوں سے بھری ہوئی تھی جن کی اخلاقی اور روحانی تربیت کو آپ اپنی زندگی کا مقصد سمجھتے تھے۔ چاہے سفر ہو یا حضر اس فریضہ سے آپ کبھی غافل نہیں رہے چنانچہ جب آپ دہلی سے تشریف لائے تو شولاپور میں کچھ دنوں قیام کیا۔ اتفاق سے آپ کا پڑاؤ جہاں تھا۔ اس کے قرب "جوگیوں" جوگیوں کا ایک "جتھا" بھی ٹھہرا ہوا تھا۔ ان میں سے کئی ایک جٹا دھاری تھے اور کئی جبس دم بھی جانتے تھے۔ اسی ٹولے میں ایک حسین و جمیل جوگن بھی تھی جس کا نام "زنگا" تھا اور اس کی خوبصورتی کے چرچے عام تھے۔

حضرت نظام الدین مقبول الہٰی کا ایک خادم خاص سعید بیگ تھا جو پہلی نظر میں اس پر فریفتہ ہو گیا۔ دل کی بیقراری زیادہ بڑھی تو وہیں پڑاؤ کے پاس دھونی رما کر بیٹھ گیا۔ چند دن بعد حضرت کی خدمت میں آیا تو آپ نے غیر حاضری کی وجہ پوچھی تو خاموش رہا لیکن آپ کو بذریعہ کشف معلوم ہو گیا کہ عشق حقیقی کی منزلوں پر پہنچنے والا سعید بیگ

عشق مجازی میں الجھ گیا ہے۔ چنانچہ لوگوں نے مشورہ دیا کہ تم اپنے پیر و مرشد کو یہاں لے آؤ شاید تمہاری مراد بر آنے کی کوئی سبیل نکل آئے لیکن سعید بیگ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔ اس کو کچھ کہنے کی ہمت ہی نہ پڑی۔

چند دنوں بعد اتفاق سے خود حضرت نظام الدین کا گذر ادھر ہوا اس وقت آپ کے ہاتھ میں گلاب کے پھولوں کا گجرا تھا۔ آپ نے ان میں کا ایک ایک پھول جوگیوں میں تقسیم کر دیا۔ اور جس کے دماغ تک اس کی خوشبو پہنچی اس کی مہک نے چودہ طبق روشن کر دیا۔ کفر کی تاریکی دور ہوئی اور وہ مسلمان ہو گیے۔ لیکن "رنگا" جوگن بڑی چالاک تھی۔ اس نے پھول ہاتھ میں نہ لیا اور مسکراتی ہوئی آگے نکل گئی۔

یہ واقعہ سعید بیگ کے لیے بڑا دل شکن تھا کیونکہ اس کے بعد ہی جوگیوں کا یہ قافلہ آگے کوچ کر گیا اور سعید بیگ افسردہ پژمردہ واپس آیا۔ حضرت نظام الدین کو معلوم تھا کہ یہ آگ بجھنے والی نہیں ہے۔ اگر سعید بیگ کو روکا گیا تو وہ ہو سکتا ہے کہ کسی غلط راستے پر چل پڑے۔ اس سے بہتر یہی ہے کہ اس کو صحیح راہ پر کیوں نہ گامزن کر دیا جائے۔ چنانچہ آپ نے سعید بیگ سے کہا کہ تم جوگیوں سے اگلے پڑاؤ تک چلے جاؤ۔ خدا مقلب القلوب اور مسبب الاسباب ہے۔ تمہارے لیے کوئی صورت پیدا ہوگی۔ وہ شوق کا مارا دوسرے دن اگلے پڑاؤ تک گیا اور یہ دیکھ حیران رہ گیا کہ "رنگا" جوگن مشرف بہ اسلام ہو کر اس کے ساتھ ساتھ چلی آئی اور آپ نے ان دونوں کو ازداج کے رشتے میں بہ طریق شریعت منسلک کر دیا۔

ظاہر ہے کہ یہ واقعہ جوگیوں کے لیے سخت اشتعال انگیز تھا۔ سب کے سب حملہ آور ہوئے حضرت نظام الدین نے اپنے گرد حصار باندھا اور اس کے اندر بیٹھ گئے اور اپنے تمام خادموں اور ساتھیوں کو تاکید کر دی کہ کوئی بھی ان کے مقابلے کے لیے نہ نکلے اور دور سے خدا کی قدرت کا تماشا دیکھے۔ چنانچہ ایک روایت کے مطابق جب یہ پتھر اٹھا کر آپکی طرف پھینکتے تو وہ پھول بن جاتا اور دوسری روایت کے مطابق جب حملہ آور جوگی قریب آتا تو بے ہوش ہو جاتا۔ بہر حال اللہ نے اپنے مقبول

بندے کی لاج رکھ لی اور رنگا جوگن کے ساتھ ساتھ اس کا پورا ٹولا مسلمان ہو گیا۔

اسی طرح اورنگ آباد میں قیام کے دوران آپ کی محفل سماع میں ایک شخص آیا۔ اور خاموش بیٹھ گیا جب محفل ختم ہوئی تو اعتراض کرنے لگا کہ سماع کے الفاظ شامل تھے۔ آپ نے نرمی سے سمجھایا لیکن وہ نہ مانا۔ آپ نے اس سے سوال کیا: "یہ تو بتاؤ کہ تمہارا نام کیا ہے"، اس نے اپنا نام عبدالغنی بتایا اور وہاں سے چل دیا۔

دوسرے دن پھر وہی مولانا تشریف لائے وہی بات کہی۔ آپ نے پھر نام پوچھا اب کی بار انھوں نے از راہ تمسخر اپنا نام عبداللہ بتایا۔

آپ نے ان کے چہرے کو غور سے دیکھا اور بڑے نرم لہجے میں کہا۔ "فقیروں اور درویشوں سے مذاق اچھا نہیں ہوتا۔ آپ کا اصلی نام یہ ہے اور پتہ یہ ہے۔ آپ فلاں محلے کے   میں رہتے ہیں"۔ اب تو ان کے ہوش اڑ گئے۔ فوراً ہاتھ جوڑ کر قدموں پر سر رکھا اور آپ کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ (یہ دونوں مذکورہ بالا روائتیں دکن کی پرانی کتابوں میں درج ہیں۔ اور ہر سال عرس کے مبارک موقع پر اخبارات اور خاص نمبروں میں ان کا اعادہ ہوتا ہے)

آپ اپنے مریدوں میں دل شکنی اور دل آزاری کو سب سے بڑا گناہ سمجھتے تھے۔ دلجوئی کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ ایک عام مرید آپ کے پاس آیا اور کہا مجھ پر توجہ دیجیے۔ اور رو برو بیٹھ کر کچھ سکھا دیجئے۔ چنانچہ آپ نے اس کی بات مان لی اور روزانہ اس کو سامنے بٹھا کر اس پر توجہ فرمانے لگے۔ جب کئی دن گذر گیے تو اس شخص نے باہر جا کر یہ کہنا شروع کیا کہ میں توجہ کا عمل آجکل نظام الدین کو سکھا رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ موجودہ زمانے میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو چند لفظ سیکھ لینے کے بعد خود کو استاد سمجھنے لگیں بلکہ اپنے استادوں کو بھی اپنا شاگرد بتانے لگیں۔

بات ایسی نہ تھی جو کسی کو معلوم نہ ہوتی۔ شدہ شدہ خانقاہ تک پہونچی۔ مریدوں کو معلوم ہوئی۔ چنانچہ ایک دن جب وہ آپ سے ملنے کے لیے اندر آرہا تھا تو آپکے

ایک مرید عبدالقادر نے اس کو ڈانٹا اور کہا کہ تو باہر جا کر کیا بکواس کرتا پھرتا ہے اپنے کو دیکھ اور حضرت مقبول الٰہی کی ذات کو۔

جب حضرت نظام الدین کو یہ معلوم ہوا کہ اس بیچارے مرید کو ڈانٹا گیا ہے تو آپ نے فوراً عبدالقادر کو بلا کر کہا تم نے اس کی ناحق دل شکنی کی ہے کیونکہ میرے نزدیک اس سے بڑا گناہ کوئی نہیں ہے۔ میں نے تو یہ سب باتیں سن کر بھی کچھ نہ کہا تم کیوں الجھ پڑے؟

گویا آپ کی ساری زندگی "دل برآوردن کہ حج اکبر است" کی صحیح تصویر تھی آپکی شرافت، آپ کا ظرف اور آپ کی نیک نیتی میں وہ اوصاف تھے جن کی بنا پر آپ نہ صرف مقبول الٰہی بلکہ مقبول خلائق بھی بن گئے تھے۔

یہ تو تھی آپکی نجی زندگی مریدوں کے ساتھ حسن سلوک اور اخلاق کریمانہ کا عالم اب دیکھنا یہ ہے کہ صاحب اقتدار لوگوں کے ساتھ آپ کی کیا روش تھی۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ آپ کا دور وہ تھا جب مغلیہ سلطنت پر سکرات طاری تھی اور قمر الدین آصف جاہ اول اپنے صوبے یعنی دکن کی خود مختاری کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے والد غازی الدین حیدر بھی زندہ تھے اور مغلوں کے شاہی لشکر میں تھے۔

غازی الدین حیدر کا آنا جانا حضرت بابا پلنگ پوش کے یہاں تھا (جن کا ذکر آگے آئے گا) لیکن حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کی کبریائی شخصیت ایسی تھی کہ دونوں باپ بیٹے آپ سے ملنے کے آرزومند تھے چنانچہ کئی مرتبہ آپ کو انھوں نے بلایا لیکن آپ نے انکار کر دیا۔ اور جب یہ بات آپ کے پیرومرشد حضرت کلیم اللہ صاحب کو معلوم ہوئی تو آپکی استقامت اور استغنا سے بہت خوش ہوئے اور خط میں لکھا کہ:

تم نے اچھا کیا جو سلاطین اور امراء کی دعوت قبول نہیں کی کیونکہ یہ لوگ رعونت اور جباری کی تصویر ہیں۔ اگر ان کی طبیعت میں خاکساری اور افتادگی ہوتی تو وہ خود تمہارے پاس آتے۔ اس کے بعد غازی الدین نے مختلف لوگوں کو آپ کی خدمت میں بھیجا اور یہاں تک چاہا کہ آپ کے پیرومرشد حضرت شاہ کلیم اللہ کوئی سفارشی خط یا تعارفی

رقعہ دیدیں تو اس توسط سے غازی الدین حیدر اور ان کے بیٹے آپ سے ملاقات کرلیں۔

حضرت شاہ کلیم اللہؒ نے اس پیشکش کو بھی مسترد کر دیا اور اپنے محبوب اور مقبول خلیفہ حضرت نظام الدین کو لکھا کہ "تمہیں معلوم ہے کہ ہمیشہ فقراء اور درویشوں کی خدمت میں شاہانِ وقت حاضر ہوتے ہیں اور ان کی ملاقات کو اپنے لیے باعثِ سعادت خیال کیا ہے۔ غازی الدین تو بادشاہ کے ملازموں میں سے ہے اگر وہ مجھے لکھے گا بھی تو میں اجازت نامہ نہیں دوں گا۔

یہ تھی شاہانِ بے تاج کی بے نیازی۔ جس پر حضرت شاہ کلیم اللہ جیسے پیر و مرشد اور حضرت نظام الدین جیسے مرید سختی سے کاربند تھے۔

غازی الدین حیدر کے متعلق تو تاریخ خاموش ہے البتہ نظام الملک آصف جاہ اول خود بہت قابل اور پڑھے لکھے آدمی تھے ان کو حضرت نظام الدین کی یہ بے نیازی اور خلق خدا کی بے لوث اور بے غرض خدمت کی ادا اتنی پسند آئی کہ ایک دن فقیروں کا بھیس بنا کر تماشائے اہل کرم دیکھنے کے لیے ایک دن انکی خانقاہ پہونچ گئے۔ خادم کامگار خان نے عرض کیا کہ آصف آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ آپ کو بذریعہ کشف معلوم ہو چکا تھا کہ ایک عقیدت مند بندہ دروازے پر کھڑا ہے۔ اس وقت اسکو اپنے تعارف کے لیے نہ "نظام الملک" کے لقب کی ضرورت ہے اور نہ "آصف جاہ" کے خطاب کی۔

چونکہ وہ اس وقت اپنی تمکنت اور وقار کو خیر باد کہہ کر ایک عام آدمی کی طرح سراپا عجز اور مجسم انکسار بنے ہوئے آئے تھے۔ اس لیے حضرت نظام الدین نے ان کو فوراً اندر بلا لیا۔ دونوں جوہر شناس تھے۔ نگاہوں سے نگاہیں ملیں۔ دل کے جذبات زبان پر آنے سے پہلے ایک دوسرے کے ذہن میں اتر گئے۔ آصف جاہ نے مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ اس انداز میں بڑھایا کہ "بیعت" ہی کر لی اور اس کے بعد ان دونوں میں مثالی دوستی ہو گئی۔ نظام الملک آصف جاہ اول بار بار آپکی بارگاہ میں قدمبوس ہونے لگے لیکن

آپ نے کبھی ان کے مکان پر قدم نہ رکھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ اس عقیدت اور مودت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکی ہوں۔ اس وقت مغلیہ سلطنت دم توڑ چکی تھی۔ دہلی نادر شاہ کے حملے سے پامال ہو چکی تھی اور نظام الملک آصف جاہ اول دکن میں ایک آزاد ریاست کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اورنگ آباد کے تو خیر وہ صوبہ دار ہی تھے۔ برار اور گلبرگہ کا علاقہ بھی انھی کے حدود میں تھا۔ لے دے کے حیدر آباد دکن کے مبارز خان سے خطرہ تھا اور اس سے مقابلہ سخت تھا چنانچہ جب آپ اس مقابلے کے لیے نکلے تو سب سے پہلے حضرت نظام الدین مقبول الٰہی کے آستانے پر حاضری دی اور قدم بوس ہو کر فرمایا کہ میرے لیے فتح کی دعا کریں۔

آپ نے جواب دیا کہ کامرانی تمہارے قدم چومے گی اور دکن کی تاجداری تمہارے ہی مقدر میں ہے۔ جاؤ اللہ کا نام لے کر مبارز خان سے مقابلہ کرو۔

حضرت نظام الدین مقبول الٰہی نے یہ بات اتنے حتمی طور پر وثوق کے ساتھ کہی کہ نظام الملک ان کے نورانی چہرے کو دیکھتے ہی رہ گئے اور بڑے ادب سے گہری سوچ کے بعد آہستہ سے کہا۔

آپ کی بات سر آنکھوں پر مگر اس فتح کی کوئی نشانی تو بتا دیں میرے لیے یہ مقابلہ سخت ہے۔ حضرت نظام الدین نے مراقبہ کیا اور پھر کہا۔

جس دن تم کو فتح نصیب ہوگی اس دن تمہارے اور تمہارے سپاہیوں کے خیموں کے پردوں پر صندل کے چھاپے لگے ہوئے ملیں گے۔

بات مقبول الٰہی کے منہ سے نکلی ہوئی تھی یقینی طور پر قبول ہوئی اور ایک دن صبح کو نظام الملک نے دیکھا کہ واقعی ان کے اور ان کے ساتھیوں کے خیموں کے پردوں پر صندل کے چھاپے لگے ہوئے ہیں۔ اس روز مبارز خان میدان جنگ میں شہید ہوا اور آصف جاہ کو فتح کامل حاصل ہوئی۔

(دکن میں اب تک "صندل کے چھاپے لگنا" بطور محاورہ بولا جاتا ہے۔ اس

سے مراد سرخروئی اور ظفرمندی ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ عورتیں اس کو طنز میں بولتی ہیں)

اس فتح کے بعد دکن کی قلمرو نظام الملک آصف جاہ اول کے ہاتھ میں تھی۔ ان کو احساس تھا کہ یہ تخت و تاج یہ سلطنت مقبول الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء کی نگاہِ کرم کا نتیجہ ہے۔ سلطنت آصفیہ کے پہلے تاجدار کے بارے میں مولانا غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں۔

"جب سلاطینِ اسلام کے "ہلال روشن" کا جھنڈا سوادِ ہندوستان پر چمکا، کوئی امیر اس شان و شوکت و رعب جلال کا مسندِ امارت پر نہیں بیٹھا اور اس صاحب نصب کا اخترِ اقبال ابتدائے عمر سے آخر تک ترقی کے درجات پر عروج پاتا رہا۔"

(روضۃ الاولیاء ص ۱۵)

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ انکی سلطنت یعنی نظام اسٹیٹ کے حدود اربعہ موجودہ پاکستان سے کہیں زیادہ بڑے تھے۔

نظام الملک آصف جاہ اول کی نظام الدین اولیاء سے عقیدت رنگ لائی "نظام" کا لفظ ان کے نام میں پہلے ہی شامل تھا۔ اب یہ مئے دو آتشہ ہوگئی۔ نظام الملک اپنے پیر و مرشد نظام کے رنگ میں ایسے رنگے کہ اپنی ساری سلطنت کو انھیں کے رنگ میں رنگ ڈالا۔ زرد اور زعفرانی رنگ سرکاری رنگ قرار پایا جس پر سبز دھاریاں یا حاشیے ہوں۔ جھنڈے کا رنگ بھی یہی تھا۔ خیر یہ تو سب ظاہری باتیں ہیں لیکن اگر نظام الملک آصف جاہ اول سے لے کر ساتویں نظام میر عثمان علی خان تک نظام سلطنت، طرز تعلیم، رہن سہن معاشرت، مذہب سے لگاؤ اور نظم و ضبط ہر چیز پر نظام الدین مقبول الٰہی کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ ان کی وفات کے بعد وہاں کی تمام مسجدیں چھوٹی چھوٹی خانقاہیں بن گئی تھیں۔ جہاں غریب طالب علموں کی رہائش اور کھانے کا بھی بندوبست تھا۔ متمول اور سربرآوردہ لوگ مسجدوں میں جو افطاری، کھانا یا روشنی کا انتظام کرتے وہ انھیں کے لیے مخصوص ہوتا دوسرا کوئی ان کا

شریک نہ ہوتا

اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ وہاں کے تمام چھوٹے چھوٹے مدرسے ، مڈل اسکول ہائی اسکول بلکہ پوری جامعہ عثمانیہ میں ان کی تعلیم اور تنظیم کی جھلک تھی۔

اگر میری زندگی نے وفا کی تو میں انشاء اللہ وہاں کے مربوط ، مضبوط بے ریا مقبول نظام تعلیم کے بارے میں ایک علیحدہ کتاب لکھوں گی۔

نظام الملک آصف جاہ اول اپنی تخت نشینی اور تاج پوشی کے بعد بھی حضرت نظام الدین اورنگ آبادی کی خدمت میں بلا تکلف آتے جاتے رہتے تھے۔ چنانچہ ایک دن جب وہ حضرت کی خدمت میں پہونچے تو کسی مرید یا عقیدت مند نے ان کی خدمت میں آٹے کی ٹکیاں پیش کیں۔ حضرت نظام الدین نے وہ روٹیاں یا ٹکیاں نظام الملک آصف جاہ اول کے سامنے رکھدیں تاکہ مہمان کی خاطر کرسکیں۔ نظام الملک ان کی بات نہ ٹال سکے اور ان کے حکم کے مطابق شکم سیر ہونے تک کھاتے رہے جب چھ ٹکیاں یا روٹیاں پوری ہوچکیں تو انھوں نے ہاتھ روک لیا۔

حضرت نظام الدین نے ان کو بغور دیکھا اور کہا۔ اور کھالو۔

انھوں نے حکم کی تعمیل میں ساتویں ٹکیا یا روٹی اٹھائی اور آدھی سے زیادہ کھاکر ہاتھ روک لیے۔ اور معذرت چاہی۔ حضرت نظام الدین مقبول الٰہی نے ان کو بغور دیکھا اور فرمایا۔

بس اتنی ہی گنجائش تھی۔ تمہاری سلطنت ساتویں پشت میں ختم ہو جائے گی۔

ان کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے یہ الفاظ تیر کی لکیر تھے یا نوشتہ تقدیر کہ واقعی آصف جاہ اول کی حکومت ساتویں پشت میں میر عثمان علی خان آصف سابع یا نظام سابع کے دور میں ستمبر ۱۹۴۸ء میں ختم ہوگئی۔

حضرت نظام الدین مقبول الٰہی کا یہ واقعہ اکثر پرانی تاریخوں میں درج ہے اور دکن کے پرانے لوگ اس کو جانتے ہیں مگر آصف سابع کے دور میں اس بات کو بالکل دبا دیا گیا تھا لیکن ہونی ہو کر رہی اور اب پھر لوگ اس بات کو یاد کرنے لگے ہیں۔

حضرت نظام الدین مقبول الٰہی اورنگ آبادی کے مفصل حالات سب سے پہلے خود نظام الملک آصف جاہ اول نے قلم بند کیے ہیں جس کا نام "رشک گلستان ارم" ہے جواب نایاب ہے۔

شاہ نظام الدین صاحب کے حالات اور ملفوظات پر دوسری کتاب خواجہ کامگار نے لکھی ہے جس کا نام احسن الشمائل ہے۔ ان دونوں گراں مایہ کتابوں کے علاوہ خود نظام مقبول الٰہی نے ایک کتاب خود لکھی تھی۔ جس کا نام "نظام القلوب" ہے۔ یہ کتاب ۱۳۰۹ھ م ۱۸۰۹ میں مطبع مجتبائی دہلی نے شائع کی تھی۔

کتاب کیا ہے گنج معرفت اور بحر علوم ہے جس میں ذکر کے تمام اقسام اور طریقوں کے ساتھ ساتھ ان کے فوائد طریقے سکھائے گئے ہیں۔ کشف معانی، قرآن اور کشف قبور سے لے کر ذکر ذات کلمہ اللہ اور حبس دم تک کے سارے مراحل عارف کو سکھائے گئے ہیں۔ اس کتاب کے ابواب کی تفصیلات جناب خلیق نظامی صاحب نے اپنی کتاب تاریخ مشائخ چشت میں ۴۵۳ پر دی ہیں۔ جن سے اس کتاب کی ہمہ گیر علمیت کے ساتھ ساتھ گہرائی اور گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت نظام الدین مقبول الٰہی کی اولادوں میں سب سے محبوب اور مشہور ہستی حضرت شاہ فخر الدین کی ہے جن کی عمر باپ کے وصال کے وقت صرف ۱۶ برس کی تھی۔ ان کو شفیق اور خدا رسیدہ والد نے طلب کیا اور اپنے سینے سے لگا کر اپنی معرفت اور روحانیت کے سارے خزانے انکو دے دیئے۔

حضرت شاہ فخر الدین بھی اپنے والد کی طرح ولی کامل تھے لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے اورنگ آباد میں زیادہ قیام نہیں کیا۔ ہر چند انکی ولادت اور پرورش یہیں اورنگ آباد ہی میں ہوئی لیکن بعد کو وہ دہلی چلے گئے۔ وہیں روحانی تربیت حاصل کی اور وہیں کی خاک میں سو گئے۔

شیخ نظام الدین اورنگ آبادی نے ۱۲ ذی قعدہ ۱۱۴۲ھ کو اورنگ آباد میں ہی وصال فرمایا۔ شاہ بازار میں اپنی خانقاہ کے ساتھ بنے ہوئے حجرے میں دفن ہوئے

جس پر گنبد بعد کو تعمیر ہوا۔ اور شکستہ مسجد کی عمارت بھی بعد کو دوبارہ بنی۔
غلام سرور نے آپ کی تاریخ وصال لکھی جو مندرجہ ذیل ہے۔

شد زِ دینا چو سوئے خلدِ بریں
راہبرِ رہنما نظام الدین
سال ترحیل اوست شیخ کبیر
ہم ولی ھذا نظام الدین

۱۱۴۲ھ مطابق ۱۷۲۹ء

غلام سرور صاحب آپ کے محبوب مریدوں میں سے تھے اور اپنے پیر و مرشد کے وصال کے صرف چھ ماہ بعد خود بھی خالق حقیقی سے جا ملے۔

حضرت پلنگ پوش صاحب اور حضرت بابا مسافر شاہ صاحب

اورنگ آباد کی اندرونی شہر پناہ یا فصیل سے باہر نکلنے کے لئے آتے اس دروازے پر چلیں جو بھڑکل کہلاتا ہے اور لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ اس دروازے کا اصلی نام "بہار کل" تھا جو کثرت استعمال سے بھڑکل ہوگیا ہے۔ یہاں سے ریلوے اسٹیشن کی طرف جاتے ہوئے ایک سہ راہا "ملتا ہے۔ مغربی سڑک چھاونی کو جاتی ہے۔ اور اسی سڑک پر ایک فرلانگ کے فاصلے پر "کھام ندی" کے کنارے یہ دونوں بزرگان دین یعنی حضرت پلنگ پوش صاحب اور حضرت مسافر شاہ صاحب (جو نقشبندیہ سلسلے کے چشم و چراغ ہیں) ایک انتہائی خوشنما اور روح افزا گلستان ہیں۔ آسودہ خواب ہیں جبکہ عرف عام میں پن چکی کہتے ہیں۔ کون اس بات پہ یقین کرے گا کہ اورنگ آباد کی یہ جنت ارضی اور گلستان فردوسی ان دونوں بزرگوں اور ان کے مزار خدا رسیدہ مُریدوں کا تکیہ" تھا جس کو آج یہ درجہ حاصل ہے کہ لوگ دور دراز سے اس کی عجیب و غریب عمارت اور اس کے روح پرور چمن و تاروں اور دلفریب آبشاروں کو دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔

سڑک پر کھام ندی کے پل کے ساتھ ساتھ ایک شاندار پھاٹک یا دروازہ ملتا ہے جس کو "محمود" دروازہ کہتے ہیں اس سے گذرنے کے بعد بائیں طرف پن چکی کی اسی عمارت سے جو ایک شاندار کمانی سے شروع ہوتی ہے۔ محمود دروازے کے اندر قدم رکھتے ہیں ساری تھکان دور ہو جاتی ہے آبشار کی خنکی، پانی کی ٹھنڈک اور سبزہ زاروں کی دلفریب ہوا خود بخود زبانی حالی سے کہتی ہے کہ

"کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا"

بائیں جانب یعنی سڑک کے جنوب میں اندر داخل ہوتے ہی داہنی طرف ایک بہت بڑا مستطیل حوض ملے گا حوض کیا ہے اچھا خاصہ تالاب ہے جو نو فٹ گہرا، پچاس فٹ لمبا اور چالیس فٹ چوڑا ہے۔ یہ حوض داخلے کے پھاٹک کے ساتھ بنی ہوئی ایک بلند اور مصنوعی آبشار سے سیراب ہوتا ہے جس سے برستی ہوئی موتی کی جھالر برسات کے

سبزے کے ساتھ مل کر عجب دلفریب منظر پیش کرتی ہے۔ آبشار کے دوسرے کنارے پر ایک چھوٹے سے کمرے میں وہ پن چکی ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ کسی زمانے میں ساری بستی کے گیہوں پیسنے کے لئے کافی تھی اور اس کو اسی آبشار کے پانی سے چلایا جاتا تھا اور اب بھی اگر ایک "والو" کے ذریعہ آبشار کو روک دیا جائے تو پن چکی کے پہیئے پر پانی کی دھار گرنے لگتی ہے اور چکی چلنے لگتی ہے۔ حوض کے ساتھ ساتھ پانی کی نکاسی کے لئے پوری لمبائی میں ایک اور حوض بنا ہوا ہے جس میں بڑے حوض سے پانی چادر کی شکل میں گرتا ہے اور اس سے چھن کر آنے والی ہوا اتنی ٹھنڈی ہوتی ہے کہ یہاں کے سبزہ زار سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ حوض کے دوسرے کنارے آبشار کے بالمقابل ایک بہت بڑا تناور اور قدیم برگد کا پیڑ ہے جس کے گھنے سائے میں کبھی فقرا اور مساکین آرام فرمایا کرتے تھے اس کے سامنے ایک کنواں تھا جس کو یہاں کے بزرگوں یعنی۔ حضرت پلنگ پوش صاحب اور حضرت بابا مسافر شاہ نے خود اپنے ہاتھوں سے کھودا تھا۔ اب یہ کنواں بھی حوض کے اندر آگیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے پانی کی تھاہ نہیں ملتی ہے۔ حوض کے مغرب میں پن چکی والے کمرے کی سیدھ میں ایک بارہ فٹ چوڑا راستہ ہے جس کی عقبی دیوار میں محراب سے بنے ہوئے ہیں اور ان محرابوں میں آئینہ بندی کے آثار اب تک پائے جاتے ہیں جو اس کے بنانے والوں کی خوش ذوقی کا بین ثبوت ہیں یہاں پر سیاح اور ناظرین رک رک کر قدم رکھتے ہیں اور ٹھہر ٹھہر کر چلتے ہیں کیونکہ ایک تو ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ بڑے حوض کا پانی جو نالی نما حوض میں چادر بناتا ہوا گر رہا ہے۔ کدھر سے کدھر جا رہا ہے؟ دوسرے جب لوگ اپنی بائیں طرف دیکھتے ہیں تو لوہے کی ریلنگ کے ساتھ۔ ساتھ نیچے کھام ندی کا پانی نظر آتا ہے جو پل سے گزر کر آ رہی ہے۔ آبشار بلندی پر ہے اور ندی نیچے ہے یہ تعمیر کا کمال ہے اور اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس بڑے حوض کے ساتھ ساتھ جس روش پر ہم ندی کے کنارے کنارے چل رہے ہیں یہ روش یا راستہ دراصل ایک گہری اور مضبوط سرنگ کے اوپر بنا ہوا ہے اور اسی سرنگ سے ہو کر حوض کا زائد پانی کھام ندی میں جاتا ہے۔

یہ طویل سرنگ جو کھام ندی کے کنارے ۱۲ یا پندرہ فٹ بلندی پر بنی ہے اور اوپر کے حصے کے لئے ایک تہہ خانے کا کام دیتی ہے دراصل ایک خانقاہ ہے جو صرف اس عمارت ہی پر ختم نہیں ہوتی بلکہ عمارت کے دوسرے حصے میں بھی اپنی تمام تر مضبوطی کے ساتھ اندر ہی اندر چلی گئی ہے اس کے اندر نہایت پائیدار اور مضبوط ستون ہیں اور محراب یا در ندی کے رخ کھلتے ہیں۔

یہ پن چکی کی عمارت کا پہلا حصہ ہے دوسرے حصے میں جانے کے لئے برگد کے درخت کی دوسری جانب سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ایک شاندار دوسرا پھاٹک ملتا ہے۔ جس کے اوپر پاسبانوں کی رہائش کے لئے کمرے ہیں اور نہایت عمدہ زینے بنے ہوئے ہیں۔ یہی اصل عمارت کا باب الداخلہ ہے اس کے اوپر کی عمارتیں جو بڑی حسین ہیں۔ جمیل بیگ کے داماد خواجہ محمد ذاکر کی تعمیر کردہ ہیں یہ دونوں حضرت بابا مسافر شاہ کے انتہائی عقیدتمند تھے اور ان ہی کی زندگی میں انہوں نے یہ عمارت بنوائی تھی جو موجودہ عمارتوں میں سب سے زیادہ پرانی ہے۔

پھاٹک سے اندر آنے کے بعد داہنی طرف ایک دودھ میں نہائی ہوئی سنگ مرمر کی طرح سفید مسجد بنی ہے اور بائیں طرف ایک نہر کی طرح لمبا خوشنما حوض ہے۔ اور تعمیر کے اعتبار سے ان دونوں کا شمار عجائبات میں ہوتا ہے۔

اس مسجد کی بنیاد حضرت بابا شاہ مسافر نے خود رکھی تھی اور اس وقت یہ بالکل سیدھی سادی دوسرے دالان کی عمارت تھی جس کے عقب میں ان کا حجرہ تھا۔ حضرت کے وصال کے سترہ سال بعد یعنی ۱۱۴۳ھ مطابق ۱۷۳۰ء میں آپ کے ایک معتقد ترک تاز خان نے اس کو دوبارہ تعمیر کروایا اس کے بعد مسجد کے سامنے ایک اور دوسرے دالان کا اضافہ اس درگاہ کے سجادے بابا غلام محمود نے کیا۔ یہ ہی نہیں بلکہ انہوں نے بغیر سنگ مرمر لگائے ہوئے اس مسجد کو سنگ مرمر کا بنا دیا۔ اس قسم کی ایک مسجد نظام الملک آصف جاہ کے پرانے محل "نوکھنڈے" میں اب تک موجود ہے جس پر دور سے سنگ مرمر کی تعمیر کا گمان ہوتا ہے۔ "نوکھنڈے" میں

آصف جاہ اوّل کی گدی" اب تک موجود تھی اور اب اس عمارت میں آزاد گرلز کالج بن گیا ہے) دراصل اورنگ آباد کے گرد و نواح میں چونے کا پتھر بکثرت ملتا ہے اور اس کے ساتھ ایک اور چمکدار پتھر دریاؤں کے کنارے بڑی مقدار میں ملتا ہے۔ جو "گار" کا پتھر کہلاتا ہے یہ شیشے کی طرح چمکدار ہوتا ہے اور اب شیشہ سازی میں استعمال ہو رہا ہے۔ چونے اور گار کے ایک خاص امتزاج سے ان مسجدوں پر پلاسٹر کیا گیا ہے جو صدیاں گزرنے کے باوجود اپنی چمک دمک قائم رکھے ہوئے ہے اسی قسم کا پلاسٹر رابعہ درانی (بیگم اورنگ زیب عالمگیر) کے مقبرے اور سنہری محل کی پرانی عمارتوں میں اب تک ملتا ہے۔ جس میں جوڑ لگانا ناممکن ہے

اس مسجد کے اوپر تین حسین اور نفیس گُنبد ہیں اور خانقاہوں کی طرف کھلنے والی کھڑکیوں اور دروازوں پر پتھر سے بنی ہوئی نیم دو بڑی اور نیم قوسی چھجے نما کمانیں ہیں اور ان پر بنگالہ کے قدیم طرزِ تعمیر کی گہری چھاپ ہے۔

اس مسجد کے پاس دو حوض ہیں ایک خانقاہوں کی طرف کھلنے والے دروازوں کے ساتھ یعنی مسجد کے جنوب میں چوکور حوض ہے جو نگینہ حوض کہلاتا ہے اور دوسرا مسجد کے بالکل سامنے پن چکی کی عمارت کے دوسرے حصّے کی پوری لمبائی میں پھیلا ہوا نہر کی طرح کا حوض ہے جس پر شالیمار کے حوض کا شبہ ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی ۱۲۰ فٹ، چوڑائی ۱۲ فٹ اور گہرائی ساڑھے چار فٹ ہے۔ اس میں بیس۲۰ عدد فوارے ہیں جو ہر وقت موتی لٹاتے رہتے ہیں اس کے ایک طرف مسجد کے ساتھ ساتھ جنوب میں انتہائی خوبصورت چمن بندی ہے اور دوسری طرف راہ داری کے ساتھ "ریلنگ" ہے جس کے نیچے کھام ندی بہتی ہے۔ کیا آپ کو یقین آئے گا کہ یہ ۱۲۰ فٹ لمبی چالیس گز لمبا حوض اسی سرنگ یا زمین دوز تہہ خانے یا خانقاہ کے اوپر بنا ہوا ہے جو عمارت کے پہلے حصّے سے مسلسل چلی آرہی ہے؟ بڑی حیرت انگیز بات ہے کہ اس خانقاہ کی چھت پر ۱۲۰×۱۲× $\frac{9}{2}$ فٹ یعنی ۶۴۸۰ کیوبک فٹ (مکعب فٹ) پانی کا بوجھ ہے

جو یہ صدیوں سے اُٹھائے ہوئے ہے اور حوض کا یہ پانی نہ خانقاہ کے اندر رستا ہے اور نہ اس کی دیواروں کو نم کرتا ہے۔ حوض کے درمیان باہر کی طرف اسی خانقاہ کے اندر جانے کا ایک زینہ ہے۔ جہاں پر وہ مضبوط کمانیں اور محرابیں اور دیو پیکر ستون صاف دکھائی دیتے ہیں جو اس نہر نما حوض کا بوجھ صدیوں سے اٹھائے ہوئے ہیں۔ حوض کے گرد وضو کرنے والوں کے لئے لمبائی چوڑائی میں بے شمار پتھر کی چوکیاں بنی ہوئی ہیں۔ گویا فقرا اور مساکین کے لئے پانی کا انتظام اوپر تھا اور کے لئے اس کے نیچے عجیب و غریب طریقے سے گنجائش نکالی گئی ہے۔ یہ ہال جس میں دور تک کمانیں ہی کمانیں دکھائی دیتی ہیں اور چھت پر بنا ہوا یہ حوض اسلامی فن تعمیر کا دلکش اور عجیب ترین نمونہ ہے اور غالباً اس طرح کا ہال اور حوض ہندوستان بھر میں کسی اور مقام پر نہیں ہے۔

اس حوض میں پانی زیر زمین نالیوں کے ذریعہ اس بڑے حوض سے آتا ہے جس میں آبشار گرتی ہے اور نگینہ حوض کو بھی پانی اندر ہی اندر یہیں سے فراہم ہوتا ہے۔ اتنا عمدہ نہری نظام ہندوستان میں کہیں اور نہیں ہے کہ بارش کے ساتھ ہی آبشار رواں ہو۔ دونوں حوض بھریں خود بخود فوارے چلتے رہیں اور سال بھر تک چلتے رہیں۔ جب برسات میں آبشار کا بہاؤ تیز ہوتا ہے تو فواروں کے پانی میں بھی تیزی آجاتی ہے چمن اور سبزہ اپنے نکھار پر ہوتا ہے اور بابا مسافر شاہ اور حضرت پلنگ پوش صاحب کی اس آخری آرام گاہ میں سے کسی کا دل واپس آنے کو نہیں چاہتا۔

یہ حوض ۱۱۳۷ھ مطابق ۱۷۲۴ء میں حضرت بابا مسافر شاہ کے ایک معتقد جمیل بیگ نے حضرت کے انتقال کے بیس سال بعد بنوایا تھا۔ اور اب اس کی تعمیر کو ڈھائی سو سال گذر چکے ہیں۔ اور کمال یہ ہے کہ اس میں اینٹ اور چونے کے علاوہ کوئی اور مسالا نہیں لگایا گیا ہے۔ اس حوض کی دلکشی اور

تعمیر پر مولانا غلام آزاد بلگرامی نے ایک مثنوی بھی لکھی ہے اور آخری مصرعے سے تاریخ تعمیر نکالی ہے۔

مستطیل حوض کے اختتام پر جنوب میں شرقاً غرباً ایک سنگین محرابوں والی بڑی کشادہ خانقاہ ملتی ہے جس کے دوسرے ستونوں اور کنگوروں دار محرابوں کو دیکھ کر لاہور کے قلعے کی عمارتیں یاد آتی ہیں ان خانقاہوں کو بھی دوسرے دالانوں اور کمروں پر مشتمل ہیں۔ ترک تاز خان نے نو ہزار روپے کی لاگت سے تعمیر کروایا تھا۔ اب اس میں دفاتر اوقاف اور کتب خانے ہیں۔ حضرت باباشاہ مسافر اور ان کے جانشینوں نے یہاں خود ایک کتب خانہ بنوایا تھا جہاں عربی فارسی کے نایاب قلمی نسخے اور تصوف کی بے شمار کتابیں موجود تھیں جس سے ان کے ذوقِ علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ جن بزرگوں نے اس کتب خانے کو اصلی حالت میں دیکھا ہے ان کا بیان ہے کہ یہاں فقہ، حدیث، تفسیر، تصوف، تاریخ ادب، لغت وعربی پر ہزاروں کتابیں موجود تھیں۔

اس خانقاہ کے آخری سرے پر زاویہ قائمہ بناتی ہوئی مغرب کی طرف ایک اور طویل خانقاہ ہے اس کی ابتدا ایک بڑے کمرے سے ہوتی ہے۔ جہاں حضرت باباشاہ مسافر کے تبرکات مثلاً آپ کا جُبّہ۔ پیالہ۔ تسبیح۔ خانہ کعبہ کا غلاف گنبدِ خضرا کے اندرونی پردوں کے ٹکڑے زیارت کے لئے رکھے ہوئے ہیں دوسری طرف آپ کا دُرّہ جس سے آپ شرعی حد جاری کرتے تھے پگڑی، انگرکھا اور ہزار دانے والی بھاری بھرکم تسبیح بھی موجود ہے جس کو حلقہ ذکر میں بیک وقت کئی لوگ پڑھ سکتے تھے۔ ان کمروں کے بعد جو خانقاہ یا دوسرے رعب آفریں دالان ہیں وہ بھی باباشاہ محمود کے بنائے ہوئے ہیں اور یہاں پر فقرا اور مساکین اور کھانا کھلایا جاتا تھا۔

اس خانقاہ کے اختتام پر شرقاً غرباً ایک چبوترہ ہے جس کے ساتھ حضرت

بابا مسافر شاہ اور حضرت پلنگ پوش صاحب کے مزارات کا حجرہ ہے اور اس تعمیر کا دروازہ پھر اسی مسجد میں کھلتا ہے جس کا ذکر میں پہلے کر چکی ہوں۔

حجرے کے اندر دروازے کے مقابل حضرت باباشاہ مسافر کا مزار ہے اور اس سے متصل داہنی طرف دیوار میں حضرت شاہ پلنگ پوش صاحب آرام فرما رہے ہیں۔ یہ گنبد جو اس درگاہ پر بنا ہوا ہے یہ بھی فنِ تعمیر کا عجیب نمونہ ہے کیونکہ غالباً یہ پہلا گنبد ہے جس کے اندر ترچھے روشندان بنے ہوئے ہیں بناوٹ کے لحاظ سے یہ روشنی کو اندر پہنچاتے ہیں لیکن موسلا دھار بارش میں بھی پانی کا کوئی قطرہ اندر نہیں آسکتا۔ دونوں مزاروں پر سفید دودھیا غلاف چڑھے رہتے ہیں اندر مزارات کچے ہیں اور حجرے کے اندر جو فرش ہے وہ بھی کچا ہے لیکن سفید چادروں سے مزین ہے۔ درگاہ کے سامنے برآمدہ ہے جو سنگ سرخ کا ہے۔ چھت دیدہ زیب ہے اور اسی چبوترے پر ایک پتھر کی صحنچی کے اندر حضرت محمود شاہ کا مزار ہے جن کا ذکر ہم بعد کو کریں گے اسی چبوترے سے متصل کئی ایک پختہ مزارات ہیں جن کے گرد گلاب اور موتیا کے پیڑ لگے ہوئے ہیں۔

درگاہ کے عقب میں ذرا سا راستہ چھوڑ کر شرقاً غرباً ایک اور خانقاہ ہے جس کے ساتھ پن چکی کی دوسری عمارت کی چہار دیواری مکمل ہو جاتی ہے اس کو یوں تصور کرلیں کہ اس وسیع اور عریض چار دیواری کے تین طرف محراب دار دالانوں والی مضبوط پتھر کی خانقاہیں ہیں اور دوسری طرف جمیل بیگ کا بنایا ہوا نہر نما لانبا حوض ہے اب اس عمارت کے حسن اور وسعت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ چالیس گز لمبا حوض صرف ایک کونے کی پٹی میں بنا ہوا لگتا ہے۔ اندر کا صحن جو درگاہ کے حجرے کے سامنے ہے۔

چمن بندی اور آرائش کی اپنی آپ مثال ہے جس میں ہمیشہ پھول کھلے ہوئے ملتے ہیں۔ صفائی اور دیکھ بھال کے لئے بہت بڑا عملہ موجود رہتا ہے۔ موتیا، گلاب اور کیوڑے کے پھول ہر وقت مشام جان کو تازہ رکھتے ہیں اتنی عمدہ اور نکھری ستھری چمن بندی کی مثال شاید ہی کہیں مل سکے۔

درگاہ شریف کے اندرونی احاطے میں گنبد کے چبوترے سے متصل ایک بہت بڑا چبوترہ ہے۔ جہاں کبھی ایک سنگ سرخ کی بارہ دری تھی اور اس میں چینی کے نفیس ٹکڑے جڑے ہوئے تھے یہ عمارت ایک گانے والی عورت نے تائب ہونے کے بعد بنوائی تھی۔ اس نے بابا صاحب کے دست حق پرست پر اسلام لانے کے بعد بیعت کی تھی اور اس کا مزار بھی وہیں آپ کے قدموں کی طرف ہے جو اب گلاب کے ان پیڑوں سے پہچانا جاتا ہے جو اس کے مزار کے سرہانے لگے ہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ اس کی چھت مخدوش ہونے کی وجہ سے منہدم کر دی گئی ہے البتہ محراب دار دالان ایک دیوار کی طرح باقی ہے۔

پن چکی کی حسین اور عجیب و غریب عمارت کو محکمہ آثار قدیمہ نے بڑی توجہ اور فکر کے ساتھ ہر دور میں محفوظ رکھا ہے۔ حوض، آبشار اور زیر زمین خانقاہ انجینئرنگ یا تعمیرات کا کمال ہے جس کا سہرا بابا محمود شاہ کے سر ہے کیونکہ یہی وہ برگزیدہ ہستی ہے جس نے یہاں نہر کے ذریعہ پانی پہنچایا۔ جس کا منبع اورنگ آباد کی پہاڑیوں پر ہے۔ اور وہاں سے کاریزی نظام کے تحت یہاں پانی لایا گیا ہے۔

آبشار "سیفن" کے اصول پر بنائی گئی ہے جس کے ذریعہ پہاڑ کی بلندیوں سے آنے والا پانی ڈھلان پر بڑی تیزی کے ساتھ بہتا ہوا آبشار سے گرتا ہے اور اس کے اندر ہی اندر آنے والی نہر کا سراغ بڑی مشکل سے

ملتا ہے۔ تینوں حوض اندر ہی اندر ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور انہیں کی نالیوں سے یہاں کے باغ اور چمن سیراب ہوتے ہیں اور زائد پانی کھام ندی میں واپس چلا جاتا ہے۔

بابا محمود شاہ کی یہ نہر پن چکی کی نہر کہلاتی ہے جس سے ایک بڑا علاقہ سیراب ہوتا رہا۔ یہ نہر ساڑھے چار میل لمبی ہے اور ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر آٹھ لاکھ گیلن پانی فراہم کرتی ہے۔ اس نہر کو تعمیر کرنے میں دو برس کا عرصہ لگا تھا اور ایک شاعر نے اس کی تاریخ میں یہ مصرعہ کہا تھا کہ

تشنگاں را جوئے محمود آب داد! ۱۱۵۱ھ

اس نہر کا نہر عنبرین کی طرح یہ کمال ہے کہ اس کی نگہداشت پر کوئی مصارف نہیں ہوئے پانی نہایت شیریں اور پاک صاف ہے۔

پن چکی میں آرام فرمانے والے حضرت بابا مسافر شاہ اور حضرت بابا پلنگ پوش جیسے بزرگوں کے حالات زندگی بیان کرنے سے پہلے بہتر ہے کہ ہم ان مشاہیر اور مشہور و معروف سیاحوں کی رائے بھی آپ کو بتا دیں جنہوں نے یہاں آنے کے بعد یہاں کے حسن سے متاثر ہو کر یہاں کے رجسٹر میں درج کی ہیں۔

لارڈ لنلتھ گو وسیرائے ہند | پن چکی ایک دلکش ایک مقام جس سے امن آشتی حسن اور دلکشی کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ ۸ر اگست ۱۹۴۳ء

اے۔ سی۔ لوتھیان۔ آخری ریذیڈنٹ ریاست حیدرآباد دکن

اس مقام کو دیکھ کر مجھے بے اختیار شاعر چاسر کا یہ مصرعہ یاد آتا ہے کہ "ایک کنج عافیت امن اور شانتی کا گہوارا دلکش اور دلفریب۔ ۲۹ر دسمبر ۱۹۴۳ء۔"

گلاڈ اسٹون سالومن۔ ڈائریکٹر اسکول آف آرٹس بمبئی | میرے نزدیک اس باغ کو منڈی کے کشش آفرین باغات میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

دلچسپ تاریخی عمارات اور مقدس بارگاہ کا حسین اجتماع ذوق سلیم کا مظہر ہے اس کے حوض اپنے دلکش ترین ماحول اور خوبصورت پھیلاؤ میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ میرے علم میں حوض کے نیچے کا وسیع اور بے نظیر مال فنی خوبیوں کے اعتبار سے ہندوستان تعمیرات میں ایک خاص امتیاز کا حامل ہے۔ مسجد کے سامنے جو چھوٹا سا حوض (نگینہ حوض) اور دلکش عمارت ہے وہ مصور کے حسن کاری کے نادر نمونے پیش کرنے کے بہترین مواقع فراہم کرتے ہیں۔

بی۔ ایم ویسکو ڈائریکٹر جنرل محکمۂ آثار قدیمہ حکومت ہند | اس دلفریب مقام کی سیر کو بار بار دل چاہتا ہے۔ جہاں چاروں طرف حسن اور امن کی بارش برستی ہے۔ ۳ر جولائی ۱۹۴۷ء

مشہور برطانوی عمالی قائد اینوان بیوان | یہاں میں جو کچھ دیکھا اس کا ناقابل فراموش گہرا تاثر قبول کیا ہے۔ ۳۱ر فروری ۱۹۵۳ء

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی | آج حسن اتفاق سے اس متبرک اور فرحت بخش مقام کی سیر کا موقع ملا ہے۔ جس کو عرف عام میں پن چکی کہتے ہیں۔ عمارتیں حوض اور فواروں کی فردوسی بہاروں کا کیا کہنا؟ میں اس مقام کی سیر سے نہایت مسرور ہوا ہوں۔ اورنگ آباد آکر اس مقام کی سیر نہ کرنا ظلم ہے ۱۷ر جولائی سنہ ۴۲ء

مولانا مناظر احسن گیلانی | تکیہ بابا شاہ مسافر نقشبندی قدس سرہ آجکل پن چکی کے نام سے موسوم ہے اب اس گدی کا کوئی وارث نہیں رہا۔ حکومت نظام کے محکمۂ امور مذہبی کی نگرانی میں یہ عمارت ہے عجیب پرفضا مقام ہے ایک بہتے ہوئے نالے یا ندی کے اوپر خانقاہ بنی ہوئی ہے۔ میلوں کے فاصلے ایک نہر نکال کر لائی گئی ہے جو ایک بلند دیوار سے آبشار کی شکل میں مسلسل گرتی رہتی ہے یہ دیکھنے کا سماں ہے۔

یہاں ایک بہت بڑا کتب خانہ تھا جس کو زمانے کے دست برد نے تباہ کر دیا۔ خانقاہ کے ساتھ ایک جاگیر بھی ہے مولانا غلام علی آزاد کا قیام اس خانقاہ میں زیادہ تر اسی کتب خانے کی وجہ سے تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کتب خانے کی ساری کتابیں جو ہزاروں کی تعداد میں تھیں مولانا کی نظر سے گزری ہیں۔

شکیل بدایونی | اس قدر دلکش مقام ہے کہ اس کی کشش مجھے بار بار یہاں کھینچ لاتی ہے۔ ۲ر ستمبر ۱۹۵۳ء

میوزک ڈائریکٹر نوشاد | یہاں نغمۂ روح کی مناسبت بڑی واضح ہے یہاں آکر یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہاں وہ نغمہ ہے جو روح کو آب حیات پلا دے اور مردہ دل کو زندہ کر دے۔ ۱۲ر ستمبر ۱۹۵۳ء۔

پن چکی کے متعلق یہ معلومات اعداد و شمار۔ تاریخیں اور حضرت بابا شاہ مسافر اور حضرت بابا پلنگ پوش کے حالات زندگی جو آئندہ تحریر کروں گی میں نے ایک کتابچہ سے حاصل کئے ہیں جو بابائے اردو مولوی عبدالحق کے کتب خانۂ خاص میں محفوظ ہے اور جس کا نمبر ۳۵ الف ۱۹/۹ ہے اس کو کسی زمانے میں مبارز الدین رفعت نے اورنگ آباد سے محکمۂ آثار قدیمہ کے تعاون سے شائع کیا تھا لیکن اب یہ کتاب نایاب ہے اور اسی میں پن چکی کے آثار قدیمہ کے رجسٹر سے انہوں نے مشاہیر کی یہ رائیں جمع کی تھیں جن کو میں نے ہو بہو نقل کیا ہے۔

حضرت بابا پلنگ پوش

ان کا اصلی نام محمد سعید ہے چیتے کی کھال کو لباس بنانے کی وجہ سے پلنگ پوش کا لقب اختیار کیا۔ بخارا کے قریب عجدوان کے مَردم خیز خطے میں آپ دسویں صدی ہجری کے نصف آخر کے ابتدائی سالوں میں پیدا ہوئے ہیں وہ علاقہ ہے جہاں نقشبندیہ سلسلے کے چھٹے جانشیں عبدالخالق عجدوانی پیدا ہوئے تھے یہ علاقہ اب روسی ترکستان میں شامل ہے اس علاقے میں ایک اور مقام فرغانہ بھی ہے۔ وہاں شہنشاہ بابر کی آبائی سلطنت تھی۔

حضرت بابا پلنگ پوش اپنے بعد کے ایک صاحب ثروت اور خوش حال گھرانے کے چشم و چراغ تھے اسی لئے ان کی تعلیم و تربیت پر والدین نے بطور خاص توجہ دی تاکہ ہونہار بیٹا دنیا اور دین دونوں کے علوم سے سرفراز ہو۔ محمد سعید اپنی خداداد ذہانت فراست اور ذکاوت کی وجہ سے اپنے ہم مقبول میں ہمیشہ ممتاز رہے ایک دن اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کہیں جا رہے تھے کہ دیکھا راستے میں ایک گروہ قلندروں کا چلا آتا ہے ان میں سے چند ایسے بھی تھے جن کا تعلق فرقہ "ملامتیہ" سے تھا (یہ قلندروں کا وہ گروہ ہے جو ظاہری طور پر اپنے آپ کو ایسے افعال اور حال میں قصداً رکھتا ہے کہ لوگ ان کو ملامت کرتے رہیں اور اس طرح ان کی عبادت و ریاضت دنیا پر ظاہر نہ ہو ظاہر ہے کہ جب ان کو مخلوق خدا اچھی نظر سے نہیں دیکھے گی تو ان سے دور بھاگے گی اور یوں وہ دنیا کے فتنوں سے محفوظ رہ کر خدا کی یاد کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت دے سکیں گے۔

انہیں میں سے بابا محمد سعید کی نظر ایک قلندر پر پڑی جس کا چہرہ چاند کی طرح روشن تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے نور کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں یہ بابا قل احمد کی ذات مبارک تھی۔ عوام میں یہ بابا قل فرید یا بابا قل مزید کہلاتے تھے اور یہ اپنے زمانے کے قطب تھے ان کو دیکھتے ہی محمد سعید ان کے گرویدہ ہو گئے۔ ان کی زبان پر بھی لایعنی باتیں اور بے تکے فقرے رواں تھے لیکن دل میں دریائے معرفت موج زن تھا اور اسی روحانی کشش کی بنا پر محمد سعید ان کے پیچھے پیچھے چل پڑے اور بیعت کے لئے آپ سے التجا کی جو قبول نہیں ہوئی۔ بابا قل فرید نے ان کو بغور دیکھا اور فرمایا کہ میاں صاحبزادے ابھی تمہاری عمر سات آٹھ برس کی ہے ابھی تحصیل علم میں لگے رہو درویشی کا راستہ بڑا کٹھن اور دشوار گذار ہے۔

محمد سعید میں نور کی جھلک ان کے چہرے پر دیکھ چکے تھے اس کی کشش اتنی شدید اور انوکھی تھی کہ آپ کے پیچھے ہٹنے کا سوال ہی نہ تھا جواب دیا کہ میں جس جگہ کھڑا ہوں وہاں سے واپسی ممکن نہیں ہے" اس جواب باصواب کے بعد آپ اپنے راحت کدے اور ناز بردار والدین کو چھوڑ کر اسی گروہ کے ساتھ چل پڑے اور ایک طویل مدت تک ان کے ہمسفر ہو کر ان کی خدمت گزار بنے رہے یہاں تک کہ جب آپ اپنے حجرے میں رات کو آرام کرتے تو ہونہار محمد سعید حجرے کی دیوار سے لگے کھڑے رہتے کہ شاید باریابی نصیب ہو ایک مرتبہ حضرت بابا قل فرید کا قیام بخارا کی مسجد کے کسی حجرے میں تھا اور آپ حسب عادت حجرے کی دیوار سے لگے کھڑے تھے اتنے میں اندر سے آواز آئی کون ہے؟

حضرت آپ کا فقیر "محمد سعید نے جواب دیا اور بابا قل فرید نے بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ دروازہ کھولا آپ کو اندر بلایا۔ اور حسب عادت چند لایعنی باتیں کیں اور کچھ بے تکے جملے کہے کہ شاید یہ ہونہار لڑکا ان باتوں سے بددل ہو کر

یہاں سے چلا جانے یا ان کا ساتھ چھوڑ دے لیکن محمد سعید پر ان باتوں کا کوئی اثر ہی نہ ہوا اور آپ بدستور اپنے رہبر کی عقیدت مندی میں بیٹھے رہے۔ ان کا یہ استقلال دیکھ کر باباقل احمد نے آپ کو سینے سے لگایا نہ صرف بیعت کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا بلکہ اپنا خرقہ بھی عنایت کیا جس کے بعد محمد سعید کی دنیا ہی بدل گئی۔ "جذب" کی ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ دنیا و مافیہا کا ہوش ہی نہ رہا۔ لباس برہنگی اختیار کیا اور گیارہ سال تک صحرانوردی میں مصروف رہے کبھی کبھی شہر کی طرف آجاتے اور لوگ ان کو کپڑے پیش کرتے لیکن قبول نہ فرماتے مدتوں لوگ آپ کو سعید دیوانہ کے نام سے پکارتے رہے مگر خدا کو جو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے گیارہ برس بعد جذب کی یہ کیفیت "قرشی" کے بازار میں خود بخود کم ہوگئی جو کسی اور درویش کامل کی نظر کا اثر تھا جس نے آپ کو چیتے کی کھال لاکر پہنا دی اور اس کے بعد دیوانے سعید کو ہوش آگیا اور یہی لباس آخری وقت تک زیب تن رہا جس کی وجہ سے آپ پلنگ پوش کہلاتے:

جب آپ کو پوری طرح ہوش آگیا تو آپ پھر بخارا سے نکلے اور اپنے پیر باباقل فرید کی خدمت میں حاضر ہوئے انہیں کے ساتھ حرمین شریف کی زیارت کی اور مرشد کامل نے آپ کی روحانیت کو اور زیادہ نکھارا اور حج سے واپسی کے بعد آپ نے اپنے عزیز مرید کو مزید باطنی تربیت کے لئے اپنے ایک پیر بھائی کے حوالے کر دیا جن کا نام شیخ درویش عزیزاں تھا۔ ان کا ہاتھ اپنے دست کے ہاتھ میں دیتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ محمد سعید کو آپ میرا بیٹا سمجھیں اس کی تربیت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں یہ اب تمہارے سپرد ہے" اس کے بعد ہی بابا برقل نے انتقال فرمایا اور محمد سعید درویش عزیزاں نے باکمال عقیدت و احترام روحانی تربیت حاصل کر کے سلوک کی منزلیں طے کرتے رہے دونوں کا سلسلۂ نقشبندیہ تھا اور دونوں کو حضرت بہاالدین نقش بندی سے فیض حاصل ہو رہا تھا۔ حضرت خواجہ بہاالدین نقشبندی

کا سلسلہ سات واسطوں سے حضرت علی کرم اللہ وجہ کی معرفت سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا ہے۔ اور چوبیس واسطوں کے بعد حضرت ابوبکر صدیق سے ملتا ہے۔

حضرت درویش عزیزاں سے روحانی تربیت کی تکمیل کے بعد ان ہی کے حکم پر آپ نے ہندوستان کا رخ کیا مختلف مقامات پر سے گذرتے ہوئے کابل آئے اور کئی برس تک کشمیر میں قیام کیا پھر حسن ابدال چلے گئے اور وہاں سے دوبارا حج کی سعادت حاصل کی۔ اور اس دوسرے حج کے بعد آپ جب تشریف لائے تو دہلی میں قیام کیا اور پھر اورنگ آباد کی زمین کو اپنی مستقل قیام گاہ بنانے کا شرف بخشا۔

اورنگ آباد میں آپ کا درود۔ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں ہوا۔ اس وقت یہاں کا صوبہ دار شہزادہ معظم تھا۔ یہاں پہنچ کر آپ نے قطب پورے میں ایک برساتی نالے کے قریب ایک مشہور درویش شاہ عنایت کے تکیہ پر قیام کیا۔

اس وقت نظام الملک آصف جاہ اوّل جن کا نام نواب میر قمرالدین خاں تھا اپنی طفولیت یا بچپن کے عہد میں تھے اور آپ کے والد میر شہاب الدین خاں المخاطب غازی الدین خان بہادر فیروز جنگ سپہ سالاری کے عہدے پر فائز تھے۔ حکم خداوندی تھا کہ حضرت محمد سعید بابا پلنگ پوش جوں ہی اورنگ آباد تشریف لائے۔ غازی الدین بہادر کے لشکر سے وابستہ ہوگئے جو اس وقت دکن کی کسی اہم مہم کو سر کر رہا تھا۔ آپ خود اپنی زبان مبارک سے فرمایا کرتے تھے کہ مجھے خدائے عزوجل کی طرف سے اس لشکر کی اعانت کا حکم ملا ہے۔ کچھ دنوں تک یہ بات پردہ راز میں رہی لیکن تا کجے آخر کار سالار لشکر میر غازی الدین کو بھی یہ بات معلوم ہوگئی کہ ان کے لشکر کی فتح و نصرت کس درویش کے قدموں کی مرہون منت ہے اور یہ درویش جس کا

نام بابا سعید پلنگ پوش ہے رحمت خداوندی ہے اور اولیائے کرام میں بہت بڑا درجہ رکھتا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے۔ لہٰذا وہ بڑی عقیدت و محبت کے ساتھ اس درویش کے آگے سر جھکانے لگے۔

محمد سعید بابا پلنگ پوش کے حالات زندگی تفصیل کے ساتھ پڑھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ عبادات و ریاضات میں گذرا خواہ وہ جذب کی حالات میں ہوں یا ہوش کی صورت میں ان کو جو کچھ ملا ان کے یقین محکم اور اپنے پیر و مرشد بابا قل فرید کی خدمت سے ملا۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکی ہوں کہ اس وقت نواب قمرالدین ابن غازی الدین حیدر بہت کم عمر تھے۔ لیکن شفیق باپ ان کی تربیت اور تعلیم میں دن رات ایک کئے ہوئے تھے چنانچہ ایک دن انہوں نے بڑی عجز و انکساری کے ساتھ حضرت بابا پلنگ پوش سے کہا کہ آپ میرے غریب خانے پر "حلقۂ ذکر" کا اہتمام کریں اور میرے بیٹے قمرالدین کی اقبال مندی اور زندگی کی دعا کریں۔ بابا پلنگ پوش پہلے تو ٹال مٹول کرتے رہے کیونکہ درویشی اور تصوف کا پہلا سبق جاہ پرستی سے گریز اور افراد زدن کی محبت سے پرہیز ہے لیکن جب انہوں نے بہت مجبور کیا تو آپ راضی ہو گئے چنانچہ حلقہ درویشاں میں جو نواب غازی الدین کے یہاں تھا اللہ ہو کا ذکر اس طرح شروع ہوا کہ حلقہ کے مرکز میں ایک چراغ جلا دیا گیا اور وہیں کمسن بچے یعنی نواب قمرالدین (نظام الملک آصف جاہ اوّل) کو بٹھا دیا گیا۔ ذکر اور وہ بھی اللہ ہو کا کوئی کھیل یا دل لگی نہیں تھی۔ آپ کی قیادت میں اہل ذکر پورے جذب کے ساتھ اللہ ہو کا ورد کر رہے تھے اور اس ذکر میں انسان کی ساری روحانی اور جسمانی قوتیں مصروف ذکر ہوتی ہیں زبان کے ساتھ ساتھ دل بھی یہی الفاظ بولنے لگتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد محفل ذکر اپنے عروج پر پہنچی اور اللہ ہو کے نعروں کے ساتھ ساتھ فقرا کے تیز تیز تنفس نے اس

چراغ کو گل کر دیا جو درمیان میں روشن تھا۔ پھر کیا تھا نواب غازی الدین کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس سے بڑھ کر بدشگونی اور کیا ہو سکتی ہے کہ جس چراغ کی روشنی کے لیے یہ اہتمام کیا جائے وہی گل ہو جائے۔

حضرت بابا پلنگ پوش نے معاملے کی اہمیت کو فوراً سمجھ لیا اور چراغ کے قریب پہنچ کر ایک ضرب اللہ ھُو کی ایسی لگائی کہ یہ چراغ پھر جلنے لگا اور جلتا رہا۔ آپ کی یہ کرامت نواب غازی الدین نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھی چنانچہ جب محفل ختم ہوئی تو آپ حضرت کے قدموں میں گر پڑے اور اپنے بیٹے قمرالدین کو بھی آپ کے قدموں میں ڈال دیا۔

"ملفوظات نقش بندیہ" میں آپ کی کئی ایک کرامات اور درج ہیں اور کچھ مولانا غلام علی آزاد نے ماسٹر الکرام میں لکھی ہیں جس کو بوجہ طوالت نظر انداز کرتی ہوں۔ بہرکیف یہ بتانا ضروری ہے کہ حضرت شاہ پلنگ پوش کی زندگی درویشانہ اور قلندرانہ تھی۔ وہ مخلوق سے جس قدر گریزاں رہنا چاہتے کہ مخلوق ان کے جلو میں چلتی رہتی۔ ان کے ساتھ ہمیشہ مریدوں اور عقیدت مندوں، قلندروں اور راہ سلوک کے مسافروں کا ایک انبوہ کثیر رہا کرتا تھا۔ جہاں کہیں قیام فرماتے لوگوں کا تانتا بندھ جاتا۔ آپ ان درویشوں کی خاطر داری میں ذرہ برابر کمی نہ کرتے۔ سب کو پیٹ بھر کر کھانا کھلاتے۔ کسی کی قہوے سے تواضع کرتے اور کسی کی حلوے سے۔ آپکی محفلیں بھی عجیب و غریب تھیں۔ جن میں شاعر، ادیب علما، فقرا رسب ہی شریک رہتے۔ جب آپکی سواری کہیں نکلتی یا آپ سفر میں ہوتے تو اس شان سے چلتے کہ آپ کے ستر یا اسی عقیدت مند اپنے سروں پر موتیا و گلاب اور دوسرے خوشبودار پھولوں کے گملے اٹھا کر ساتھ ساتھ چلتے جہاں کہیں آپ مقیم ہوتے ایک اچھا خاصہ باغیچہ بن جاتا (غالباً یہی وجہ ہے کہ آپ کے وصال کے ڈھائی سو سال بعد بھی آپ کی درگاہ گل و گلزار ہے۔ آپ کی خانقاہ میں نہ کوسناٹا ہے نہ ویرانی بلکہ ان کے آگے روش روش پر چمن بندی ہے جس کو دیکھ کر لوگ آج بھی دنگ رہ جاتے ہیں اور ان کی آب یاری کے لیے "جوئے محمود" کا پانی بھی

آپ ہی کا چشمۂ فیض ہے ۔)

شاہ نعمت نامی فقیر آپ کی سواری کے آگے رہتا اور مور کے پروں کا ایک وزنی آفتاب گیر یا چھتری لیے سایہ کرتا ہوا چلتا۔

بابا پلنگ پوش کا وجود سراپا رحمت اور مجسم شفقت تھا۔ اپنے بیگانے سب پر آپ کا لطف وکرم عام تھا۔ بچوں اور بیواؤں پر آپ کی نظر عنایت ہمیشہ رہتی آپ سراسر جمال تھے۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھی رنگ جلال بھی آجاتا تھا لیکن زیادہ غالب رنگ، شفقت محبت ورحمدلی اور کرم نوازی کا تھا۔ ملفوظات نقش بندیہ میں آپکی حیات طیبہ کا ایک اور واقعہ درج ہے جو اورنگ آباد ہی کے قیام کے زمانے کا ہے۔

حضرت کے ارادت مندوں میں جو فقراء مساکین کا گروہ تھا اس میں ایک فقیر شاہ عبداللہ نامی بھی تھا۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اورنگ آباد کی گلی کوچوں میں حق اللہ جان اللہ کا نعرہ لگاتے ہوئے گشت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب مغلپورہ سے گذرے تو دفعتاً ان کی نظر ایک نوجوان خوبرو لڑکے پر پڑی جس کا نام واصل بیگ قندیل تھا۔ شاہ عبداللہ اس کے حسن کو دیکھتے کے دیکھتے رہ گیے۔ مجاز سے حقیقت کی طرف بڑھنے لگے۔ مقبول کو دیکھ کر حسن خداداد خدا یاد آیا۔ اب تو ان کا یہ حال ہو گیا کہ دن میں دو تین بار اس کے کوچے سے گذرتے، ہر گھڑی حق اللہ اور جان اللہ کا نعرہ لگاتے۔ یہاں تک اس لڑکے کو بھی یقین ہو گیا کہ اس فقیر کو مجھ سے محبت ہے۔ بات ہم جولیوں میں پھیلی اور آپس میں لڑکے اس کو شاہ عبداللہ کا نام لے کر چھیڑنے لگے۔

ایک دن بات کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی۔ وہ باہر کھڑے انتظار میں حق اللہ کے نعرے لگاتے رہے اور یہ لڑکا اندر سے نہ نکلا۔ اتنے میں چند لڑکے اور آگئے۔ واصل بیگ قندیل کو آواز دی اور کہا کہ "تیرا شیفتہ باہر کھڑا ہے اور تو اندر بیٹھا ہے۔ یہ بات سن کر لڑکے کو غصہ آگیا اور باہر آکر فقیر کو برا بھلا کہنے لگا۔ شاہ عبداللہ فقیر اور درویشی کی جس منزل پر تھے وہاں کسی سے لڑائی جھگڑا دشنام طرازی کفر کے برابر تھے۔ اس لیے خاموشی سے اس کے غصے اور اس کے فقروں کو برداشت کرتے رہے لیکن اپنی جگہ

سے نہ ہٹے۔ اس بات پر اس لڑکے کو اور زیادہ غصہ آیا۔ اور اس نے طیش میں آکر خنجر فقیر کے پیٹ میں اتار دیا۔ اور وہ اسی جگہ حق اللہ کا نعرہ لگا کر جان بحق ہو گیے۔

بات جنگل کی آگ کی طرح ساری بستی میں پھیل گئی۔ لڑکا اور اس کے دوست ڈر کے مارے گھر ہی میں چھپ گئے۔ اور حاکم شہر نے لڑکے کے گھر کو گھیر کر اس پر پہرہ لگا دیا۔

جس وقت یہ واقعہ رونما ہوا ہے اس وقت حضرت بابا پلنگ پوش صاحب خلد آباد شریف میں حضرت برہان الدین غریب کے مزار مبارک کی زیارت کو گیے ہوئے تھے۔ فوراً ان کو اطلاع دی گئی اور وہ بڑی تیز رفتاری سے جائے واردات پر پہونچے۔ فقیر کی لاش کے پاس کھڑے ہو کر فرمایا۔ لوگو عشق کا مقام بڑا کٹھن ہے۔ کبھی عاشق نہ بنو کہ وہ مارے جاتے ہیں۔ انھوں نے راہ سلوک کا جو نکتہ بڑی سادگی کے ساتھ فرمایا تھا، وہ اتنا عام فہم نہ تھا۔ بہرکیف سمجھنے والے سمجھ گیے۔ اس کے بعد فقیر کے ساتھیوں نے قصاص کا مطالبہ کیا۔ آپ نے اشارتاً یہ جواب دیا کہ ؎

شہیدانِ وفا کا خون بہا کیا؟

اور پھر بڑی مشکل سے کہہ سن کر لڑکے کے گھر پر سے پہرہ چوکی ختم کیا۔ ساتھیوں کو ٹھنڈا کر کے سمجھایا کہ بدلہ لینا درویشی کے خلاف ہے اور معاف کر دینا ملکوتی صفت ہے۔ اور پھر اس شعر کی اہمیت کو کون نہیں جانتا کہ ؎

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زمان از غیب جانِ دیگر است

غرض کہ معاملہ رفع دفع ہوا اور آپ نے لڑکے کو گھر سے بلوایا اس کے عزیز و اقارب کو تسلی دی اور لڑکے کے سر پر اپنا دست شفقت پھیرا اور فرمایا چلو اس "شہید محبت" کو اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچا دیں۔ لڑکے کو انھوں نے جنازے کے آگے رکھا اور ایک ہجوم آپ کے ساتھ جلوس کی شکل میں روانہ ہوا۔ آپ بار بار یہ شعر زبان مبارک سے دہرا رہے تھے ؎

عالم ز جمالِ تو جمیل است و جمیل
واز فرقت تو جہاں قتیل است و قتیل
مادیتِ خونِ خود زکس نستانیم
خونِ ہمہ عاشقاں سبیل است و سبیل

جنازے کے ساتھ جتنے لوگ تھے سب زار زار روتے جارہے تھے۔ لڑکا اور اس کے ساتھی اشکبار سر پر خاک ڈالتے جارہے تھے۔ جنازہ جدھر جدھر سے گذرتا لوگ احتراماً ساتھ ہوجاتے اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔

اس مرد درویش کی تدفین کے بعد لڑکے کو خلعت بخشی۔ اس کے عزیز واقارب کو کرم گستری سے نوازا اور پھر ارشاد فرمایا کہ تم ہر شب جمعہ کو قبرستان جاکر اس کے مزار پر فاتحہ پڑھا کرو۔

اس چھوٹے سے واقعہ سے حضرت کی زندگی کے دو پہلو نمایاں ہوتے ہیں ایک تو برہان الدین صاحب کے مزار مبارک پر آپکی حاضری اس بات کی دلیل ہے کہ آپ خود نقش بندی سلسلے سے منسلک ہونے کے باوجود دوسرے سلسلوں مثلاً چشتیہ کے بزرگوں کی کتنی قدر کرتے تھے اور ان کا احترام ان کے دل میں تھا۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے کہ حضرت بہاءالدین زکریا ملتانی اور حضرت بابا فرید گنج شکر دونوں دو مختلف سلسلوں کے رہبر و رہنما تھے مگر ساری زندگی ایک دوسرے کا احترام کرتے رہے کیونکہ بزرگان دین کے چاروں مشہور و معروف سلسلے یعنی قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ نقش بندیہ سب فروعات میں مختلف ہوں تو ہوں مگر ان کی بنیادی تعلیم اور مقصد ایک ہے اور ہر راستہ خواہ کہیں سے بھی نکلے خدا تک پہنچتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ یعنی بابا پلنگ پوش صاحب قلندر تھے اور ان کی شان قلندری اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ اپنے ساتھی درویش کے خوں بہا کا مطالبہ کرنے کے بجائے انہوں نے قاتل پر رحم وکرم کی بارش کردی۔ یہ تو عین ممکن تھا کہ قاتل کے لوگ آپکی خوشامد کرتے اور معافی تلافی کرتے لیکن آپ کا ظرف دیکھئے

کہ الٹا اس کو خلعت سے نوازا تاکہ وہ گناہ کی ندامت سے بچے۔ اپنے ساتھی کی موت کو مرضی پروردگار اور مشیت الٰہی سمجھ کر اللہ کی رضا پر راضی رہے۔ کسی کا عاشق ہونا بڑا مشکل ہے نہ کہ خدا کا عاشق اس راہ میں نہ جانے کتنے لوگ آرے سے چیر دیئے گیے اور کتنے صلیب پر چڑھ گئے۔ رہ گیا مقام محبوبیت یا معشوقیت تو اس تو اس پہ انسان کا بس نہیں تا نہ بخشد خدائے بخشندہ۔

غرض کہ حضرت محمد سعید بابا پلنگ پوش کی زندگی حد درجہ درویشانہ تھی۔ آپ کو امراء اور روسا سے جو کچھ نذر ملتی آپ بخوشی قبول فرماتے اور فوراً ضرورت مندوں اور حاجت مندوں میں تقسیم فرمادیتے۔ اکثر و بیشتر خود زبان مبارک سے فرمایا کرتے کہ ہمارا کام امیروں سے لینا اور غریبوں میں تقسیم کرنا ہے۔ آپ نے ساری زندگی تجرد میں بسر کی اور اہل وعیال کے بکھیڑوں سے آزاد رہے۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکی ہوں کہ آپ خواجہ غازی الدین فیروز جنگ کے لشکر سے وابستہ تھے۔ اس وقت نواب صاحب کا لشکر گلبرگہ (کرناٹک) میں پڑاؤ ڈالے پڑا ہوا تھا۔ آپ کا وصال وہیں ہوا۔ اور آپ کا جسد مبارک گلبرگہ سے اورنگ آباد لایا گیا اور موجودہ پن چکی کے احاطے میں دفن کردیے گیے۔

پن چکی اس وقت آپ کا تکیہ تھی اور آپ کے عزیز مرید حضرت مسافر شاہ وہاں موجود تھے۔ یہ وقت تھا جب نواب نظام الملک آصف جاہ اول صوبیداری کے عہدے پر فائز ہوچکے تھے اور انہوں نے پن چکی کا باغ اور زمین ان دونوں حضرات کے گذارے کے لیے وقف کردی تھی۔ حضرت مسافر شاہ کے یہاں قیام سے پہلے یہ مقام حضرت شیریں شاہ کا تکیہ تھا جن کا ذکر آئے گا۔ یہاں پن چکی موجود تھی اور مسجد تعمیر ہوچکی تھی۔ جس سے متصل حضرت بابا پلنگ پوش صاحب کو دفن کردیا گیا۔ آپ کے عزیز مرید اور خلیفہ حضرت مسافر شاہ تھے۔

آپ کا وصال ۷ رمضان المبارک ۱۱۱۱ھ کو ہوا۔ کسی ہم عصر شاعر نے حسب ذیل فارسی قطعہ تاریخ کہا جو اب بھی آپ کے مزار کی جنوبی دیوار یعنی پائینی دروازے

کے داہنی طرف پتھر پر کندہ ہے۔

قطب رُوے زمین و غوث زماں
اختر بُرج سعد شاہ سعید
سال۔ تاریخ وصل گفت خرد
قصر جنت بوذ مکاں سعید

حضرت محمد عاشور باباشاہ

مُسافِر صاحب

آپ کا اصلی نام محمد عاشور ہے مسافر شاہ کا خطاب کثرت سفر کی بنأ پر آپ کے پیر و مرشد حضرت بابا سعید پلنگ پوش نے دیا تھا۔ آپ ان کے خلیفہ تھے اور چند روایات کے مطابق (جو سینہ بسینہ آرہی ہیں کسی کتاب میں سند نہیں ہے) آپ اپنے پیر و مرشد کے بھانجے بھی تھے۔ آپ کا سنہ ولادت باوثوق طور سے نہیں بتایا جا سکتا لیکن قیاساً کہا جاتا ہے کہ آپ کی ولادت ۱۰۶۰ھ کے بعد کے کسی سال کی ہوگی۔ آپ بہت چھوٹے تھے جب آپ کے والد صاحب اور پھر آپ کی والدہ صاحبہ نے سفر آخرت قبول کیا اور آپ کی پرورش آپکی خالہ نے کی۔ اپنی آغوش محبت میں کی۔ آپ کا اصلی وطن بھی عجدوان تھا سات برس کی عمر میں بخارا گئے تاکہ اس دور کے مشہور و معروف مکتب۔ مسجد پیر محمد میں داخل ہوئے۔ یہیں آپ نے کلام مجید حفظ کیا اور علوم دینی کی تکمیل فرمائی۔ چونکہ آپ کے والد ماجد "کبرویہ" سلسلے کے مرید تھے۔ اس لیے آپ نے بھی لڑکپن میں اسی مسلک کے ایک پیر میر عطاء اللہ ساکتری سے بعیت کی اور دن رات مجاہدہ نفس اور عبادت میں لگ گئے۔

دہی بستی تھی جہاں حضرت محمد سعید پلنگ پوش پیدا ہوئے تھے اور یہ شہر بخارا کی وہی مسجد تھی جہاں آپ اکثر شہتوت کے گھنے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر عبادت الٰہی میں مشغول رہا کرتے تھے چنانچہ ایک دن جب محمد عاشور گھومتے گھماتے اس طرف

پہنچے تو دیکھا کہ پلنگ پوش صاحب ریاضت و عبادت میں مصروف ہیں۔ نگاہیں ان کے چہرے پر جم گئیں اور دل میں ایک کشش سی پیدا ہوگئی۔ آپ نے اپنے دل پر جبر کیا اور واپس آکر پھر اپنے اسباق یاد کرنے لگے۔

دوبارہ پھر آپ نے ان کو وہیں دیکھا پھر وہی کشش محسوس کی اور پھر آپ صبر کرکے اپنے درس میں لگ گئے لیکن جب تیسری مرتبہ ان کو دیکھا تو صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور آپ تمام علوم ظاہری کے حصول سے یکسر دستبردار ہوکر حضرت بابا پلنگ پوش کے پیچھے چل پڑے اور دو ایک مرتبہ انکی خدمت میں باریاب ہوئے۔

انہیں دنوں حضرت بابا پلنگ پوش نے نجف اشرف کی زیارت کا ارادہ کیا۔ جب حضرت محمد عاشور کو اس کی اطلاع ملی تو ان کے پیچھے نجف اشرف کی طرف چل پڑے وہاں جب منزل مقصود کی طرف پہنچے تو لوگوں سے پتہ چلا کہ بابا پلنگ پوش صاحب زیارات سے فارغ ہوکر غور ہوتے ہوئے کابل جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ حضرت محمد عاشور صاحب کی لگن اتنی سچی تھی کہ آپ نے بھی غور کا راستہ لیا۔ وہاں در بدر ان کی تلاش کی اور بالآخر پتہ چلا کہ آپ کابل جا چکے ہیں۔ طلب صادق رکھنے والا یہ جوان اپنے پیر و مرشد کی تلاش میں غور سے کابل پہنچا اور کابل جانے کے بعد معلوم ہوا کہ آپ پشاور جا چکے ہیں۔ اس کو شومئی قسمت کہیے یا اتفاق وقت کہ جب بابا عاشور پشاور پہنچے تو یہ خبر ملی کہ آپ کے رہبر و رہنما کشمیر کے راستے حسن ابدال جا چکے ہیں۔ بالآخر آپ نے ان سے حسن ابدال میں ملاقات کی۔ وہیں آپ کو بیعت کا شرف حاصل ہوا آپ نے وہیں ان کو مسافر شاہ کا خطاب دیا اور اپنی کلاہ (ٹوپی) آپکے سر پر رکھ کر آپ کی عزت افزائی فرمائی۔ پیر و مرشد کا دیا ہوا خطاب اتنا مقبول ہوا کہ لوگ ان کو ہمیشہ مسافر شاہ کہتے رہے اور اب بھی بہت کم لوگ ان کے اصلی نام سے واقف ہیں

حسن ابدال میں قیام کے دوران بابا شاہ پلنگ پوش کے مریدوں کی ایک ٹولی نے بنگال جانے کا ارادہ کیا اور حضرت مسافر شاہ بھی انھیں کے ساتھ ہو لیے۔ ان کے جانے کے بعد حضرت پلنگ پوش نے دوبارہ حج بیت اللہ کا ارادہ کیا۔ وہاں سے

پھر حسن ابدال واپس آئے اور پھر دہلی سے ہوتے ہوئے اورنگ آباد کی بستی میں فروکش ہوگئے۔ اور شاہ عنایت کے تکیے میں قیام کیا۔

ادھر جب حضرت مسافر شاہ بنگال سے واپس آئے تو اپنے پیر و مرشد کو حسن ابدال کے مقام پر نہ پاکر سخت پریشان ہوئے اور جب یہ معلوم ہوا کہ آپ اورنگ آباد میں قیام فرما ہیں تو آپ بھی ٹھٹھہ کے راستے مختلف مقامات پر سے گذرتے ہوئے اورنگ آباد پہنچ گئے۔ حضرت پلنگ پوش صاحب آپکو دیکھ کر بیحد خوش ہوئے۔ آپ کا ہاتھ پکڑ اپنے پاس بٹھایا۔ اپنی کلاہ اور خرقے سے نوازا اور اپنی خلافت سے سرفراز کیا۔ یہی نہیں بلکہ اپنے حلقے میں بہانگ دہل یہ اعلان کیا کہ آئندہ سے بابا شاہ مسافر کو ہم سے بڑھ کر جانیں۔

اس کے بعد ان کا کچھ وقت اور سفر میں صرف ہوا۔ اور بالآخر آپ حج کرنے کے بعد پھر اورنگ آباد آئے۔ جن دنوں آپ دوبارہ اورنگ آباد آئے اس وقت آپ کے پیر حضرت پلنگ پوش صاحب غازی الدین حیدر کے لشکر سے منسلک ہو چکے تھے۔ اور آپ کا زیادہ وقت لشکر ہی میں بسر ہوتا تھا۔

حضرت مسافر شاہ نے دوسری مرتبہ پھر اپنے پیر و مرشد کے نقش قدم پر چل کر شاہ عنایت کے تکیہ پر قیام کیا جو قطب پورے میں تھا۔ لیکن ایک دن بڑا عجیب واقعہ پیش آیا یعنی آپ کو شدید بخار چڑھا اور آپ بستر پر لیٹ گئے۔ آپکی حالت دیکھ کر عنایت شاہ تکیہ دار بہت پریشان ہوئے سوچا کہ اگر یہ فقیر جان سے گذر گیا تو میں بڑی مشکل میں پھنس جاؤں گا کیونکہ مشہور یہی ہے کہ مغل فقیروں کے پاس اکثر اشرفیاں اور دولت ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ان کے بعد حاکم وقت مجھے تنگ کرے۔ اپنے میزبان شاہ عنایت کا یہ واہمہ جب آپ کے کانوں تک پہنچا تو آپ اسی بخار کی شدت میں اس مقام کو چھوڑ کر نکل گئے اور کھام ندی کے کنارے کنارے بمشکل تمام چلتے چلتے ایک خس پوش مسجد کے پاس پہنچے جہاں شیریں نامی ایک درویش رہتے تھے جو عالم بھی تھے اور محدث بھی شہر میں ان کے بہت سے معتقد موجود تھے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ یہاں

اردگرد داو باش نوجوانوں نے اپنا اڈہ بنالیا تھا اور بھنگ پینے کا شغل عام تھا۔

عجیب بات ہے کہ جب شیریں شاہ نے آپکو دیکھا تو فوراً تعظیم کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت شیریں شاہ اسی برگد کے پیڑ کے نیچے فروکش جو اب بڑے تالاب نما حوض کے کنارے آبشار کے بالمقابل ہے۔ خس پوش مسجد وہی ہے جس کا ذکر میں پن چکی کی عمارت کے بیان میں کر چکی ہوں۔ جس کے در و دیوار پر سنگِ مرمر کا گمان ہوتا ہے۔

حضرت شیریں صاحب نے آپکو دیکھ کر فرمایا۔ خوب آئے۔ یہ تمہاری ہی جگہ ہے اور میں ایک مدت سے اس کی پاسبانی کر رہا تھا۔ اب تم اپنی جگہ سنبھالو اس کے بعد وہ وہاں سے رخصت ہوگیے اور سلطان گنج میں سکونت اختیار کی اور بابا مسافر شاہ نے یہاں اپنا تکیہ بنایا۔ بھنگ گھوٹنے والوں کو سخت تنبیہ کی اور اس علاقے کو پاک صاف کر کے اپنے قیام کا بندوبست کیا۔

رفتہ رفتہ آپ کے زہد و تقوے عبادت و ریاضت کی شہرت دُور دُور تک پھیلی اور لوگ جوق در جوق آکر آپ کے ارادت مندوں میں داخل ہونے لگے یہاں تک کہ آپ کے ایک مرید مومن بیگ نے اس خس پوش مسجد کی چھت کو کھپریل یا کویلو سے پختہ کر دیا۔ کچھ دنوں بعد مسجد کی دیواریں پختہ ہوگئیں اور جمیل بیگ کے داماد خواجہ محمد ذاکر نے مسجد کے ساتھ والے پھاٹک پر عمارت تعمیر کرادی جس کا ذکر میں پہلے کر چکی ہوں۔

میر محمد ہراتی جو آپ کے مرید اور عقیدت مند تھے ایک کنواں کھدوا کر فقراء کے لیے وقف کر گیے جو اَب حوض کے اندر ہے۔ اس طرح ایک اور مرید نے مسجد کے جنوب میں ایک چھوٹا سا حوض بنوادیا (نگینہ حوض جس پر آپ نے اکثر وضو فرمایا) اور پانی کی رسد کے لیے ایک چھوٹی سی نہر بھی بنادی جو بابا شاہ محمود کی چکی اور عمدہ نہر کی تعمیر کے بعد استعمال میں نہ رہی۔

حضرت مسافر شاہ صاحب کی ذات اورنگ آباد والوں کے لیے نعمت غیر مترقبہ

تھی۔ آپکی دین داری، زہد اور تقوٰی کی وجہ سے آپ کے مریدوں میں دن رات اضافہ ہونے لگا۔ فقیروں اور درویشوں کی رشد و ہدایت کا ایک سرچشمہ مل گیا اور اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو آپ نے صحیح معنوں میں دین داری اور پاک بازی پھیلائی۔

خود آپ کی زندگی نہایت سادہ اور درویشانہ بلکہ فقیرانہ تھی۔ اسباب دنیا میں صرف تن کے کپڑوں کا ایک جوڑا، پانی کا ایک لوٹا اور بوریئے کے علاوہ کوئی اور اثاثہ نہ تھا۔ آپ کے متعلق مشہور ہے کہ آپ کے عقیدت مند جو بھی آپ کی خدمت میں پیش کرتے آپ ان کو محتاجوں اور درویشوں میں تقسیم کر دیتے۔ نہ اپنی ذات کے لیے کوئی نذر قبول فرماتے نہ اپنی ذات کے لیے کچھ بچا کر رکھتے۔ اگر آپ کا کوئی دوست یا مرید اصرار کر کے کپڑوں کا نیا اور عمدہ جوڑا آپ کو بنا دیتا تو آپ اس کی خوشی کی خاطر زیب تن فرما لیتے لیکن جلد ہی اتار کر فقیروں یا یتیموں کو دے دیا کرتے اور یوں آپ کا فیض جاری رہتا۔ آپ کی خانقاہ میں غریب اور یتیم بچوں کی رہائش، خورد و نوش اور تعلیم و تربیت کا انتظام مفت تھا اور یہ خدمت آپ کے ایک مرید کے سپرد تھی جن کا نام اخوند ملا خاموش تھا۔ درویشوں کے مسلک کے مطابق آپ کبھی کسی امیر یا رئیس کے دربار میں حاضری نہیں دی البتہ وہ لوگ خود نذر نذرانے آپ کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے۔ جس کا آپ باقاعدہ حساب رکھتے تھے۔ بارش کے دنوں میں بیواؤں کے چھپر خرید کر دیدیا کرتے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے کارندوں کو حکم دیا کرتے کہ اگر گھر کی دیواریں بوسیدہ ہوں تو ان کی بھی مرمت کر دی جائے اگر ایک طرف امیروں سے یہ گریز تھا تو دوسری طرف غریبوں پر یہ عنایت تھی کہ انکی اعانت اور مزاج پرسی کے لیے ان کے گھروں میں جاتے اور ان ہی مسکینوں میں سے اگر آپ کو کوئی دعوت دیتا تو قبول فرماتے۔

فقیر کے بارے میں آپ کا ارشاد تھا کہ یہ تین حرفوں سے بنا ہوا ایک نہایت معنی خیز لفظ ہے جس میں ف سے فاقہ، ق سے قناعت اور 'ر' سے ریاضت شامل ہے کیونکہ فقیر کے یہی تین اجزائے ترکیبی ہیں اور اس کے بغیر فقیر مکمل نہیں ہوتا۔

حضرت باباشاہ مسافر نے کبھی کوئی بات خلاف شرع نہیں کی بلکہ اپنے تکیے کے اطراف یا اپنے مریدوں اور ارادت مندوں کو بھی اگر کوئی غیر شرعی حرکت کرتے دیکھتے تو نہ صرف روکتے ٹوکتے بلکہ "حد" جاری کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے ان کا یہ "درّہ" اب تک انکی خانقاہ کے ایک کمرے میں محفوظ ہے۔

حضرت بابا پلنگ پوش آپ کے پیر و مرشد تھے اور وہیں آپ کا قیام تھا لیکن ان دونوں کے مسلک ذرا سے مختلف تھے۔ ان کی دوستی محبت اور اخوت بالکل ایسی ہی تھی جیسے حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کے ساتھ حضرت نصیرالدین محمود چراغ دہلوی کی تھی۔ دونوں اپنے اپنے رنگ میں کامل تھے۔ بابا پلنگ پوش پر زیادہ ترکیف و جذب کا عالم رہتا اور بابا مسافر شاہ سوختگی اور مشیت الٰہی طاری رہتی۔ حضرت باباشاہ مسافر لوگوں سے نذریں وصول کیا کرتے تاکہ غرباء اور مساکین کی پرورش اور یتیم طالب علموں کی تربیت اور تعلیم کا بندوبست کر سکیں لیکن حضرت بابا پلنگ پوش صاحب کی درویشانہ حمیّت اس کو گوارا نہ کرتی لیکن دونوں ایک دوسرے کے مسلک کا احترام کرتے۔

حضرت بابا مسافر شاہ اپنی ذات کے لیے کبھی کسی سے کچھ طلب نہ کرتے۔ حالانکہ آپ کا ذریعہ آمدنی کچھ نہ تھا جو کچھ آتا سب کھڑے کھڑے محتاجوں میں تقسیم فرما دیتے۔ آپ صحیح معنوں میں زاہد شب زندہ دار تھے۔ آدھی رات کے بعد اپنے حجرے سے نکلتے اور پورے تکیے کا ایک چکر لگاتے۔ ایک ایک فقیر اور ایک ایک درویش کی خبر گیری کرتے۔ اس کے بعد صبح سے پہلے ایک پہر رات رہے مسجد میں تشریف لاتے جہاں آپ کے خاص خاص مرید آپ کے نقش قدم پر چلنے کے لیے سر جھکائے آپ کے منتظر رہتے۔ کچھ آپ کی آمد کے بعد آتے۔ مؤذن کی اذان کے ساتھ باجماعت نماز ہوتی اور نماز سے فراغت پاکر آپ پھر اپنے حجرے میں جاتے اور اشراق تک مراقبے میں مصروف رہتے۔

اس کے بعد آپ مثنوی کا درس دیتے۔ مثنوی مولانا روم کو خوش الحانی سے

پڑھنے کا کام ایک خوش الحان صاحب عبداللہ کے سپرد تھا جو بخارا کے رہنے والے تھے۔ لوگ بڑے غور و خوض سے سنتے اگر کہیں معنی و مطالب سمجھ میں نہ آتے تو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بلا تکلف تبادلہ خیالات کرتے اور پھر بھی کوئی گتھی نہ سلجھتی تو خود حضرت بابا شاہ مسافر اس کی توضیح و تشریح فرما کر حاضرین کو مطمئن کر دیتے۔ اس کام سے فراغت پاکر آپ لوگوں کو رخصت کرتے حجرے میں آتے نگینہ حوض پر وضو کی تجدید کرتے اور دیر تک حدیث، فقہ اور تصوف کی کتابوں کے مطالعے میں مصروف رہتے۔ کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کرتے پھر ظہر کی نماز کے بعد جو جماعت سے ادا فرماتے حجرے میں دوبارہ آتے اور مشائخین کرام صوفیائے عظام کے حالات زندگی کا بغور مطالعہ فرماتے۔ عصر کے بعد ارادت مندوں کے ہجوم میں آپ اپنی برکتیں نچھاور فرماتے۔ جس کو جو مسئلہ پوچھنا ہوتا وہ پوچھتا۔ دقیق سے دقیق نکتے، اَدق سے اَدق عبارتیں معرض بحث میں آتیں اور اس صحبت میں سینکڑوں لوگوں کو فیض حاصل ہوتا۔ مغرب تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ اس کے بعد آپ پھر اپنی آرام گاہ میں آجاتے اور عشاء کے وقت تک وہیں رہتے۔

عشاء کی نماز میں زیادہ تر وہی لوگ جماعت میں ہوتے جو وہاں مقیم ہوتے اور جن کی تربیت کا آپ خاص اہتمام فرماتے رہتے تھے۔ اس کے بعد رات کی عبادت کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آپ کب تک قرآن پاک پڑھتے اور کب تک تسبیح و میں مصروف رہتے غرض کہ تیس برس تک آپکی زندگی کا یہی معمول رہا۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکی ہوں کہ آپ شرعی احکام کی سختی کے ساتھ خود بھی پابندی فرماتے اور دوسروں سے بھی کرواتے۔ حد یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان شراب پی کر آپ کے تکیہ کے قریب سے گذرتا تو آپ درہ سے شرعی حد لگانے میں ذرہ برابر تکلف نہ کرتے۔ یہی نہیں بلکہ شرع کا ہر حکم آپ کے لیے اٹل تھا، ہر بات کا آپ کو خیال رہتا۔ یہاں تک کہ آپ کے پیر و مرشد یعنی حضرت شاہ بابا پلنگ پوش تک آپکی اس افتاد طبیعت کا احترام فرماتے۔

ان تمام شرعی پابندیوں اور احکام اسلامی میں سخت گیری کے باوجود آپ

نہایت نرم دل اور صاحب باطن شیخ تھے جب آپ کے سامنے کوئی یتیم بچہ آتا تو آپ بے اختیار اس کے سر پر اپنا دست شفقت پھیرتے اور اکثر و بیشتر یہ شعر پڑھا کرتے ۔

پسر ہر کہ بدیدم پسر خود گفتم
مفلس از مہر ہمانم کہ یتیماں دارم

آپ کی نکھری ستھری زندگی اور پاکیزہ اخلاق کی وجہ سے آپ کا حلقہ ارادت بہت وسیع تھا۔ جو شخص آپ سے بیعت کرتا وہ آپ ہی کا ہو رہتا اور ان کے بیعت لینے کا طریقہ بھی بڑا عجیب و غریب تھا یعنی جو شخص آپ کے پاس بیعت کے لیے حاضر ہوتا اس کو اس طرح لایا جاتا کہ اس کے جسم پر ستر پوشی کے لیے ایک ٹکڑے کے علاوہ اور کوئی لباس نہ ہوتا۔ آپ کے خادم اس شخص کے لیے تیار کی ہوئی کشتی آپ کے سامنے پیش کرتے۔ آپ اپنے ہونے والے مرید کے لیے فاتحہ پڑھتے (کہ اس کا نفس مر جائے اس کو سلوک کی راہ میں فتح و نصرت ہو) اس کے بعد آپ کے خادم اس کو وہی کفن اس کو باقاعدہ پہنا دیتے۔ یہ اس لیے ہوتا کہ کفن مردوں کا لباس ہے اور جو مر چکا اس میں نہ اب تندی باقی ہوگی نہ گرمی نہ غرور نہ نخوت۔ اس کے بعد اس کفن پوش کے سامنے پانی کا ایک پیالہ پیش کیا جاتا۔ پہلے حضرت خود اس میں سے نوش فرماتے پھر حاضرین پیتے اور آخر میں نئے مرید کو وہ سب پانی پلا دیا جاتا۔

حضرت باباشاہ مسافر کی پاک اور مطہر عملی زندگی کی وجہ سے اکثر امراء اور عمائدین ان کے گرویدہ تھے۔ چنانچہ جس طرح نواب غازی الدین خان کو بابا پلنگ پوش سے عقیدت تھی ویسے ہی ان کے جانشین قمرالدین خان آصف خان اول کو حضرت کے جانشین باباشاہ مسافر سے عقیدت تھی۔ وہ اکثر انکی خدمت اقدس میں حاضری دیا کرتے۔

یہ ایک قاعدہ کلیّہ ہے کہ جب کوئی امیر رئیس یا نواب کسی کا ارادت مند ہوتا ہے تو اس کے سارے ماتحتین بھی اس کی روش پر چل پڑتے ہیں۔ چنانچہ ترک تاز خان جو اس وقت کے رئیس تھے وہ بھی آپ کے حلقہ بگوش ہوئے اور انھیں نے

حضرت کے وصال کے بعد پن چکی کی موجودہ مسجد اور خانقاہ بنوائی۔ مزار کا گنبد جو روشن اور ہوادار ہے خود آصف جاہ اوّل نے تعمیر کروایا اور خانقاہ کے خرچ کے لیے ایک بڑی جاگیر عطا کی۔

ان فقیران بے نوا کے کفش بردار کیسے کیسے سپہ سالار اور مرد میدان تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ شہنشاہ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد جب اس کا بیٹا بہادر شاہ جانشین ہوا تو اس کے بھائیوں نے حسب روایات سلطنت مغلیہ بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ بہادر شاہ نے اس کو دبانے کے لیے دکن کا رُخ کیا۔ اتفاق سے بہادر شاہ کے دربار میں ایک ہفت ہزاری منصب دار نیاز علی موجود تھے۔ جن کو لوگ قلیچ محمد خان کہتے تھے۔ وہ حضرت باباشاہ مسافر کے نہ صرف مرید تھے بلکہ جان فدا کرنے والے عقیدت مندوں میں سے تھے۔ اورنگ آباد کے نواح میں جو انکی جاگیر تھی۔ اس میں سے وہ باباشاہ مسافر کی خانقاہ کے لیے مستقل طور پر ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ بھیجا کرتے تھے۔ (یہ رقم شاید اب ڈیڑھ لاکھ کے برابر ہے) بہادر شاہ نے اس بغاوت کے خاتمے پر جب شہزادہ کام بخش کو شکست دی تو دہلی جاتے وقت کچھ دنوں کے لیے پھر اورنگ آباد میں قیام کیا۔ اپنے ہفت ہزاری درباری کی زبانی جب حضرت مسافر شاہ کا حال سنا تو خود ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کے ساتھ اور بہت سے امراء بھی حلقہ بگوش ہوگئے۔ بہادر شاہ کا بیٹا شہزادہ محمد جہاں شاہ بھی پا پیادہ آپ کے آستانے پر حاضر ہوا خود بہادر شاہ نے جب پہلی بار باریابی کی اجازت چاہی اور اپنے وزیر اعظم کو باباشاہ مسافر کی طرف بھیجا تو اس مرد درویش نے وہی جواب دیا جو اللہ کے سچے بندے دیتے ہیں یعنی جس طرح اور لوگ میرے یہاں آتے جاتے ہیں ویسے ہی بہادر شاہ بھی آسکتے ہیں لیکن فقیروں سے بادشاہوں کا کیا کام؟ اس طرح کی ملاقاتوں سے فقیر کا وقت خراب ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس کے بعد بہادر شاہ عام آدمیوں کی طرح آپ کی خدمت میں

میں آیا اور واپس گیا۔ البتہ قلیچ محمد خان نے اورنگ آباد کے نواح میں "قصاب کھیڑا" ایلورا کے پرگنے خانقاہ کے فقرا اور مساکین کیلئے وقف کر دیئے اور دہلی پہنچ کر بادشاہ کا فرمان حاصل کر لیا تاکہ اس پر شاہی مہر صداقت ثبت ہو جائے۔

سنہ ۱۱۲۵ ہجری کے آخری مہینوں میں حضرت بابا شاہ مسافر بیمار ہوئے اور باری کے بخار نے شدت اختیار کر لی۔ بڑھاپے کی وجہ سے آپ کے جسم میں قوت مدافعت ختم ہو رہی تھی۔ اس لیے اور بھی متعدد امراض نے سر اٹھایا اور آپ صاحب فراش ہو گئے۔ کسی دوا سے فائدہ نہ ہوا۔ اور آپ راضی برضا یہی فرماتے رہے کہ جو کچھ اللہ کو منظور ہوگا وہی ہوگا۔ انتقال سے کچھ دن پہلے (مرض الموت میں) آصف جاہ اول آپکی مزاج پرسی کے لیے آئے۔ آپ نے فرط محبت میں انکو اپنی چارپائی پر بٹھا لیا اور اپنی دستار طلب کی۔ خادم فوراً دستار لے آیا۔ آپ نے اس کو جھاڑ جھٹک کر نوک پلک سے درست کیا اور پھر آصف جاہ اول کے ہاتھ میں دیدی۔ انھوں نے اس کو آنکھوں سے لگا کر اپنے سر پر رکھ لیا۔

وصال سے صرف دو روز پہلے آصف جاہ پھر حاضر خدمت ہوئے اور حضرت بابا شاہ مسافر کا ضعف دیکھ کر زار زار رونے لگے اور فرط عقیدت میں ان کے پیر پکڑ لیے۔ حضرت نے ان کا ہاتھ اپنے نحیف و زار ہاتھ میں لیا۔ آصف جاہ نے آپ کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ دونوں نے سورۂ فاتحہ پڑھی اور پھر حضرت بابا شاہ مسافر نے آصف جاہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر یہ دو شعر پڑھے۔

اے سلیمان درمیانِ چغد و باز
علم حق شو جا ہمہ مرغاں بساز!
مرغ غیرے راز بان خیر گو
مرغ پر بشکستہ را از خیر گو

یہ شعر سن کر آصف جاہ اول پر رقت طاری ہو گئی اور حضرت نے دعا دی فرمایا کہ انشاء اللہ ایک عالم اس عزیز سے فیض یاب ہوگا۔ آپ کی دعا

قبول بارگاہ تھی اور سچ مچ ڈھائی سو سال تک دکن دودمان آصفیہ فیض یاب ہوتا رہا۔

انتقال سے چند گھنٹے قبل آپ نے بار بار ہدایت کی کہ خانقاہ میں جو کچھ ہے وہ غربا اور مساکین میں تقسیم کر دیا جائے۔ آپ کے حکم کی فوری تعمیل کر دی گئی۔ کتابوں کی کثیر تعداد کے علاوہ جو آپ کا ذاتی اثاثہ تھا اس میں ایک بوریا اور سرکہ و سکنجبین کی دو یا تین بوتلیں تھیں جب وہ بھی بانٹ دی گئیں تو آپ نے سکون کا سانس لیا اور ۵ رجب المرجب سنہ ۱۱۲۶ھ کو مغرب کی اذان سن کر لا الہٰ الا اللہ فرمایا اور جان ناتواں جان آفریں کے سپرد کر دی اور اپنے پیر حضرت بابا شاہ پلنگ پوش کے پہلو میں دفن کر دیئے گئے۔

مسافر شاہ ارباب معارف
مقیم عرش شد از فرش ایں طاق
خرد تاریخ سال رحلتش گفت
مسافر شد ز عالم قطب آفاق

سنہ ۱۱۲۶ ہجری

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے آپ کی شان میں ایک قصیدہ بھی لکھا ہے جس سے ان کی عقیدت اور حضرت مسافر شاہ کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے چونکہ یہ اب نایاب ہے اس لیے تبرک کے طور پر چند شعر نقل کر رہی ہوں۔

قطب زماں صاحب شان عظیم — شاہ مسافر بہ درِ حق مقیم
خسروِ بے تاج و نگین و علم — تاج وہ قیصر و خاقانِ جم
ریشہ بہ اسرار حقیقت دواند — دامن ہمت بہ دو عالم فشاند
خود شکنی ہا اثر ذکر او — روشنئ دل اثر فکر او
بادشاہِ سلسلۂ نقش بند — ایک نظر او دو جہاں را پسند

روضۂ او حاجتِ عالم روا
تکیہ او جنتِ راحت فزا

واقعہ یہ ہے کہ اب تک ان کا آستانہ حاجت مندوں کے لیے بہت بڑا سہارا ہے۔ لوگ سر عقیدت خم کرتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ ان بزرگوں کی وساطت سے ان کی دعائیں قبول فرماتا ہے اور لوگ ان دونوں بزرگوں یعنی حضرت بابا پلنگ پوش اور حضرت مسافر شاہ صاحب کی نیاز بے نمک کی کھچڑی اور سوجی کے پتلے اور نرم حلوے پر دیتے ہیں۔

مکتبہ آصفیہ

سقوط دکن کو پورے چالیس برس گذر چکے ہیں اور اس عرصے میں ہماری دو نسلیں پروان چڑھ چکی ہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے دکن کا عہد زریں دیکھا تھا اور اس کی ٹھنڈی چھاؤں میں برسوں چین کی بنسی بجائی تھی اب خال خال باقی ہیں اور دس بارہ سال بعد وہ بھی نہ رہیں گے۔

سقوط دکن تاریخ کا المناک اور دنیائے اسلام کا روح فرسا سانحہ ہے۔ بغداد اور غرناطہ کی طرح یہ حکومت بھی ختم ہو گئی زمانے کے انقلابات کو نہ کوئی روک سکا ہے نہ روک سکے گا لیکن دکھ کی بات یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے مولد اپنے وطن اور اس رعایا پرور حکمران کو بھول گئے جس نے ہمیں سب کچھ دیا تھا۔ غیروں کے ہاتھوں اس چمن کی تاراجی اتنی تکلیف دہ نہیں ہے جتنا اپنوں کا تغافل اور بے اعتنائی ہے جنھوں نے اس تابندہ دور کو بالکل فراموش کر دیا ہے۔

میں جب بھی نظام سابع کی تصویر دیکھتی ہوں آنکھ بھر آتی ہے اس لیے نہیں کہ وہ ختم ہو چکے ہیں اور ان کے اقتدار کا سورج ہمیشہ کے لیے ڈوب چکا ہے بلکہ اس لیے کہ ہم لوگ جو وہاں کے ساختہ پرداختہ ہیں اب ان کا نام لیتے ہوئے شرماتے ہیں اس خیال سے کہ کہیں لوگ ہم پر شاہ پرستی کا الزام لگا کر نام نہاد ترقی پسندوں کے دائرے سے خارج نہ کر دیں۔ ہماری اسی ذہنیت کی وجہ سے ماضی کے تمام تابندہ نقوش مٹتے چلے جا رہے ہیں اور اس دردناک صورت حال میں مولانا حالی کا ایک شعر ذرا سی تبدیلی کے ساتھ پیش ہے۔

وہ ملک کہ کل ہند میں تھا جس سے چراغاں
آج اس کی مجالس میں نہ بتی نہ دیا ہے

سوچیے تو سہی کہ اگر ہم ہی نے ان کے مراحم خسروانہ اور ان کی شخصیت کو فراموش کر دیا تو پھر یاد کون کرے گا۔ میں جانتی ہوں کہ بیرون دکن بھی لوگ اور خصوصاً مسلمان ان کے پرستار تھے اور اب بھی ان کے اور ان کی مملکت کے متعلق جاننا چاہتے ہیں لیکن خود اہل دکن اس معاملے میں خاموش ہیں۔

ان حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی سلطنت کے اس آئین کو جو ہندوستانی قوم کے لیے

مثالی تھا۔ اس اسلامی تہذیب و ثقافت کو جو برصغیر کی جان تھی از سر نو پاکستان میں روشناس کروایا جائے جس کے بنانے میں مرکزی کردار اردو زبان کا تھا جس کا وجود تاج آصفیہ کی آب و تاب تھی اور جس کو وہاں کے تمام باشندے بلا امتیاز مذہب و ملت اپنی زبان سمجھتے تھے۔

گورنمنٹ کالج ناظم آباد سے پرنسپل کے عہدے سے سبکدوشی کے بعد میں نے اس ضرورت کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا اور فرصت کے اوقات میں اپنی تمام ذہنی صلاحیتوں اور جذبہ حب الوطنی کو خلوص دل کے ساتھ لے کر نکلی۔ کہاں کہاں گئی کن کن اداروں کے کن کن بزرگوں سے گفتگو ہوئی کیا کیا مایوس کن حالات ملے اس پر پردہ ہی پڑا رہے تو بہتر ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ اس مایوسی کے عالم میں میں نے طے کر لیا کہ اپنے محدود وسائل اور کمترین سرمائے سے خود مکتبہ آصفیہ قائم کروں گی جو دکن کے متعلق کتابیں کتابچے شائع کرے گا۔ اور اس کی طباعت و اشاعت کا اہتمام میری اور کتابوں کی طرح غضنفر اکیڈمی ہی کرے گی۔

اس سلسلے کی پہلی کتاب (جو اورنگ آباد اور خلد آباد کے اولیا کے متعلق ہے) شاہان بے تاج کے نام سے پیش خدمت ہے اور یہ مکتبہ آصفیہ کے قیام کا سنگ بنیاد ہے۔ اب یہ کام میرے ہم وطنوں کا ہے کہ اس سلسلے میں میری ہمت افزائی کریں یا حوصلہ شکنی۔ میرا تو یہ حال ہے کہ نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ۔

میں تو صرف مملکت آصفیہ اور جامعہ عثمانیہ جیسی عظیم درسگاہ کا حق ادا کرنا چاہتی ہوں جس کے بدولت مجھے اپنے وطن عزیز پاکستان میں عزت و دولت شہرت اور عہدہ سب کچھ ملا اور اس سرزمین کا حق نہ ادا ہوا ہے نہ ہوگا۔

گردش دوراں سے ہر ذرہ ہے بیگانہ ترا
اے دکن کی خاک ایک آنسو ہے نذرانہ ترا

اور یہ آنسو میرا مکتبۂ آصفیہ ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف

وحیدہ نسیم

۲۰ / ۴ / ۸۸ء

عرض مولف

جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے خلد آباد۔ دولت آباد اور اورنگ آباد کی زمین بزرگان دین سے بھری پڑی ہے۔ میں وہاں کی اکثر درگاہوں میں گئی ہوں۔ بزرگوں کے نام جانتی ہوں لیکن کوشش کے باوجود ان کے حالات زندگی نہ مل سکے۔ اس لیے قارئین سے گذارش ہے کہ اگر آپ کے پاس ان کے متعلق قیمتی معلومات ہوں تو مجھے ارسال کریں تاکہ دوسرے ایڈیشن میں ان کو شامل کیا جا سکے۔

وحیدہ نسیم
ای ۱/ جہانگیر روڈ ویسٹ
کراچی نمبر ۵

کتابیات

۱۔ اولیائے دکن ۔ مولوی ابوتراب محمد عبدالجبار خاں
مطبوعہ سنہ ۱۳۳۲ھ حیدرآباد دکن

۲۔ تاریخ فرشتہ

۳۔ پن چکی ۔ مبارز الدین رفعت (اورنگ آباد)

۴۔ مکاشفات اولیا مستجاب الدین حافظ نور محمد

۵۔ روضۃ الاولیا مولف غلام علی آزاد ۔ مطبع کریمی ۔ حیدرآباد

۶۔ AURANGABAD OLD WATER SUPPLY.
SYED SHAH YUSUFUDIN MAGRABI 1781

۷۔ GLIMPSES OF PANCHAKEE AURANGABAD.
BY M. A. JABBAR.

وحیدہ نسیم اور اورنگ آباد

اورنگ آباد بڑا بد قسمت شہر ہے۔ حسین جغرافیہ، عظیم تاریخ ------ بے شمار مذہبی شخصیتوں، صاحب اسلوب شعراء کی بے مثال سخن آفرینیوں، ہندوستانی اساطیر کے لازوال شاہکاروں، بادشاہوں کی محبت کی خوبصورت یادگاروں، عالیشان قلعوں، لامتناہی فصیلوں، فلک بوس دروازوں، زمین دوز نہروں اور ایسی ہی ان گنت خصوصیات رکھنے کے باوجود، برصغیر کے شہروں میں اتنا نمایاں نہیں جتنا اسے ہونا چاہیے تھا۔ ایک شہنشاہ سے نام کی نسبت کے سوا، بیشتر اہل دکن بھی اس کی عظمت کے پس منظر سے واقف نہیں۔

مملکت اسلامیہ آصفیہ کے دارالخلافہ، حیدر آباد، فرخندہ بنیاد کے شہریوں کی نظر میں تہذیب و تمدن کا یہ گہوارہ ------ ایک گاؤں سے زیادہ نہیں رہا۔ اور ہم گاؤں والوں کو بھی، کبھی یہ توفیق نہیں ہوئی کہ اپنی قدر پہچانتے۔ ہندوستان کی امیر ترین ریاست سے وابستگی کے نشے میں ہم سب حیدر آبادی بنے رہے اور اپنی ہر چیز کو اس اعزاز کی چکاچوند میں چھپا رہنے دیا۔ ۴۸ء میں جب ریاست حیدر آباد ختم ہوئی اور بعد ازاں لسانی بنیاد پر اس کی تقسیم عمل میں آئی تو اورنگ آباد، مرہٹی زبان، کے ناطے مہاراشٹر میں شامل کردیا گیا۔ اور اب یہ شہر اس اسٹیٹ کا، آبادی کے لحاظ سے غالباً تیسرا اور صنعتی اعتبار سے دوسرا بڑا شہر ہے۔ لیکن اس کی سب سے بڑی فضیلت جو گزشتہ چار سو سال سے اسے حاصل ہے۔ اس کا تاریخی، مذہبی، علمی اور ادبی تشخص ہے جس کے بارے میں

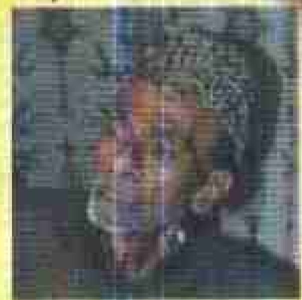
کھلتے کنول سے لوگ

دکن کے اہل قلم

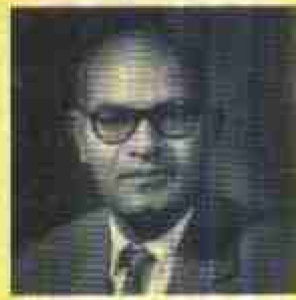
حصہ اول











حمایت علی شاعر

شاید جامعہ عثمانیہ میں بھی، کبھی کوئی باقاعدہ تحقیقی کام نہیں ہوسکا۔

پروفیسر وحیدہ نسیم جنہوں نے اس گہوارے میں آنکھ کھولی، اجنتا اور ایلورہ کو چھو کر آنے والی ہواؤں میں سانس لی اور نہر عنبری کا پانی پیا------ جنہوں نے صوفیائے کرام کے افکار سے زندگی کا درس لیا اور ولی اور سراج ایسے شعرائے کرام سے سخن کے آداب سیکھے------ پاکستان میں برسوں بعد محسوس کیا کہ اس ہجرت میں انہوں نے کیا کھویا اور کیا پایا ہے۔

یہ احساس وحیدہ نسیم ہی کو نہیں، ہم سب کو ہونے لگا ہے۔

مت پوچھ کہ کیا کیا چھوڑ آئے

جب انسان اپنے ماضی سے کٹ جاتا ہے تو عرصہ دراز تک کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ہواؤں میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ اور ایسی صورت میں جب سمت کی خوش فہمی بھی باقی نہ رہے، تو بے سمتی اس کے حق میں بگولہ بن جاتی ہے اور وہ ہواؤں کے تھپیڑے سہ سہ کر بالآخر مٹی کا ڈھیر ہو جاتا ہے۔ اسی اندیشے کے تحت دنیا کی وہ اقوام جو مستقبل کی آس میں اپنا ماضی تیاگ چکی ہیں، اپنے حال کو معتبر بنانے کے لئے کھوئے ہوؤں کی جستجو کررہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہمارے تشخص کی امین، ہماری وہ زمینیں ہیں، جہاں ہماری تاریخ نے ہماری تہذیب کی بنیاد رکھی تھی۔

پروفیسر وحیدہ نسیم جو شاعرہ و افسانہ نگار ہونے کے علاوہ، سائنس کی استاد بھی ہیں، اسی لئے حقیقت پسند بھی ہیں۔ حقیقت کا سراغ ہمیں تاریخ سے ملتا ہے بشرطیکہ ہماری آنکھیں راستے کی گرد سے پاک ہوں۔ ہم منظر کے ساتھ پس منظر بھی دیکھ سکیں۔ پروفیسر وحیدہ نسیم اسی پس منظر کی تلاش میں اورنگ آباد گئی تھیں۔ مگر انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی اورنگ آباد کا پس منظر صدیوں سے آنکھ اوجھل ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔

"۸۵ء میں، میں صرف اورنگ آباد کے لئے وہاں گئی، تین ماہ قیام کیا، دل کھول کے خلد آباد اور دولت آباد گھومی، جی بھر کے شہر کی فصیلوں اور دروازوں کو دیکھا اور سوچا کہ میں یہاں کے متعلق ضرور کچھ نہ کچھ لکھوں گی------ بزرگان دین کے حالات تو کاوش کے بعد مل گئے لیکن اورنگ آباد شہر کے بارے میں کچھ نہ ملا۔ پن چکی کا کتب خانہ دیکھا، حضرت نظام الدین مقبول الٰہی کے مزار کے **متصل** جو کتب خانہ تھا، وہاں گئی

لیکن کچھ نہ پایا------ وقت بہت محدود تھا اس لئے واپس آئی اور یہاں بابائے اردو مولوی عبدالحق کے کتب خانے کو دیکھا، حیرت ہے کہ اورنگ آباد جیسے تاریخی اور اسلامی دور کے اس عظیم شہر کی کوئی تاریخ نہیں------ میرا دل خون کے آنسو رونے لگا۔"

۸۸ء میں وہ پھر اورنگ آباد گئیں، اس بار اپنے ایک عزیز کی معرفت، انہیں پروفیسر شیخ رمضان سے ملاقات کا موقع ملا۔ پروفیسر رمضان نے مرہٹواڑہ یونیورسٹی سے اورنگ آباد پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کیا تھا۔ یہ مقالہ گویا علی بابا کا خزانہ تھا جو وحیدہ نسیم کے ہاتھ آگیا۔ انہوں نے ان جواہرات سے اپنے شہر کا روپ نکھار دیا۔

"اورنگ آباد" کو سجانے میں انہوں نے جن آئینوں سے مدد لی، وہ ہرچند اتنے شفاف نہیں، جو تاریخ و تحقیق کے تقاضوں کو پورا کرسکیں، پھر بھی، اس شہر کے کچھ نہ کچھ نقوش نمایاں ہوگئے۔ غلام یزدانی ناظم آثار قدیمہ کی کتاب "اجنتا کی نقاشی"، گید گل چودھری کی ایلورہ گائیڈ اور خلیق نظامی کی "تاریخ مشائخ چشت" وغیرہ------ یہ کتابیں 'اجنتا' ایلورہ اور خلد آباد کے بارے میں کچھ حکایات تو ضرور فراہم کردیتی ہیں مگر وہ پس منظر روشن نہیں کرتیں جو پیش منظر کو بامعنی بنا سکے۔ پھر بھی ان کتابوں سے ہم اپنی خوش عقیدگی کو تسکین دے سکتے ہیں۔

اورنگ آباد کی تاریخ کے سلسلے میں زیادہ رہنمائی پروفیسر رمضان کے مقالے سے ہی حاصل ہوئی ہے اور محترمہ وحیدہ نسیم نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ اپنی دھرتی کے بارے میں وحیدہ نسیم کے وہی جذبات ہیں جو ایک بچھڑی ہوئی بیٹی کے، اپنی ماں کے بارے میں ہوتے ہیں۔ جن حضرات نے وحیدہ نسیم کی نظمیں پڑھی ہیں وہ اس کرب کا اندازہ کرسکتے ہیں جو آج تک ان کے دل میں ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تاریخی نظم "اورنگ آباد" بھی اس شہر کی عظمت کی آئینہ دار ہے۔ وہ بڑے فخر سے اپنی وابستگی کا اظہار کرتی ہیں۔

یہی ہے ابتدا میری کتاب زندگانی کی
یہی ہے انتہا میرے قلم کی کامرانی کی

نسیم اس سرزمین نے زلف ہستی کو سنوارا ہے
مجھے بھی ناز ہے میں نے یہاں بچپن گزارا ہے

وحیدہ نسیم کے دل میں اورنگ آباد کی محبت' اپنے خون کی طرح آباد ہے۔ انہوں نے ۵۲ء میں اس شہر کو چھوڑا تھا۔۔۔۔ اور جب تیس بتیس سال بعد وہاں پہنچی تو ان کی کیفیت ان اشعار سے محسوس کی جاسکتی ہے۔

ختن کو ڈھونڈھتی پھرتی ہے وحشت آہو
کہ جیسے اپنے ہی گل کی تلاش میں خوشبو
کہاں پہ دیکھئے لے جائے' بے خود اپنی
چراغ ڈھونڈھنے نکلا ہے' روشنی اپنی
جواب دے مرے بچپن' تجھے کہاں ڈھونڈوں
سہیلیوں کے پتے میں کہاں کہاں' پوچھوں

یہ عالم ہر اس شخص کا ہوگا جس کے دل میں اپنی مٹی دھڑک رہی ہو' اپنی مٹی کی خوشبو مہک رہی ہو۔

وحیدہ نسیم نے اورنگ آباد کی تاریخ اگرچہ ادھوری لکھی ہے۔ یعنی ملک عنبر سے اورنگ زیب تک۔۔۔۔ ریاست حیدر آباد کی دو سو سالہ تاریخ میں' اس شہر پر کیا گزری۔۔۔۔ ابھی تجزیہ طلب ہے لیکن وہ دن جب اس کا نام کھڑکی سے فتح نگر ہوا۔۔۔۔ اور پھر اورنگ آباد رکھ دیا گیا۔ بہت سی خوش گمانیوں کو دور بھی کردیتا ہے۔

پروفیسر شیخ رمضان اردو اور انگریزی کے علاوہ چونکہ مرہٹی اور ہندی زبانوں پر بھی عبور رکھتے ہیں۔ اس لئے یقیناً انہوں نے تاریخ کے ان گوشوں کا مطالعہ بھی کیا ہوگا' جو دوسری زبانوں' بالخصوص مرہٹی میں محفوظ ہوگا۔ اگر پروفیسر موصوف کی آنکھیں راستے کی گرد سے پاک ہوں تو یقین ہے کہ انہوں نے بلا تخصیص مذہب و عقیدہ' حقیقت پس پردہ کا بھی نظارہ کیا ہوگا۔

وحیدہ نسیم نے اپنی کتاب میں کچھ انکشافات بھی کئے ہیں صفحہ نمبر ۵۸ پر لکھتی ہیں۔

"تغلق کی دکن سے واپسی کے بعد دولت آباد کی رعایا کو خیال آیا کہ جس قدر جلد ممکن ہو شمالی ہند کی غلامی سے آزادی حاصل کرنا چاہئے۔"

حسن گنگو کی تاج پوشی اور پھر ڈیڑھ سو سال تک بہمنی سلطنت کی حکمرانی دکن کے مزاج کا سراغ دیتی ہے۔ صفحہ ۹۴ء پر ملک عنبر کے بارے میں لکھتی ہیں۔

"چاند بی بی کی موت کے بعد نظام شاہی حکومت کی باگ ڈور عملی طور پر ملک عنبر کے ہاتھ میں رہی۔ مرہٹوں کو چھاپہ مار جنگ اسی نے سکھائی اور وہ آخر وقت تک مغلوں کے خلاف صف آرا رہا۔"

جو حضرات مرہٹوں کی بغاوت کو مذہبی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ انہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ شیواجی کی فوج میں مسلمان بھی کافی تعداد میں تھے۔ سرحدی علاقوں میں خوشحال خان خٹک کی بغاوت' خود اس کا ثبوت ہے کہ "یہ علاقائی تشخص کی حفاظت کا مسئلہ تھا۔

اورنگ زیب کی "تمام نیکیوں" کے باوجود یہ نکتہ اپنی جگہ ہے کہ۔

رموز مملکت خویش خسرواں دانند

تاریخ سچائی کی جستجو کا نام ہے اور سچائی' بادشاہوں کی گواہی سے مرتب نہیں ہوتی۔ ہماری تاریخیں' بدنصیبی سے ایسی ہی شہادتوں سے معتبر بنائی گئی ہیں۔ پروفیسر وحیدہ نسیم نے اورنگ آباد کو وقت اور ماحول کے آئینے میں دیکھنے کی بجائے بادشاہوں کے سائے میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا وہ "فاتح وقت" کی قصیدہ خواں ہو کر رہ گئیں۔ وہ حسن گنگو بہمنی کی بھی تعریف کرتی ہیں اور ملک عنبر کی بھی۔۔۔۔ اور مغلوں کے ہاتھوں اورنگ آباد کی بار بار تاراجی اور بربادی پر خون کے آنسو رونے کے بعد اورنگ زیب کی وکالت بھی کرنے لگتی ہے۔۔۔۔ تاریخ نویسی کا یہ انداز بادشاہوں کی عاقبت تو سنوار سکتا ہے' ان شہروں کا مقدر نہیں بدل سکتا جو ان حکمرانوں کی ہوس ملک گیری میں تباہ ہوتے رہے۔ ان عوام کی زندگی کی ترجمانی نہیں کرتا جو ہر دور میں بلاوجہ مرتے رہے اور ہر فاتح کی راہ میں آنکھیں بچھاتے رہے۔

تاریخ ان فصیلوں' قلعوں اور دروازوں یا ان محلات کی تصویر کشی اور ثنا خوانی کا نام نہیں جو ان حکمرانوں نے اپنے تحفظ کے لئے تعمیر کئے تھے۔۔۔۔ اورنگ آباد کی تمام تاریخی عمارتیں' زبان حال سے یہ بھی گواہی دے رہی ہیں کہ وقت کے تیور کیا تھے' بغاوتیں کیا روپ دھار رہی تھیں شاہی خاندانوں میں اقتدار کی جنگ کس منزل تک پہنچ چکی تھی اور علاقائی اور تہذیبی تشخص کا شعور کس حد تک بیدار ہو چکا تھا اور بادشاہ

اپنے حصاروں میں آپ محصور ہوتے جارہے تھے۔

مسلمان بادشاہوں کی دین داری کے افسانے پڑھتے ہوئے کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ گوتم بدھ نے تو اپنے عقاید و نظریات کی خاطر راج پاٹ چھوڑ دیا تھا اور ایڈورڈ ہشتم نے اپنی محبت کے لئے تخت و تاج کو ٹھوکر ماردی۔۔۔۔ مگر آج تک کسی مسلمان بادشاہ کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ اسلام کی خاطر اپنی بادشاہت سے دست بردار ہوجاتے اور ایک مجلس شوریٰ قائم کرکے خلافت کے لئے راستہ ہموار کردیتے۔ اس کے برعکس ایسی مثالیں بے شمار ملتی ہیں کہ۔۔۔۔ وہی ذبح بھی کرے ہے' وہی لے ثواب الٹا۔

لیکن۔۔۔۔ کہا جاتا ہے کہ تاریخ کے فیصلے بین السطور میں ہوتے ہیں۔ قاضی وقت کفر کا فتویٰ دے کر جسے قتل کروا دیتا ہے۔ تاریخ اسی کو "شہید" کا اعزاز عطا کردیتی ہے۔ منصور سے لے کر سرمد تک ایسی مثالیں موجود ہیں۔

علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

بدقسمتی سے ہماری تاریخ اور ہماری تہذیب' اسی چنگیزی کے زیر اثر پرورش پاتی رہی۔ اہل سیاست اسے "غلاف کعبہ" چڑھاتے رہے اور اہل شریعت بادشاہ وقت کو "ظل اللہ" کہتے رہے۔ اور ہم قصیدہ گویان ادب۔۔۔۔ خیر' ہماری بات چھوڑیئے۔

اورنگ آباد کی تاریخ لکھتے ہوئے' خوش عقیدگی میں' محترمہ وحیدہ نسیم سے بھی یہی فروگزاشتیں ہوئی ہیں۔ وہ اورنگ آباد کی تاریخ لکھتے لکھتے اورنگ زیب کی تاریخ بیان کرنے لگیں۔ اور جوش عقیدت میں اس پر عائد الزامات کے جوابات بھی دینے لگیں۔

حکمران آتے جاتے رہتے ہیں۔ وقت سب کے فیصلے کردیتا ہے۔ اورنگ آباد کل بھی تھا۔ آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ ممکن ہے کل اس کا یہ نام بھی بدل جائے اور کوئی ایسی "کھڑکی" کھل جائے جہاں سے تاریخ کوئی اور ہی منظر دکھانے لگے۔ جہاں تک اورنگ آباد کے شہریوں کے رسم و رواج' رہن سہن کے انداز' مختلف مذاہب اور فرقوں کی تہذیبی ہم آہنگی' فنون لطیفہ کی معرفت ان کا احساس جمال' شعر و ادب کے حوالے سے خیالات و جذبات کی تصویر کشی کا تعلق ہے' وحیدہ نسیم نے نہایت حسین پیرائے میں' تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ اورنگ آباد کے محلے' بازار' مساجد' مندر اور

دوسری عبادت گاہیں' مختلف ادوار کے نظام حکومت کی ترجمانی کرتی ہیں۔ صدیوں کی وہ تہذیب' جسے مقامی اور بیرونی لوگوں نے مل جل کر نہایت ہی پیار سے' اپنے سینے سے لگا کر پالا اور اپنے خون سے نکھارا۔۔۔۔ اپنے آثار میں آج بھی زندہ ہے وحیدہ نسیم نے اپنی یادداشتوں اور بزرگوں سے سنی ہوئی بعض کہانیوں کی روشنی میں' ماضی کی اقدار کو حسین الفاظ میں محفوظ کردیا ہے۔ اس کتاب میں کئی باب ایسے ہیں جو شیخ رمضان کے مقالے سے تعلق نہیں رکھتے۔ وہ جیتے جاگتے انسانوں کے دلوں میں دھڑکتے ہوئے جذبات کے آئینہ دار ہیں۔ اجنتا اور ایلورہ کے پس منظر میں 'مذہبی اساطیر' ان اعلیٰ افکار کا تشکیلی اظہار ہے جو صدیوں انسانوں کی رہنمائی کرتے رہے۔ دولت آباد کا قلعہ ہو کہ نہر عنبری' مقبرہ رابعہ دورانی ہو کہ پن چکی۔۔۔۔ فصیلیں ہوں کہ دروازے۔۔۔۔ سب انسانی محنت کے خوبصورت نقوش ہیں۔ وحیدہ نسیم نے ان سب کا سائنسی آگہی کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کتاب جو ملک عنبر سے اورنگ زیب تک سفر کرتی ہے۔۔۔۔ بڑی عرق ریزی سے مرتب کی گئی ہے۔ بعض تاریخی اور ادبی حوالوں سے قطع نظر۔۔۔۔ جن میں کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں' پوری کتاب اورنگ آباد سے محبت کا ایک دستاویزی ثبوت ہے۔ یقیناً یہ کتاب آئندہ لکھنے والوں کے لئے رہنما ثابت ہوگی۔

مطبوعہ "مجلہ عثمانیہ" کراچی
مورخہ جولائی تا ستمبر ۱۹۹۵ء

وحیدہ نسیم، پروفیسر



ان کا خاندانی نام وحیدہ نسیم ہے اور اسی نام سے وہ ادبی دنیا میں روشناس ہوئیں- وحیدہ صاحبہ ۹ رستمبر سنہ ۱۹۲۷ء کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئیں- ان کے والد فصیح الدین نیک خصلت، شریف الطبع شخص تھے اور والدہ ماجدہ عزیز النسا بیگم اعلیٰ علمی وادبی ذوق رکھتی تھیں- وحیدہ نسیم کی چھوٹی بہن شمیم اعجاز ریڈیو پاکستان سے مدتوں خبریں پڑھتی رہی ہیں- وحیدہ نسیم نے ابتدائی تعلیم مدرسہ تحتانیہ اورنگ آباد میں حاصل کی- سنہ ۱۹۴۳ء میں اورنگ آباد ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا اور سنہ ۱۹۴۷ء میں خواتین کالج عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن سے بی ایس سی کی ڈگری حاصل کی- اس کے بعد انہوں نے ایم ایس سی کے لیے نباتیات کے مضمون کا انتخاب کیا- سقوط حیدر آباد دکن کے بعد اگست سنہ ۱۹۵۲ء کو وہ پاکستان آ گئیں اور کراچی میں مقیم ہوئیں- یہاں انہوں نے درس وتدریس کا پیشہ اختیار کیا- وہ سنہ ۱۹۵۳ء میں گورنمنٹ ومن کالج فریئر روڈ میں لکچرار کی حیثیت سے مقرر ہوئیں- ۱۹۷۰ء میں ان کا تبادلہ گورنمنٹ کالج ناظم آباد میں ہوگیا- سنہ ۱۹۷۰ء سے سنہ ۱۹۸۷ء تک گورنمنٹ کالج ناظم آباد کراچی میں بطور پروفیسر اور پھر پرنسپل ہوئیں اور یہیں سے مدتِ ملازمت ختم ہونے کے بعد ریٹائر ہوگئیں-

وحیدہ صاحبہ کے ادبی ذوق کا آغاز اُس وقت ہوا جب وہ نویں دسویں کلاس میں پڑھ رہی تھیں- ان کی پہلی نظم ''نغمۂ اسکول'' اور پہلا افسانہ ''اسٹیشن ماسٹر کی بیوی'' کے عنوان سے سنہ ۱۹۳۹ء میں خواتین کے رسالے ''شباب'' میں شائع ہوا تھا- اس سلسلے میں ان کی استانیوں اور والدہ نے بھی رہنمائی فرمائی- پروفیسر وحیدہ نسیم کا اپنا قول ہے کہ شعر وسخن میں انہوں نے کسی سے اصلاح نہیں لی- پاکستان آنے کے بعد بھی ان کا علمی وادبی ذوق برقرار رہا- ان کی نثری وشعری نگارشات مختلف رسائل میں شائع ہوتی رہیں- سنہ ۱۹۷۳ء میں ان کا شعری مجموعہ ''موجِ نسیم'' کے عنوان سے شائع ہوا تو ادبی جرائد میں شاندار

تبصرے شائع ہوئے۔ وحیدہ نسیم کی متعدد تصانیف ہیں جن میں ایک کتاب ''عورت اور اردو زبان'' ہے اس کتاب پر لاجواب تبصرہ کرتے ہوئے جناب جوشؔ ملیح آبادی لکھتے ہیں:

''انسانی تاریخ شاہد ہے کہ جو نامراد قومیں اپنی مادری زبان کو پس پشت ڈال کر پدری زبان کے اختیار کرنے کا ارتکاب کرتی ہیں، وہ اپنی ماؤں کی توہین کرنے کے جرم میں مادّی و ذہنی دونوں حیثیتوں سے، کھکھ ہو کر رہ جاتی ہیں۔

آپ سمجھے میں 'پدری زبان' کس کو کہتا ہوں؟...... پدری زبان، وہ، کبھی نہ آ سکنے والی، زبان ہوتی ہے، جو معاشی دوڑ دھوپ، دیگر اقوام کے میل جول، تجارتی لین دین، اور سب سے زیادہ اغیار کی غلامی کے ناجائز دباؤ کے سائے میں ایک زہریلی بیل کی طرح پروان چڑھتی ہے اور اپنی لپیٹ میں قوموں کو، انکی مادری زبان، اور مادری زبان کے تمام عطا کردہ خزانوں سے محروم کر کے رکھ دیتی ہے۔

دور کیوں جایئے، نامِ خدا، خود اپنے ہی پر نگاہ ڈال کر دیکھ لیجئے۔

آپ نے اپنی مادری زبان اردو کو ترک فرما کر اور حقیر سمجھ کر، پدری زبان یعنی انگ ریزی کو اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے، اور اس کا نتیجہ، خیر سے، یہ برآمد ہوا ہے کہ تہذیب و ثقافت کے لحاظ سے آپ نقال اور نُطق کے اعتبار سے، آپ گونگے ہو کر رہ گئے ہیں۔

آج ہم عبرت کا مرقع ہیں، نہ انگریز ہیں نہ پاکستانی، آدھے تیتر ہیں آدھے بٹیر۔ ہم پر یہ مثل صادق آتی ہے کہ کوا ہنس کی چال چلا، اپنی چال بھول گیا۔ جو بھی ہم کو دیکھتا ہے پوچھتا ہے نہ ادھر کی، نہ اُدھر کی، یہ بلا کدھر کی۔

وحیدہ نسیم نے اس کتاب کو بڑی عرق ریزی، اور نہایت دیدہ وری کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب اربابِ اُردو پر احسان ہے۔ ایسا احسان، جس کی قدر و منزلت، ماہ و سال کی گردش کے ساتھ ساتھ، روز بروز بڑھتی چلی جائے گی۔

نسیم کو میں صرف ایک خوش گو شاعرہ سمجھتا تھا، اب معلوم ہوا کہ وہ ماشاءاللہ لسانیات پر بھی عبور رکھتی ہیں۔''

وحیدہ نسیم صاحبہ کی تصانیف یہ ہیں: سفرنامے: (۱) حدیثِ دل (۲) شاہانِ تاج (۳) اورنگ آباد۔

ناول:(۱)ایک لڑکی (۲) لال باغ (۳)زخم حیات (۴)ساحل کی تمنا(۵)غم دل کہانہ جائے (۶)دردنہ جانے کوئی (۷) کفارہ-افسانے:(۱)دیپک محل (۲) گگن محل(۳) بیلے کی کہانیاں-عورت اوراردوزبان (تحقیق)اوردوشعری مجموعے'موج نسیم'،'نعت رسول شامل ہیں-

۲۸/اکتوبر۱۹۹۶ءکوعلم وادب کی خاتون پروفیسروحیدہ نسیم دارفانی سے رخصت ہوگئیں-وہ ایک بااصول ماہرِتعلیم،شفیق استاداورخوش نواشاعرہ تھیں-ان کی اعلیٰ علمی وادبی خدمات ہمیشہ ان کی یاددلاتی رہیں گی-وحیدہ نسیم کی ایک غزل ملاحظہ کیجیے ؎

بساطِ محفلِ شب اِس طرح لُٹا کے چلے — فریبِ صبح میں گھر کے دیئے بجھا کے چلے
نہ پوچھ بزم میں ان کے دلوں پہ کیا گذری — حقیقتوں کو فسانوں میں جو چھپا کے چلے
ہم اہلِ درد کے رُخ کی شگفتگی پہ نہ جا — کچھ ہوں گے آنکھ میں آنسو جو مُسکرا کے چلے
یہ اور بات کہ ہم خود ہی رہ گئے بُجھ کے — چراغ ورنہ سرِ انجمن جلا کے چلے
پڑے تھے پاؤں میں چھالے ہزار ہا لیکن — تمہاری راہ میں آنکھیں بچھا بچھا کے چلے
کسے دکھائیں کہ داغِ جگر بہاروں میں — چمن سے اہلِ نظر جب نظر بچا کے چلے
نسیم قافلے والوں سے کوئی یہ پوچھے — یہ کیا ہوا سرِ منزل جو سَر جھکا کے چلے

---••☆••---